188398

سلسلۂ انجمن ترقی اردو

نمبر ۲۳

تاریخِ یونانِ قدیم

مؤلفہ

سیّد ہاشمی فرید آبادی

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج میں طبع ہوئی

یونانِ قدیم

فہرستِ مضامین

باب	مضمون	صفحہ
	دیباچہ مؤلف	۲
اوّل	جغرافیہ	۱
دوم	زمانہ ماقبل تاریخ (۱) پرسیس (۲) ہرقلیس (۳) تھی سیس (۴) جنگ ٹروئے	۱۱
سوم	(۱) ڈورین قوم کی ہجرت اور تسلط پیلوپنی سس میں (۵۰۰ ق.م تک) (۲) اسپارٹہ (۳) دوسری ڈورین ریاستیں	۳۰
چہارم	(۱) قوم آئی اونین اور اٹی کا (۵۰۰ ق.م تک) (۲) زمانہ تاریخی (۳) حکومت جابریہ (۴) جمہوریت	۶۷
پنجم	(۱) یونان کی جدوجہد ایران سے (۲) آئی اونی بغاوت (۳) ایرانیوں کی فوج کشی یونان پر (۴) ایران کی تیسری یورش	۱۰۱

صفحہ	مضمون	باب
۱۳۰	(۱) ایتھنز کا عروج (۲) فارقلیس (۳) عہد فارقلیس	ششم
۱۵۲	جنگ پیلوپنی سس اور سلطنت ایتھنز کا زوال اور اسپارٹہ کا غلبہ	ہفتم
۱۷۸	نسل یونان کا تنزل	ہشتم
۱۹۹	یونان کی آزادی کا خاتمہ	نہم
۲۴۷	شاہانِ ایران کے ناموں کے فارسی و یونانی تلفظ کا تطابق	ضمیمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچۂ مؤلّف

انجمنِ ترقی اُردو نے یہ کتاب طلباء مدارس کے واسطے لکھوائی ہے مگر اسی... کے ساتھ یہ پہلو مدِّنظر رکھا گیا ہے کہ عام شائقین بھی اُسے مطالعہ کرسکیں اور زبانِ اُردو میں قدیم یونان کی ایک مختصر اور مُعتبر، جدید طرز کی تاریخ تیار ہو جائے۔ کتاب میں بڑے بڑے تاریخی واقعات سب وہی ہیں جو انگریزی کی ہر تاریخِ یونان میں ملتے ہیں لیکن اُسلوب و ترتیب کے علاوہ بعض تفصیلات اور گہرے اسباب و عواقب کی جمع کرنے میں متعدد مورخین کی آرا پر غور و تفحّص کرنا پڑا جن میں گروٹ، بیوری اور مہافی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ متفرق امور کی تحقیق و تصریح کے لیے انسائکلوپیڈیا (طبع نہم)، اور تاریخ المورخینِ عالم سے جا بجا مدد لی گئی ہے اور بعض ابواب کی تیاری میں قدیم یونانی مُصنّفین کے بھی جسقدر انگریزی ترجمے میسّر آئے اُنھیں باستیعاب

مطالعہ کیا گیا ہی۔ اور گو کتاب میں مؤلف کی ذاتی آرا و خیالات کو بہت کم دخل ہی
اور اس نے صرف مختلف کیاریوں کے پھول چُنکر ایک جگہ آراستہ کر دیئے ہیں تاہم
جو کچھ لیا ہی اُس کو پہلے خوب پرکھ لیا ہی اور کوشش کی ہی کہ جو کچھ لکھا جائے اس کا ماخذ
مُسلّم و مُستند ہو۔

ضمیموں کی تیاری میں نسبتاً اصل کتاب سے بھی زیادہ محنت و دقّت اُٹھانی پڑی
اور افسوس ہی کہ دوسرا ضمیمہ اب بھی مکمّل اور کتاب کے ساتھ شامل نہیں ہو سکا۔ کتاب
کی اشاعت میں بہت تاخیر ہوئی جاتی ہی۔ اپنی علالت اور کم فرصتی کی وجہ سے میں اُسے
کچھ عرصہ تک پورا نہیں کر سکتا۔ طلباء کے واسطے وہ چنداں ضروری بھی نہیں ہی۔
لہذا مجبوراً اس مرتبہ وہ کتاب کے ساتھ طبع نہ ہو سکیگا۔ اگر خدا نے چاہا اور طبع ثانی
کی نوبت آئی تو اُس وقت یہ کمی پوری کر دی جائیگی۔ فقط

سیّد ہاشمی فریدآبادی

حیدرآباد دکن،
۲۱ر جنوری ۱۹۱۸ء

بابِ اوّل

جغرافیہ

ہر قوم کی معاشرت اور عادات و خیالات پر اُس کے وطن کی آب و ہوا اور اسبابِ طبعی کا اثر ہوتا ہے اور جدید تحقیقات نے طے کر دیا ہے کہ ہیلاس یعنی قدیم یونان کی تاریخ، خصوصیت کے ساتھ، اس ملک کے جغرافیائی حالات سے وابستہ تھی۔ مثلاً، اگر ہم یونان کے ساحل و کوہستان سے واقف نہیں تو اُس کے باشندوں کی بحری اولوالعزمی یا بیرونی حملوں سے مدافعت کی وجہ بھی آسانی سے نہ سمجھ سکیں گے۔ خاصکر ہمیں اُس شہری حکومت و تمدّن کے آغاز اور اسبابِ نشو و نما ڈھونڈنے میں دقت پیش آئیگی جو یورپ کی جدید تہذیب کا سنگِ بُنیاد ہیں اور ہزار نقصوں کے باوجود، قدیم یونانیوں کا سرمایۂ افتخار۔

لیکن جغرافیہ لکھنے میں پہلی "دفعہ" ملکی حدود کا معیّن کرنا ہے اور زمانہ سلف میں اگر اس کی کوشش بھی کی گئی ہو تو وہ معیارِ جدید پر بہت کم ٹھیک اُترتی ہے۔ دوسرے یونانِ قدیم (یا ہیلاس) کے معاملے میں ایک بڑی مشکل یہ پیدا ہوگئی ہے کہ وہ بذاتِ خود کسی معیّن علاقے کا نام نہ تھا بلکہ ہر سرزمین کو جہاں یونانی نسل کے لوگ آباد ہوں ہیلاس کہنے لگتے تھے۔ اور یہ تعریف اتنی کشادہ دامن ہے کہ اس میں ایشیائے کوچک، اطالیہ، صقلیہ

بلکہ ہسپانیہ تک کے بعض علاقے داخل ہوجائیں گے کہ وہاں بھی یونانی لوگ بعد میں جا بسے تھے؛ اس کے علاوہ یونان خاص کچھ قومِ یونانی کا اصلی وطن نہ تھا۔ وہ اس ملک میں باہر سے آکے بسی تھی اور اخیر تک خود ہیلاس میں ایسے حصّے موجود تھے جہاں نسل وقومیت کے اعتبار سے 'غیر یونانی' یا قدیم آبادی موجود تھی اور اس لئے اہل اطالیہ کو اُس طعن آمیز سوال کا کچھ جواب نہ بن پڑا تھا جو شاہِ مقدونیہ نے اُن سے پوچھا تھا کہ یونان کی حدیں کہاں ہیں[1] ؟

بہرحال، اگر ہم نہ تو لااُبالی اِس ٹرےبو[2] کی پیروی کریں جس نے مقدونیہ تک یونان میں داخل کر لی تھی اور نہ اُن وہمی مؤرخوں کی، جو تھسلی کو بھی یونان سے خارج سمجھتے رہے، تو اس ملک کی جغرافیائی حدود تقریباً وہی ہونگی جو موجودہ دولتِ یونان کی ہیں اور رقبہ بھی اس کے قریب، تیس ہزار مربع میل سے کچھ اوپر نکلے گا۔

موقع کے لحاظ سے یہ ملک یورپ کے جنوب مشرق میں بصورت جزیرہ نما، دستِ سوال، کی طرح بحرِ روم میں پھیلا ہوا ہے۔ سمندر کے پار مغرب میں اطالیہ اور برِّ اعظم افریقہ کا سب سے شاداب خطہ اُس کے جنوب میں ہے اور ایشیائے کوچک مشرق میں، اس قدر قریب کہ اُن جزیروں کی بدولت جو بحرِ ایجین میں ایشیا تک بکھرے پڑے ہیں، یورپ کا یہ گوشہ ایشیا کا ایک دُور دست علاقہ معلوم ہوتا ہے، خصوصاً اس لئے کہ جس زمانہ کا حال ہم لکھنے بیٹھے ہیں اُس وقت ہیلاس کے تعلقات بھی یورپ کی نسبت ایشیا کے ساتھ زیادہ تھے۔

---

[1] یونانی آزادی کے آخری ایّام میں جب کہ مقدونیہ کا قدیم یونان پر غلبہ ہو گیا تھا وہاں اطالیہ اور اکائیہ میں دو سیاسی انجمنیں قایم ہوئی تھیں جن کا منشا یونان کو حتی الامکان غیروں کے اثر و حکومت سے نجات دلانا تھا۔ انھی کوششوں کے ضمن میں اہلِ اطولیہ نے آخری فیلقوس (فلپ ثالث)، شاہ مقدونیہ سے متحمل نہ کہلا بھیجا تھا کہ وہ یونان سے دست بردار ہو جائے اور جواب میں اُس نے دریافت کیا تھا کہ یونان کی حدیں کہاں ہیں؟

[2] اس ٹرےبو پہلی اور دوسری صدی قبل مسیح کا مشہور اطالوی جغرافیہ نویس ۱۲

اس جگہ ایک دلچسپ بحث اس ملک کے نام کی پیش آتی ہے۔ یورپ میں اُسے عام طور پر "گریس" اور اس کے باشندوں کو "گریک" کہتے ہیں۔ ابتدا اس نام کی یوں ہوئی کہ اہلِ روما کو سب سے پہلے یونان کی جس آبادی یا قبیلے سے سابقہ پڑا وہ گرائیہ کے تھے۔ رومیوں نے انھیں اور پھر یہاں کے تمام باشندوں کو "گریکوی" کہنا شروع کیا اور آخیر تک اسی لفظ پر قایم رہے حالانکہ یونانی اُس وقت بھی اپنے تئیں ہیل لینیز اور اپنے ملک کو ہیلاس کہتے تھے اور رومیوں کو یقیناً بہت جلد اپنی غلطی معلوم ہوگئی ہوگی۔ لیکن نہ معلوم کس تساہل نے انھیں اس کی اصلاح سے باز رکھا یہاں تک کہ ان کی وجہ سے یہی نام سارے یورپ میں پھیل گیا اور اب بعض علما کی کوشش کے باوجود زبانوں سے نہیں اُترتا۔

لیکن قرونِ وسطیٰ کے عرب جو یورپ کی طرح رومی تمدن سے مغلوب و متاثر نہ ہوئے تھے اس غلطی میں نہیں پڑے اور اہلِ مصر و شام کی تقلید میں اس ملک کو یونان ہی کہتے رہے جسے غالباً سب سے پہلے کنعانیوں[۱] نے رواج دیا تھا۔ اور یہ اس لفظ کی بہ اضافۂ نون دوسری صورت ہے جو یورپ میں آئی اونین یا یونائین، موسوم ہے۔ ہم آگے پڑھیں گے کہ قوم ہیل لینیز دو بڑے گروہوں سے مرکب تھی اور اُن میں سے ایک یہی آئی اونین لوگ تھے جو اپنی تہذیب و ترقی کے اعتبار سے کم از کم پانچویں صدی قبل مسیح تک ایک ممتاز اور جداگانہ قوم سمجھے جاتے رہے۔ انھی کو اہلِ مشرق نے یونانی اور اُن کے وطن کو یونان کا نام دیا تھا اور بے شبہ یہ لفظ (اگرچہ اتنی جامعیت نہیں رکھتا جو ہیلاس و ہیلینیز میں ہے) "گریک" سے نسبتاً زیادہ صحیح ہے اور ہمیں اُس کے استعمال میں کچھ قباحت نہیں نظر آتی۔ البتہ گمان غالب ہے کہ کچھ عرصے بعد جس غلطی کا احساس یورپ سے "گریس" کہنا ترک کرائے گا وہی آگے

---

[۱] کنعان یا فنیقیہ، ارض شام کا وہ ساحلی علاقہ جسے اب فلسطین کہتے ہیں۔ دَورِ قدیم میں اپنے تمدن و شائستگی کی بدولت اسی قدر مشہور تھا جتنے مصر یا بابل۔ اگرچہ اس کی تاریخ ان دونوں سے بھی زیادہ تاریکی میں ہے ۱۲

چل کر ہمیں بھی ہیلاس کو "یونان" بولنے سے باز رکھے گا۔

مگر اس بحث کو تہ کرکے ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں کہ قدرتی طور پر خلیج کورنتھ کے بیچ میں گھس آنے سے، یونان کے دو حصے ہو گئے ہیں، یہ خلیج اس قدر دور تک بڑھ آئی ہے کہ ان دونوں حصوں کو صرف ایک تنگ خاکنائے نے ملایا ہی جس کے بغیر نیچے کا حصہ جزیرہ رہجاتا کیونکہ باقی اُس کے ہر طرف پانی ہی، سمندر کا اس طرح جابجا خشکی میں گھس آنا اور بے شمار کھاڑیاں اور کٹاؤ خود برّ اعظم یورپ کی جغرافیائی خصوصیت ہے مگر یونان اس کے بھی تمام ملکوں پر فوق رکھتا ہے اور یونانی ساحل شاید دُنیا بھر میں سب سے بے قاعدہ اور دندانہ دار ساحل ہی۔

پھر شمالی حصہ میں کوہِ پنڈس کا سلسلہ کنگھے کی طرح پھیلا ہوا ہے جس نے وسط میں تھسلی اور اپیرس کے درمیان ایک قدرتی دیوار بنا دی ہے اور آگے بڑھ کے مقدونیہ اور الیریہ کو اپی رس سے جُدا کیا ہی۔ اسی پہاڑ کی ایک مشرقی شاخ تھسلی اور مقدونیہ کی حدِ فاصل اور ساحل سمندر تک اتنی مسلسل ہے کہ درۂ ٹیمپی کے سوائے مقدونیہ اور تھسلی میں آمد رفت کا کوئی راستہ نہیں چھٹا۔ اور یہ درہ بھی پی نیئس ندی کی وجہ سے جو اسی مقام پر سمندر میں گرتی ہے، نہایت دشوار گزار ہو گیا ہے حتیٰ کہ قدما کے نزدیک "صرف دس آدمی اس جگہ پورے لشکر کا راستہ روک سکتے ہیں!" پنڈس کی اس شاخ کے علاوہ جسے یونانی اپنے وطن کی مقدس فصیل سمجھتے تھے، تھسلی کے جنوب میں بھی پہاڑیوں کے کئی سلسلے ہیں۔ مگر اُن کی بے لطف تفصیل کو چھوڑ کر اب ہم یونان کی ملکی تقسیم اور مختلف علاقوں کا حال لکھیں گے :۔

(۱) حصہ شمالی، یونان کے دونوں بڑے بڑے صوبے یعنی تھسلی اور اپی رس اسی حصے میں ہیں، اگرچہ مؤخر الذکر کو اکثر یونانی غیر علاقہ سمجھتے اور بہ نظرِ حقارت یونان میں شامل نہ کرتے تھے۔ اس تعصب کا باعث یہ تھا کہ ملک زیادہ تر ویران اور بنجر تھا اور

اُس کے باشندے جاہل اور بدتمیز تھے۔

(۲) حصّہ وسطیٰ: اس میں نو ملک یا علاقے تھے۔ یعنی مگارِس، اَیٹ ٹکہ (یا ایٹی کا) بیوشیہ، فوکیس، مشرقی اور مغربی لوک رس، ڈورِس، اطولیہ اور اکرنانیہ۔

مگارِس۔ اِس کو کبھی کبھی جنوبی یونان یا جزیرہ نمائے پیلوپنی سس میں شامل کر لیتے تھے۔ وہ خلیج کورنتھ کا شمالی ٹکڑا اور یونان کے سب سے چھوٹے علاقے کا نام تھا۔

بھلی لکٹر یا اَیٹ ٹکہ، جس کے تین طرف پانی اور ایک طرف پہاڑ ہیں، نقشے میں بُوٹ کی شکل نظر آتا ہے اور زیادہ تر پہاڑی ملک ہے۔ قدیم یونان کا سب سے متمدّن اور ترقی یافتہ علاقہ اسی کو سمجھنا چاہیئے کہ دورِ ماضی کی ملکۂ علم و حکمت کا محل یہیں تھا یعنی مدینۃ الحکما اَیتھنز (یا ایثنی)، اسی حصّہ ملک کے مرکزِ حکومت کا نام تھا۔

بھلی لکٹر اَیٹ ٹکہ کے شمال میں ایک سرد و شاداب خطّہ ہے۔ اس کی سطح بلند اور دونو طرف پانی ہے۔ یہاں کہر بہت پڑتی ہے اور اسی لئے، یونانی کہتے تھے کہ بیوشیہ کے باشندے سُست اور غبی ہوتے ہیں۔

فوکِیس۔ بیوشیہ کے شمال میں چھوٹا سا علاقہ ہے اور جنوب میں خلیج کورنتھ تک پھیلا ہوا ہے۔ شہر ڈیلفی جہاں اپالو دیوتا کی مشہور "درگاہ" تھی اسی علاقہ میں واقع تھا۔

مشرقی لوک رِس۔ یہ علاقہ بیوشیہ اور فوکیس کے اوپر سمندر سے ملا ملا تھسلی تک گیا ہے اور کوہِ اوسے ٹا کی وجہ سے بہت مشہور تھا کہ اسی پہاڑ کا درہ تھرمو پلی کہلاتا ہے جس کے سوا جنوبی یونان کا کوئی بّری راستہ نہیں اور جسے یونانی اپنے وطن کا سب سے مضبوط مورچہ سمجھتے تھے۔ بلکہ بعض کے نزدیک ہیلاس خاص کا اصلی دروازہ یہی تھا اور تھسلی محض ایک بیرونی حصار۔

مغربی لوک رِس خلیج کورنتھ کے شمال میں واقع تھا۔ کوہِ پنڈس کی جنوبی کڑیاں جو یہاں پرناسس کہلاتی ہیں اسے ڈورس اور اپنے مشرقی ہمنام سے جدا کرتی ہیں اور

مغرب میں اس کی سرحد اطوآلیہ سے آملتی ہے۔

ڈورس بہت چھوٹا اور پہاڑی ٹکڑا تھا مگر اسی کے قبیلوں نے پھیل کر بعد میں بہت سی آزاد اور قوی ریاستوں کی بنیاد ڈالی۔

اطولیہ۔ ابتدا میں یونانی تمدن وشائستگی سے بہت کم متاثر ہوا تھا لیکن اپنے باشندوں کی جنگ جوئی کے باعث آخری زمانے میں ناموری پائی۔

اکرنانیہ۔ تعلیم وتہذیب کے اعتبار سے وسطی یونان میں سب سے بدتر خطّہ تھا۔ اس میں بہت گھنے جنگل تھے اور شاید اسی وجہ سے وہاں کے باشندے عرصہ دراز تک بدویانہ زندگی بسر کرتے رہے۔

(۳) حصّہ جنوبی: اس جزیرہ نما کا موجودہ نام موریہ ہے مگر پہلا پے لوپنی سس یا پے لوپے نیز جس کے لفظی معنی ہیں "پیلو پون کا جزیرہ" اور پیلو پون کو یونانی دیومالا میں ایک قدیم نسل مانا ہے جو فرغیہ (ایشیائے کوچک) سے آکر یہاں بسی تھی۔ اس علاقے کا دوسرا قدیم نام آپے یہ ہے اور ہومر نے کہیں کہیں آرگس بھی کہا ہے۔ اس کے آٹھ حصے یا ملک تھے: ارکیڈیہ، لقونیہ، مسی نیہ، اے لِس، ارگولِس، اکائیہ، سک یانیہ، کورِنتھیہ۔

ارکیڈیہ۔ یہ بہت زرخیز ضلع تھا لیکن اس کے باشندوں کی عقلی اور دماغی حالت کچھ بہتر نہ تھی جس کا ایک سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارکیڈیہ کے حصے میں کوئی ساحل نہ آیا تھا اور بیرونی دنیا سے لین دین اور مبادلہ خیالات کے وسائل میں اسے دیگر اقطاعِ یونان کی مثل آسانیاں بھی حاصل نہ تھیں۔

لقونیہ۔ تاریخ قدیم میں یہ علاقہ بھی ایٹی کا سے کچھ کم مشہور نہیں کہ مخزن شجاعت اسپارٹہ اسی کا مرکزی شہر تھا۔ اس کی مغربی سرحد پر ٹے گے ٹاس پہاڑ اور یوروٹاس ندی کا نام تاریخ میں بار بار آتا ہے مگر ان کے علاوہ بھی یہ سرزمین ہر طرف پہاڑوں

اور سمندر سے گھری ہوئی تھی اور اسی لئے یوری پڈیز (یوری بیدش) کے بقول ع

"عدو کی وہاں تک رسائی نہ تھی"

مسی نیہ۔ لقونیہ کا مغربی ہمسایہ اور اپنی زرخیزی میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔ اور اسی واسطے اہلِ اسپارٹہ کا ہمیشہ مشقِ ستم بنا رہا۔

اے لِس۔ یہ ضلع نہ کچھ ترقی یافتہ تھا نہ ایسا آباد۔ لیکن یونانی دیوتاؤں کے بادشاہ جُوپٹر (عطارد) کا مندر شہر اولمپیہ میں یہیں واقع تھا، جسے قدیم یونان میں کعبے کی منزلت حاصل تھی اور جہاں پر چوتھے سال بہت بڑا تیرتھ ہوا کرتا تھا۔ ان ایام میں اہل یونان جنگ و جدال کو حرام سمجھتے اور سخت سے سخت دشمن بھی اے لِس کی مقدس زمین میں داخل ہوتے ہی دوست بن جاتے تھے۔ اس چار سالہ حج کا نام اولمپیاڈ تھا اور اسی سے سنیں کا حساب کرتے تھے۔ مثلاً کہیں گے کہ پانچویں اولمپیاڈ کے تیسرے سال میں شہر رومہ کی بنیاد پڑی، گویا تیرتھ کے آغاز سے تیئیس برس بعد۔ اور یہ آغاز جدید مؤرخین کی کثرت رائے کے بموجب ۷۷۶ ق م میں ہوا تھا۔ چنانچہ اسی کی بنیاد پر یونانی تاریخ کے موجودہ سنین قرار دیئے گئے ہیں۔

اکائیہ۔ لیکن اب ہم پی نیئس اور لاری سس ندیوں کو عبور کرکے ایلس کے شمال مغربی علاقے اکائیہ میں پہنچتے ہیں جو قدیم یونان کے آخری زمانے میں اس قدر مشہور ہوا کہ رومیوں نے جب یہ ممالک فتح کئے تو سارے یونان کو صوبۂ اکائیہ ہی کا نام دیا۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی عام ہے کہ جب ڈورِئن قوموں نے جزیرہ نمائے پیلوپنی سس کو فتح کیا تو یہاں کے قدیم باشندے جو اکائی کہلاتے تھے سوائے اکائیہ کے کہیں اپنی آزادی قائم نہ رکھ سکے اور یا گھر چھوڑ چھوڑ کر یونان سے نکل گئے یا اپنے فاتحین کے غلام بن گئے البتہ اکائیہ میں اُن کی خودمختاری برقرار رہی اور یہ سنگستانی علاقہ بہت دن تک اپنی مختلف زبان اور معاشرت کے باعث 'غیر یونانی' رہا۔

سکیانیہ۔ اکائیہ کی مشرقی سرحد سے ملا ہوا خلیج کورنتھ کے کنارے کنارے جو علاقہ چلا گیا ہے اُسے سکیانیہ یا سکیان کہتے تھے۔

ارگولس۔ سکیانیہ کے جنوب میں ایک چھوٹا جزیرہ نما تھا۔ اگرچہ زمین پہاڑی تھی لیکن جہاز رانی کے واسطے اس کے نشیبی ساحل بہت موزوں تھے۔ اوّل اوّل اس علاقے کو بڑی قوت حاصل رہی اور قومِ ہیلنیز کے نووارد فاتحین کا بھی سب سے پہلے غلبہ یہیں ہوا۔ چنانچہ اسی ضلع کا پایۂ تخت ارگس بہت دن تک سارے جزیرہ نما کا سربرآوردہ شہر مانا جاتا تھا اور صدیوں تک اسپارٹہ کا رقیب بنا رہا۔

کورنتھیہ۔ یہ علاقہ چھوٹے ہونے کے باوجود نہایت خوش حال اور طاقتور تھا۔ اُسے زیادہ شہرت اس لئے بھی حاصل تھی کہ پیلوپنی سس میں جانے کے لئے اسی خاکنائے کو عبور کرنا پڑتا تھا اور یہی وہ کڑی تھی جو تمام جزیرہ نما کو شمالی ہیلاس کے ساتھ ملاتی تھی۔

قدیم یونان کے صوبے یہ تھے۔ مگر تمام ہیلاس اپنے عہد آزادی میں کبھی ایک قومی سلطنت کے ماتحت متحد نہ ہوا اور اکثر اوقات اس کے ایک ایک ضلع میں کئی کئی خودمختار حکومتیں بنیں۔ پس ہیلاس کی تاریخ میں بھی ہر مقام برابر کا حصہ دار نہیں بلکہ درحقیقت جن قدیم باشندوں نے اپنے علم و حکمت یا دانائی اور شجاعت سے یونان کو یونان بنایا وہ زیادہ تر اُس کے چار ضلعوں (ایٹکا، بیوشیہ، لقونیہ اور اکائیہ) کے رہنے والے تھے۔

ہیلاس کے جزیرے:۔

جزیرہ نمائے یونان کے تینوں طرف سمندر میں بہت سے جزیرے بکھرے ہوئے ہیں اور قدیم جہاز رانوں کو ان سے بڑا سہارا ملتا تھا۔ خصوصاً ایشیائے کوچک اور یونان کے درمیان اگر وہ "حلقے" (یونانی لفظ سائی کلیڈیز) اور وہ "سلسلے" (اسپورے ڈیز) جزیروں کے نہ ہوں تو ان ملکوں میں ایسے قریبی تعلقات کا ہونا ممکن نہ تھا جن کی بدولت ایشیائی تہذیب اور شائستگی یونان میں آئی۔ اسی بنا پر قدیم مؤرخوں نے اِن

جزیروں کو یورپ وایشیا کے درمیان سیڑھی کے ڈنڈوں سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی کل تعداد تریپن تھی، مگر ان میں نک سوس، پاروس، کی روس، می لوس اور ڈی لوس زیادہ مشہور ہیں۔ ڈی لوس اس تمام مجمع جزائر میں چھوٹا تھا مگر اپالو دیوتا کا جنم بھوم سمجھے جانے کے باعث اس کی بڑی عزت اور تقدیس کی جاتی تھی۔

یونان کے باقی جزیروں کی دو قسمیں تھیں: (۱) وہ جو ہیلاس کے ساحل سے قریب ہیں اور (۲) وہ جو اس سے زیادہ فاصلے پر واقع ہوئے ہیں۔

۱۔ کرکائی را (اپی رس کے ساحل کے نزدیک) جسے آج کل کارفو کہتے ہیں، اپنی عمدہ بندرگاہوں اور قلعوں کی وجہ سے مشہور تھا۔

ذاکن توس لے لس کے ساحل سے قریب ہے اور اطالیہ کو جانے میں اکثر جہاز یہاں ٹھیرا کرتے تھے۔

کیتھرا (یا سیتھرا) لقونیہ کے جنوب میں اسی نام کی خلیج کے سرے پر واقع ہے۔

سلامیس اور اجی نا۔ یہ دونوں تاریخی جزیرے ایٹی کا اور ارگولس کے درمیانی سمندر (یعنی خلیج سارونیک) میں واقع ہیں۔

یوبیہ (جسے اب نگ روپانٹ کہتے ہیں) بحر ایجین میں سب سے بڑا جزیرہ ہے اور بیوشیہ کے ساحل سے اس قدر متصل چلا گیا ہے کہ بعض مقام پر فاصل سمندر کی چوڑائی ایک میل سے بھی کم رہ گئی ہے۔ قدامت میں ارٹ ریا اور چال کیس یہاں کے مشہور شہر تھے۔

اس کائی روس یوبیہ کے قریب ہے اور ساحل تراقیہ یا تھریس سے ملے ہوئے ساموتھریس اور تھاسوس، دو جزیرے اور مشہور ہیں۔

۲۔ دوسری قسم کے جزیروں میں جو یونان سے دور واقع ہیں یاد رکھنے کے قابل یہ ہیں: قریطش یا کریٹ۔ بحر روم کا سب سے بڑا جزیرہ ہے اور جب سے ہیل لینز قوم کا ایک گروہ یہاں آبسا تھا یہ بھی ہیلاس میں شمار ہوتا تھا۔

قبرسؔ (یا سائپرس)، ساحل شام کے قریب واقع ہے۔ ایک زمانہ میں اس کا تانبہ اور جہاز سازی مشہور تھی۔

لس بوسؔ ایشیائے کوچک کے نزدیک ایک وسیع اور سب سے شاداب یونانی جزیرہ مانا جاتا تھا اور اسی لئے یہاں کے تکلفات اور سامانِ عیش و نشاط ضرب المثل تھے۔

خی اوسؔ، لس بوس کے جنوب میں ہے اور اپنی صنعت و حرفت میں ممتاز تھا۔ اس کی ایک اور وجہ شہرت یہ ہے کہ راس الشعرا ہومر کی جائے ولادت ہونے کا دعوی دار تھا۔

ان کے علاوہ قدیم تاریخ میں ساموسؔ، کوسؔ اور روڈسؔ کا نام بھی آتا ہے اور یہ تینوں ایشیائے کوچک کے اسی ساحل کے پاس واقع ہیں جسے آئی اونیہ ڈورس کہتے تھے۔

باب دوم

زمانۂ ماقبل تاریخ

اس میں تو شک نہیں کہ ہیلِ لینیز قوم کئی عناصر سے مُرکّب تھی۔ خصوصاً اس کے دو بڑے اور نمایاں جزو وہ تھے جنھیں آئی اونین اور ڈورئین کہتے ہیں اور جن کی جُداگانہ خصوصیات کا ہم اس کتاب کے اگلے باب میں ذرا وضاحت کے ساتھ ذکر کریں گے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ان اختلافات کے باوجود ان شاخوں کی اصل جُدا جُدا نہ تھی اور ان کی زبان و معاشرت کے فرق بھی کچھ اسی قسم کے فروعی تھے جیسے کہ فی المثل اہلِ آگرہ اور اودھ والوں میں نظر آتے ہوں۔ مگر دقّت یہ ہے کہ اہلِ تاریخ کی کاوشیں یہیں تک ختم نہیں ہو جاتیں کہ اس قوم کے گروہوں اور اُن کے حالات کا پتہ چلائیں۔ بلکہ جس دن سے شلی مان کے پھاوڑے نے مائی کینہ (واقع ارگولس) کے حیرت انگیز "دفینوں" کو دوبارہ سُورج کی روشنی دکھائی ہے تاریخ کے لئے بالکل ایک نیا بیابان کُھل گیا ہے جس کی حدیں معدوم اور راہیں ابھی تک نامعلوم ہیں۔ ان انکشافات سے یہ تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ جس ہیلِ لینیز قوم کے حالات بقیدِ تحریر ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، وہ اس ملک میں بہت عرصے بعد غالباً گیارھویں صدی قبل مسیحی میں، آئی تھی اور یہاں کے اصلی یا قدیم تر باشندوں کی تہذیب و سلطنت کو مٹا کر یونان پر قابض ہو گئی تھی۔ اور یہ قبضہ ایسے دعوے کے ساتھ کیا تھا کہ پھر اپنے سوائے کسی اور کو یونانی کہنا تک اُسے گوارا نہ تھا۔ چنانچہ زبان و قومیت کے اعتبار سے جو لوگ اُس کے ہم خاندان ہوں وہ تو ہیلِ لینیز تھے، باقی تمام دنیا اس کی نظر میں "باربیرین" ایسے لوگ جن کی بولی خارج از فہم ہو، یعنی غیر یونانی وحشی یا ملیچھ۔

اور اس کی ان خودستائیوں کو ناواقف دنیا بھی بہت دن بے چون وچرا سنتی رہی۔

لیکن آخر ۱۸۷۶ء میں وہ طلسم ٹوٹا۔ یونان کی "تہذیب عتیق بڑے شان و تجمل کے ساتھ جرمنی کی علمی نمایش گاہوں میں نمودار ہوئی اور کم سے کم دو زمانوں کا سُراغ چلا، جن میں ایک ایجین اور دوسرا مائی کینی تہذیب سے منسوب ہے۔ پہلے کی نسبت قیاس کیا گیا ہے کہ جنوبی یورپ اور خصوصاً جزائر ایجین اس کے حلقۂ اثر میں تھے اور اس کا مرکز اصلی جزیرہ قریطش تھا، یونانیوں کی پُرانی داستانوں میں بھی اس جزیرے کے ایک بادشاہ مینوس کا تذکرہ ملتا ہے جو "تمام عالم یونانی کا حاکم اور بڑا صاحب سطوت و معدلت شاہنشاہ تھا" اور مرنے کے بعد بھی جسے عالم ارواح میں قضاء کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ بعض اوقات اس ایجین تہذیب کو اُس کے نام پر مینوسی بھی کہتے ہیں اور مسٹر آرتھر ایوانز نے تھوڑے دن ہوئے آثار قدیمہ کی بین الاقوامی مجلس میں اپنے بیش بہا نتائج تحقیقات پیش کرتے وقت اس پر بڑی دلچسپ بحث کی تھی اور یہ دکھایا تھا کہ اس تہذیب کی نشو و نما کا زمانہ مسیح سے قبل تیسری ہزاری[۱] میں قرار دینا چاہیئے اور آخری عہد فروغ پندرھویں صدی قبل مسیح سمجھنی چاہیئے کہ اسی کے قریب جزیرۂ مذکور کے قدیم صدر مقام کناسس کے تاریخی محل میں آگ لگی تھی۔

لیکن جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں سب سے اہم انکشافات ڈاکٹر شلی مان نے ۱۸۷۶ء میں کئے اور قدیم شہر مائی کینہ کے کھنڈروں سے قبور و آثار کہن کا ایک عظیم ذخیرہ کھود کے نکالا جس میں انسانی ہڈیوں کے علاوہ اسی زمانے کے بے شمار ظروف و زیورات پائے گئے اور رفتہ رفتہ اس عہد کی بعض خصوصیات کا پتہ چلا جن کی بنیاد پر اُسے ایک علیحدہ اور ممتاز تہذیب مان لیا گیا اور پھر ہومر کی نظموں اور مصر کے قدیم کتبوں سے بھی اس کی تصدیق ہوئی کہ گیارھویں صدی سے پہلے اور بہ قیاسات غالب سترھویں صدی قبل مسیح کے اخیر تک اسی تہذیب کے اوج و سرسبزی کا زمانہ ہے جسے اب مائی کینی تہذیب

---

[۱] ہزاری سے مُراد دس صدی یا ایک ہزار برس کا زمانہ ہے۔

کہتے ہیں۔

ان اکتشافات نے تاریخ کی جو بڑی گتھی سلجھائی وہ یہ تھی کہ یونان کے ماقبل تاریخ یا زمانۂ شجاعت کے جو حالات اور افسانے ہم تک پہنچے ہیں، اُن میں ثابت ہوا کہ اُس قوم کے افراد کا ذکر نہیں ہے جو بعد میں ہیلنیز اور خاص یونانی کہلائے۔ بلکہ دراصل یہ اُن پہلے لوگوں کے قصّے ہیں جنھیں اکثر جدید مؤرخین اکائی قوم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

بعضوں کا خیال ہے کہ مائی کینی تہذیب کے یہ اکائی بانی ہیلنیز قوم ہی کی ایک شاخ تھے جو یونان میں کچھ صدی پیشتر آئے۔ لیکن یہ خیال زیادہ وزنی نہیں ہے اور یہ امر کہ بعد کے ڈورئین حملہ آوروں نے مائی کینی تہذیب کو مٹا دیا تھا، اُنھیں کم از کم تاریخی اعتبار سے ایک غیر قوم دکھانے کے لئے کافی ہے۔

اب ایجین تہذیب کا تو ذکر ہی کیا کہ اس کے خط و خال سراسر دُھندلے اور قیاسی ہیں، خود ان اکائیوں یا اُن کی مائی کینی تہذیب کے حالات لکھنے کا اس کتاب میں محل نہیں ہے کہ وہ بھی اب تک مسلسل نہیں، نہ متحقق طور پر دریافت ہو سکے۔ اور سچ پوچھیے تو اُصل یونانیوں کی تاریخ میں داخل بھی نہیں ہیں۔ البتہ ہم زمانۂ شجاعت کے زیادہ مشہور افسانوں کا خاص کر ہومر کی زندہ جاوید نظم کا کچھ حال اس باب میں تحریر کریں گے اور اُس تمدن کے بھی بعض پہلو سامنے لائیں گے جو اگرچہ خاص یونانیوں کا نہ ہو لیکن پھر بھی اُن پر اُس کا بہت اثر پڑا تھا اور جسے بعد میں وہ اپنا ہی قدیم تمدن سمجھنے لگے تھے۔

اس کے علاوہ ہر چند یہ عہد شجاعت بظاہر اسی سلسلے کی آخری کڑی اور اسی غیر مستند زمانے کا ایک حصّہ ہے جس میں یونانی علم خرافات (یعنی دیو مالا) کی بموجب، زمین پر دیوی دیوتا اور غیر انسانی ہستیاں آباد تھیں۔ بایں ہمہ اس میں مطلق دیوتاؤں کی بجائے نیم دیوتا انسانوں کا ذکر آتا ہے اور اس طرح گویا اصلی تاریخ سے وہ نزدیک تر ہے۔ اُس کی حدود زمانی قیاساً چودھویں صدی سے بارھویں صدی قبل مسیح تک پھیلتی ہیں اور اگر اس کے

متعلق روایتوں میں اصلیت کا کوئی شائبہ ہی نہ ہو بلکہ محض شاعری صرف کی گئی ہو، تو بھی وہ ہمیں قدیم یونانیوں کے خیالات اور طرزِ فکر سے ضرور آگاہ کرتا ہے اور ان اوہام وعقاید کی تصویریں دکھاتا ہے جو عقل کی پختگی اور علم کی روشنی حاصل کرنے سے پہلے قوموں کے ہوا کرتے ہیں۔

مگر اس سے پیشتر کہ ہم "زمانۂ شجاعت" کے ناموروں کی یاد تازہ کریں "نیم دیوتا انسان" کا مفہوم پھر سمجھ لینا ضرور ہے۔ ان معنی میں سورما کی جو اصطلاح ہماری زبان میں رائج ہو چلی ہے وہ یونانی الاصل لفظ ہیرو کا ترجمہ ہے۔ ہیرو اوّل اوّل محض ایک اعزازی اسم صفت تھا اور ہومر نے نہ صرف اُمرا اور سرداروں بلکہ معمولی سپاہیوں پر اس کا اطلاق کیا ہے۔ مگر بعد میں اس کی یہ حیثیت اور تعمیم نہ رہی اور وہ محدود معنوں میں اُن اشخاص کے لئے خاص ہو گیا جن کے غیر معمولی یا فوق عادت قد و قامت اور قویٰ ہوں اور گو اُسے ربّانیت سے کوئی علاقہ نہ ہو تاہم اس کی پرستش کی جائے اور مرنے کے بعد بھی وہ بُرائی بھلائی کرنے پر قادر ہو۔

اب اسی قسم کے چند سورماؤں کے حالات ہم یہاں لکھیں گے جو شہرت کے اعتبار سے یا اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں کہ اُن سے اُس زمانے کے تمدّن و معاشرت یا افکار و عادات پر کچھ روشنی پڑتی ہے:۔

پرسیئس

ان ماقبلِ تاریخ داستانوں میں پہلا نام پرسیئس کا ہے۔ پرسیئس کو اُس کے دادا شاہ ارگولس نے "ایشیا" کی تسخیر کرنے کے واسطے بھیجا تھا اور اس لئے اس کے تمام کارناموں کا میدان شام اور ایشیائے کوچک میں ہے۔ بلکہ پانچویں صدی قبل مسیح میں جب مؤرخ ہیروڈوٹس نے ان اطراف کا سفر کیا تو بعض مصری قسّیسوں سے اس کا نام اور افسانے سُنے، مگر ہم اس کا قصّہ یہیں تک رہنے دیں گے۔ اُن سے اگر کچھ تاریخی فائدہ حاصل ہوتا ہے تو صرف اس قدر کہ اہل یونان کی ایشیا کے مغربی ساحلوں پر آمد و رفت اسی زمانے سے تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ جزیرہ روڈس اور جنوبی ایشیائے کوچک میں اُن کی نوآبادیاں بھی انھی دنوں میں بسائی گئی تھیں

۲- ہرقلیس اور اس کی "مشقتیں"

زمانۂ شجاعت کا سب سے نامور سورما ہرقلیس (ہرکیولیز) ہے۔ وہ ال کیئس کا پوتا اور پرسیئس کا پر پوتا اور ماں کی طرف سے بھی شاہ مائی کینہ الک ٹریون ابن پرسیئس کا نواسہ تھا۔ الک ٹریون اپنے ایک پوتے (اور ہرقلیس کے باپ) آم فی ٹریون پر بہت اعتماد کرتا تھا مگر اسی کے ہاتھ سے مارا گیا اور پھر آم فی ٹریون نے مقتول دادا کی بیٹی ال سمین سے (جو رشتے میں اس کی پھپی ہوئی) شادی کر لی اور خود بادشاہ بن گیا، لیکن پرسیئس کے ایک تیسرے بیٹے ستھی نلوس نے اُسے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور قتلِ جد کے الزام پر ملک سے نکال کے بادشاہت چھین لی۔ تب امفی ٹریون اور اس کی بیوی شہر تھیبنز (یا تھیبیہ) میں جا بسے اور وہیں اُن سے ہرقلیس پیدا ہوا۔ یہی سبب تھا کہ اس یونانی رستم کے ابتدائی کارنامے بیوشیہ کے علاقوں سے متعلق ہیں، جہاں تھس پیہ کے شیر کو مار کر اُس نے مویشی کو نجات دلائی اور شاہ ارجی نوس کو قتل کیا جو مجبور و مغلوب اہل تھیبنز کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آیا کرتا تھا۔ اسی موقع پر کہانیوں میں آیا ہے کہ اُس نے سفی سس ندی کی زمین دوز گزرگاہ توڑ کر وہاں جھیل بنا دی تھی کہ دشمن اُسے عبور نہ کر سکیں

اس عرصے میں مائی کینہ کے تخت پر ستھی نلوس کا بیٹا یورس تھیئس تاجدار بن چکا تھا اور یہی وہ شخص ہے جسے ہرقلیس کے ساتھ خاص عداوت تھی اور جس کے کہنے پر ہرقلیس کو دشت صحرا کی خاک چھاننی پڑی اور وہ کام انجام دینے پڑے جو "ہرقلیس کی مشقتوں" کے نام سے ضرب المثل ہیں یورس تھیئس کی عداوت کا سبب تو ظاہر ہے کہ وہ اُسے اپنا رقیب سلطنت جانتا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ ہرقلیس نے دشمنِ غاصب کا کہنا کیوں مانا، کیوں مصیبتیں بھریں اور کیوں نہ باوصف قدرت و زور اپنا ورثہ چھین لیا؟ اس کی وجہ کہانی میں یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ ہرقلیس نے غصہ میں آکر اپنی بیوی بچوں کو مار ڈالا تھا اور اسی مجنونانہ فعل کی پاداش میں اپالو دیوتا نے قبول توبہ کی یہ دل خراش شرط تجویز کی تھی کہ وہ اپنے دشمن اور غاصبِ حق

یورس تھیئس کے حکم پر چلے اور جو کچھ وہ کہے بے چون وچرا بجا لائے۔ یورس تھیئس نے بھی اس خداداد موقع سے خوب فائدہ اُٹھایا اور ایسی ایسی مہلک و مخدوش مہمات پر ہرقلیس کو بھیجا جنھیں سر کرنا انسان کی قوّت سے باہر اور جن سے بچ کر نکل آنا بظاہر امرِ محال تھا۔ مگر ہم اس قصّے کی، جو اسفندیار گشتاسپی کی داستان سے ملتا جلتا ہی، جزئیات کو قلم انداز کردیں گے کہ وہ حجم کتاب سے غیر متناسب ہیں، ہاں یہ لکھنا دلچسپی اور فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ اس یونانی ہیرو کی موت یا دنیا سے اُٹھایا جانا بھی اس کے افسانے کو ایشیائی داستانوں سے مشابہ کردیتا ہی۔ چنانچہ قصے میں اس کا خاتمہ، زندگی چتا پر بیان کیا گیا ہے جس کے شعلے اُسے آسمان اور غیر فانی دیوتاؤں کے رُتبۂ عالیہ تک پہنچا دیتے ہیں)۔

لیکن ہرقلیس کی زندگی کا زیادہ معنی خیز پہلو دوسرا ہے جہاں اس کی حیثیت ایک معمولی فتحمند بادشاہ کی نظر آتی ہی۔ مثلاً وہ لقونیہ کو فتح کرتا ہے، یا اے لس پر حملے جاتا ہے اور وہاں کے بے رحم حاکم کو مار کر ریاست اس کے بیٹے کے حوالے کردیتا ہے وکذالک۔ اس کی ان کارروائیوں میں کوئی بات فوق العادت نہیں اور اُن کی نمایاں خصوصیت یہ ہی کہ وہ حدود پیلوپنی سس تک محدود بیان کی گئی ہیں۔ اسی سے یورپ میں آج کل یہ قیاس پیدا ہوا ہی کہ غالبًا یہ سارا افسانہ دو ہمنام شخصوں کا ہی جن میں سے ایک ڈورین اور دوسرا کوئی قدیم اکائی نسل کا شہزادہ تھا۔ بعد میں جب ڈورین لوگ پیلوپنی سس میں آئے اور یہاں کی قدیم بادشاہت کا تختہ اُلٹا تو شاید اصلی آبادی کی نفرت مٹانے کی غرض سے انھوں نے اپنے ہرقلیس اور اُس کے اکائی ہمنام کو ایک ہی مشہور کردیا اور یہ کہنا شروع کیا کہ "ہم ہیں کے ایک شہزادے کا بدلہ لینے آئے ہیں جو اپنے ترکے سے بہ جبر و فریب محروم کردیا گیا تھا اور خانماں برباد ہمارے پاس تھیبز میں پناہ لینے گیا تھا۔ پس اسی کی اولاد ہی جسے ہم یہاں بادشاہ بنانا چاہتے ہیں"۔ اور اس میں شک نہیں کہ جتنے ڈورین خاندانوں نے پیلوپنی سس میں حکومت کی وہ سب اپنا جدامجد ہرقلیس ہی کو بتاتے تھے اور اپنے "ہرقلی"

ہونے پر فخر کرتے تھے۔

۳۔ تھی سی اس

ہرقلیس کا افسانہ گزرتے ہی تھی سی اس کا نام اد بدا کے ذہن میں آجاتا ہے جو اپنے کارناموں کی وجہ سے "دوسرا ہرقلیس" مشہور ہوا۔ وہ ہم عصر ہونے کے علاوہ ہرقلیس کا رشتہ دار بھی تھا اور اس کے کارنامے ہرقلی مشقتوں سے کچھ کم مشابہ نہیں ہیں۔ البتہ اتنا فرق نظر آتا ہے کہ ہرقل کا دائرہ عمل وسیع تھا اور تھی سی اس نے جو کچھ کیا وہ صرف ایٹی کا میں ایک چھوٹے پیمانے پر کیا۔ بہرحال یہ حدبندی بھی ہمارے مفید مطلب ہے اور چوتھے باب میں جہاں ایٹی کا کی ابتدائی تاریخ سے ہم بحث کریں گے وہاں تھی سی اس کی داستان سے فائدہ اُٹھانے کا موقع بھی ہاتھ سے نہ دیں گے۔

۴۔ جنگ ٹروائے

لیکن اب ہم سورماؤں کے انفرادی کارناموں کو چھوڑ کر یونانیوں کی اُس اجتماعی مہم پر نظر ڈالتے ہیں جو زمانۂ شجاعت کی سب سے آخری اور سب سے بڑی داستان کا موضوع ہے۔ اس سے پہلے کی دو اور کہانیاں، یعنی تھیبز پر سات سرداروں کی چڑھائی یا جاسن کی بحری مہم، اس قابل نہیں نظر آتیں کہ اس مختصر کتاب میں انھیں داخل کیا جائے۔ اگرچہ اُن سے اتنا سراغ چلتا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے یونانیوں کی سمجھ بوجھ میں ترقی ہوتی ہے اور ساتھ ہی اُن کے قصوں سے شخص پرستی اور خوارق و معجزات کا رنگ اُڑ جاتا ہے اور وہ بڑے بڑے کاموں کو افراد سے منسوب کرنے کی بجائے جماعتوں کا نتیجۂ فکر و عمل تصور کرنے لگے ہیں۔ مگر اس اعتبار سے بھی جنگ ٹروائے کی عظمت نے اور تمام روایتوں کو حقیر کر دیا ہے اور ہومر[1] کی دلپسند نظموں نے اُسے

---

[1] روایت عام کے بموجب دورِ سلف کا یہ جلیل المرتبہ شاعر جزیرہ خی اوس یا ساحل ایشیائے کوچک کا ایک نابینا شاعر تھا جو ایلیڈ اور اوڈیسی کا مصنف ہے۔

شہرتِ دوام کا وہ مُرصّع لباس پہنایا ہے جو ہندوؤں کی مہابھارت اور فردوسی کے شاہنامے کو بھی حاصل نہیں۔

تمہید اس نیم تاریخی داستان کی شاعر نے یوں رکھی ہے کہ جب ہرقلیس دنیا سے اُٹھا لیا گیا تو یورس تھیئس نے اس کے بیٹوں کو گرفتار کرنا چاہا اور وہ شہر بہ شہر چھپتے پھرے، حتیٰ کہ ایٹیکا میں پناہ لی اور پھر تھی سی آس کی مدد سے غاصب یورس تھیئس کو مغلوب کیا۔ مائی کینیہ کی بادشاہت ہرقلیس کے بیٹے ہائی لس کے ہاتھ آئی اور جب وہ مرا تو اُس کا فرغوی النسل اماموں اٹ رئیس بادشاہ ہوا۔ پیلو پون کے خاندان کا پہلا حکمراں وہی تھا اور اس کا جانشین بہادر اے گامیم نن ہوا جس کے بھائی مینی لوس کو خوبصورت ہیلن بیاہی گئی تھی جو شاہ لقونیہ کی بیٹی اور حسن و جمال میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔ یہی شہرت شہزادہ

بھاٹ تھا جو بیلے پر اپنے منظوم افسانے گا کے سُناتا۔ انھیں کے دو مسلسل مجموعوں کا نام اِلیڈ اور اُڈیسے ہے اور وہ یونان میں فن کتابت رائج ہونے کے بعد قید تحریر میں آئے۔ پہلی نظم میں شہر ٹروآے (ٹروجہ، ایلیم یا ایلیون) کے طویل محاصرے اور تسخیر کا ذکر ہے اور اُن سورماؤں کے کارنامے تحریر ہیں جنھوں نے لڑائی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ چنانچہ محاصرین کا سب سے بڑا ہیرو اے کل لیز (اکی لس) ہے اور محصورین کا ہکٹر۔ دوسری نظم میں یونانیوں کے سب سے عقیل سردار اور بادشاہِ اتھی کا اُڈے سیس کی سرگردانی اور مراجعت کے حیرت انگیز افسانے ہیں جن سے ماقبل تاریخ یونان کے جغرافیائی علم اور رعام اوہام و عقاید کا حال کھلتا ہے نیز ان کی معاشرت اور طریق جنگ کی ایسی تصویریں ہمارے سامنے آجاتی ہیں جو ہزار رنگ آمیزیوں کے باوجود اصلی حالات تک ہمارے تصور کی رہنما ہیں۔ یورپ کے نکتہ چینوں نے اصلیت ایک طرف خود ہومر کے متعلق سخت شبہات پیدا کر دیئے تھے کہ اس نام کا کوئی شخص ہوا بھی تھا یا نہیں؟ اور اگر ہوا تھا تو آیا یہ نظمیں اسی اکیلے کی طبع زاد بھی تھیں؟ لیکن وہ ایک ہی شخص کا کلام ہوں یا نہ ہوں اس میں تو اب بہ مشکل شک کیا جا سکتا ہے کہ اِلیڈ میں جھوٹی کہانیوں کا نہیں بلکہ (شاعرانہ مُبالغے کے ساتھ) واقعات کا بیان ہے۔ کیونکہ جب سے ڈاکٹر شلی مان نے ٹروآے کے کھنڈر ترکی قلعے حصارلک کے پاس نکالے ہیں، ہومر کی بہت سی باتیں صحیح ثابت ہوئی ہیں ۱۲

پیرس[1] کو پایۂ تخت ٹروآئے سے کھینچ کر لقونیہ لائی جہاں ہیلن کے شوہر مینی لوس کو اس کے خسر نے حکومت سونپ دی تھی۔ پیرس بہت دن لقونیہ کے پایۂ تخت اسپارٹہ (ایلیئن ڈمیں) میں شاہی مہمان رہا اور ایک دن جبکہ مینی لوس باہر گیا ہوا تھا اُس نے اُس کی حسین بیوی کو دھوکے سے یا زبردستی ہمراہ لیا اور بہت سے زر و جواہر سمیت جہازوں میں بیٹھ کر اپنے وطن کی راہ لی۔ اسی ناروا کارروائی کا جذبۂ انتقام تھا جس نے تمام یونان خاص کر جزیرہ نمائے پیلوپُنی سس کے بادشاہوں کو ٹروآئے سے لڑنے پر متحد کر دیا اور وہ اپنی اپنی فوجوں سمیت ایگامیمنن کی ماتحتی میں ایک زبردست مہم ایشیا پر لے گئے۔

جدید اہل تاریخ کہتے ہیں کہ اس قسم کی دغابازیاں کہ جس کے ہاں مہمان رہے اُسی کو لوٹ لیا، اُس عہدِ وحشت و ظلم کی معمولی وارادات تھی۔ خصوصاً قدیم یونانیوں کو عورتیں بھگالے جانے میں بڑی بیباکی اور مہارت حاصل تھی، اور ہیروڈوٹس کی روایت صحیح ہو تو ٹروآئے کے معاملے میں پہل اِدھر ہی سے ہوئی تھی، تاہم پیرس کا یوں آکے مہمان رہنا اور اپنے میزبان بادشاہ کی حسین ملکہ کو اُڑا لے جانا، ملک بھر میں عام اشتعال پیدا

---

[1] پیرس، پریام کا بیٹا تھا اور پریام ساتویں پُشت میں بانیٔ سلطنت دردانوس کا وارث سلطنت اور ای لوس ابن ٹرواس کا پوتا تھا، دردانوس کے آگے اس خاندان کا پتہ نہیں چلتا۔ اگرچہ بعض قرائن سے پایا جاتا ہے کہ یہ کوئی یونانی یا نیم یونانی شخص تھا جس نے آبنائے دردانیال کے جنوبی کونے پر شہر دردانیہ بسایا اور ایک باقاعدہ حکومت کی بنیاد ڈالی تھی، اُس کے پوتے ٹرواس نے اپنی بادشاہت فرغیہ اور یورپ میں تھریس تک پھیلائی اور اسی کی مملکت کا نام تاریخ میں ٹرواس ہوا۔ شہر الیون یا ایلیم اُس کے بیٹے الوس کا بنا نہادہ ہے لیکن اسے ابھی شاہِ ٹرواس کے نام پر زیادہ تر ٹروآئے یا ٹروجہ کہتے تھے۔ ہومر کا بیان ہے، اور یہ روایتیں بیشتر اسی کی نظم سے ماخوذ ہیں، کہ پریام کے باپ لومیدن کے عہد میں ہرقلیس نے یہ شہر تسخیر اور تاراج کر ڈالا تھا اور اسی مصیبت کے بعد لومیدن نے اس کے وہ غیر معمولی استحکامات اور حصار تیار کرائے تھے کہ ٹروآئے کی فصیلیں دیوتاؤں کی تعمیر کردہ سمجھی جاتی تھیں ۱۲

ہو جانے کی کافی وجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن بدگمان یورپ اس پر اکتفا نہیں کرتا: اُس کے نزدیک مہم ٹروآے کی وجہ تحریک یہ ہو گی کہ ٹروائے نہایت دولتمند شہر مشہور تھا اور اُسے لوٹنے کی طمع نے یونان کے مختلف بادشاہوں کو اس طرح متحد کر دیا تھا۔ گو اس میں شاہِ اگامیمنن کی ذاتی کوشش اور رسُوخ کا بھی ضرور دخل ہو گا کہ مینی لوس کا بھائی اور سب سے بااثر حکومت کا مالک بھی وہی تھا۔

بہرحال، یہ عظیم الشان مہم جس میں اکرنانیہ کے سوا تقریباً تمام ریاست ہائے یونان کی فوج شریک تھی، بیوشیہ کی بندرگاہ ادلیز سے کھلے جہازوں میں چلی اور بہ خیر و خوبی ایشیائی ساحل پر جا اُتری۔ ہومر نے جہازوں کا شمار بارہ سو بتلایا ہے اور ان میں اسّی آدمی کی اوسط سے کل فوج ایک لاکھ کے قریب تخمین ہوتی ہے۔ تحقیق پسند مؤرخ توسی ڈدیز (طوسی دیدش) اس تعداد کو مبالغہ آمیز مگر قرین قیاس سمجھتا ہے۔ غلط ہو یا صحیح اس میں شک نہیں معلوم ہوتا کہ یہ جمعیت اتنی کثیر تھی کہ فریق مقابل میدانی لڑائی کی ہمت نہ کر سکا اور اپنے قلعے کے اندر جا گھسا جس کی مضبوطی کے آگے قلت و کثرت کا فرق ہیچ رہ جاتا تھا کیونکہ فن تعمیر اُن دنوں کیسی ہی غیر ترقی یافتہ حالت میں ہو، یہ ظاہر ہے کہ بڑی بڑی دیواریں بنا لینا چنداں دشوار کام نہ تھا اور کوئی بادشاہ بھی جسے کافی دولت اور آدمی میسّر آئیں ایسے حصار تیار کرا سکتا تھا جو اُس زمانے میں ناقابل انہدام سمجھے جائیں۔ اس لئے کہ جب آلات قلعہ شکنی ناکافی بلکہ نامیسّر ہوں تو ہر چوڑی شہر پناہ ایک "لاینکسر" قلعہ ہو گی، پس ہومر کے اس بیان میں کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ اگامیمنن بہ آن ہمہ کر و فر ٹروآئے کی فصیلیں نہ توڑ سکا اور آخر وہی طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا جو چند صدی قبل تک قلعہ گیری کا عام ذریعہ رہا ہے، یعنی شہر کو ایسے بند و بست کے ساتھ گھیر لیا جائے کہ محصورین مطلق رسد نہ حاصل کر سکیں اور بھوک سے تنگ آکر ہتیار ڈال دیں۔

مگر اُس زمانے میں محاصرین کی رسد رسانی کا انتظام بھی کچھ کم دشوار نہ تھا خاص کر

جبکہ فوج اتنی بڑی ہو جتنی کہ اگامیمنن کی تھی اور وطن سے اتنی دُور ہو جتنا کہ یونان سے ٹروآئے۔ اس وقت نہ تو رسل و رسایل کوئی آسان چیز تھی اور نہ قومیں اتنی دولتمند اور منتظم تھیں کہ اپنی فوجوں کو دُور سے تمام سامانِ خورد و نوش مہیا کر دیا کریں۔ الغرض یونانی محاصرین کو بھی جلد یہ دقّتیں پیش آنے لگیں اور دستورِ زمانہ کے بموجب انھوں نے آس پاس کے علاقے لوٹنے شروع کئے۔ لیکن یہ غارت گری ایسا ذریعہ رسد رسانی ہے جو خود اپنے کو مٹا دیتی ہے، چنانچہ چند ہی روز کے بعد یہ سلسلہ اپنے آپ ٹوٹ گیا، لوٹنے کو کچھ باقی نہ رہا باشندے تمام بھاگ گئے اور ہمسایہ ریاستیں بھی محاصرین کی دشمنی میں در پردہ اہل ٹروائے کی مدد پر کمربستہ ہوگئیں اور جب اگامیمنن کو رسد رسانی کی مشکلات نے مجبور کیا کہ اپنی فوج کا ایک حصّہ زراعت کرنے کے لئے (موجودہ گیلی پولی میں) بھیجے، تو محاصرے کا دباؤ گھٹ گیا اور محصورین نکل نکل کر مقابلے کرنے لگے اور کچھ اپنی مایوسانہ بہادری اور کچھ ہمسایوں کی ہمدردی کے بل پر کئی بار باہر آ کے سامانِ رسد قلعے میں لے لے گئے۔ اس طرح محاصرہ طول کھینچتا گیا اور آخر دس سال کی لمبی مدت کے بعد، اپنے اکثر عالی نژاد سردار کٹا کے، ٹروآئے نے قسمت کے آگے سر جھکایا۔ اور اس وقت بھی اُس کی تسخیر نہ محض قوّت بلکہ فریب سے عمل میں آئی۔ بہر تقدیر، یونانی فاتح شہر پر قابض ہوگئے، اور اتنے دن کی جھنجھل یوں اُتاری کہ سارے شہر کو لوٹ کر ویران کر دیا اور باقی ماندہ باشندوں کو دُور تک نکال آئے، شاہِ پیریام اور اُس کی تمام نرینہ اولاد قتل کر دی گئی اور بدنصیب ملکہ اور شہزادیاں فتحمندوں کی لونڈیاں بن کر رہنے کے لئے زندہ چھوڑ دی گئیں۔

فتح تو بے شبہ یہ بڑی عظیم الشان تھی مگر اس کی خوشیاں عارضی ثابت ہوئیں۔ اور جب فتحمند یونانی بادشاہ وطن کو لوٹے تو انھوں نے گھر کا نقشہ بالکل بدلا ہوا اور اپنی حکومتوں پر دوسروں کو قابض پایا۔ اُس زمانے میں یہ انقلاب کچھ عجیب بات نہ تھی، بلکہ سچ یہ ہے کہ اگر یہ لوگ عدم موجودگی میں اپنی نیابت کا انتظام کر جاتے تب بھی غالباً

دس برس کی مدت اُسے اُلٹ پلٹ کر دینے کے لئے کافی تھی کیونکہ تمدن کے ابتدائی مدارج میں قومیں اتنی صلاحیت نہیں رکھتیں کہ کسی اصول یا آئین پر مستقل قایم ہو جائیں۔ غرض یونانی فتحمندوں کو اپنی مراجعت پر سخت ذلت و مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا اور اُن میں سے اکثر بادشاہ ترک وطن پر مجبور ہوئے اور اپنے گروہوں سمیت یونان سے باہر جہاں تہاں[ل] منتشر ہو گئے، ان سب میں زیادہ قابل افسوس اگامیمنن کی بدنصیبی ہے کہ باہر جاتے ہی اس کی ملکہ نے ایک اور شخص سے رشتہ جوڑ لیا تھا اور جب یہ نامور بادشاہ واپس آیا تو اسی آشنائی کا شکار ہوا اور اُس کے مرتے ہی اُس کے بیٹے اور دوسرے ساتھیوں کو بھی بھاگ کر جان بچانی پڑی۔

جنگ ٹروائے کا مختصر حال او نتایج یہ تھے، جو ہومر کی نظم سے ملتقط ہیں۔ ان کی سچائی پر زمانہ حال میں جو شکوک وارد کئے گئے ہیں اُن کا بھی ہم نے اشارتاً اوپر ذکر کیا ہے لیکن اُس دور قدیم سے واقفیت درکار ہو تو ہومر سے مستغنی ہو جانا محال ہے: اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عہد ہومر میں "صرف شعرا ہی مورخ ہو سکتے تھے" جس سے ایک یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گو اُن کا بیان مبالغہ آمیز ہو، اصلیت سے بالکل ہی خالی نہ ہوتا تھا کیونکہ اس کے بغیر وہ قابل اعتبار راوی اور اس لئے کامیاب شاعر بھی نہ کہلا سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ انھی شاعرانہ روایتوں سے، مذکورۂ بالا واقعات کے علاوہ ہمیں زمانۂ ماقبل تاریخ کی دیگر خصوصیات معلوم ہوتی ہیں جن کا دلچسپ بیان بہتر ہے کہ ہم مستند او رجدید اہل تحقیق[ل] کی زبان سے سُنیں:-

اُس زمانے میں اہل یونان کی آبادی غالباً ایسی زیادہ نہ تھی، وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں[ل] میں منقسم تھے جن کے مختلف شہروں میں باہم گرمیل جول اور خاصی آمد رفت جاری تھی اور رسم و رواج یا زبان و معاشرت کے لحاظ سے وہ قریب قریب ایک سے تھے؛ اُن کی

[ل] شلاً سرا در پراڈل۔ "دنیا کی تاریخِ مورخین" جلد سوم: یونان ۱۲

عام حالت ایک جنگ جو دیہاتی آبادی کی سی تھی جو اپنے سیدھے سادے طریقوں اور خوشگوار آب و ہوا میں مگن ہو، اور مذہب و معاشرت کی یکسانیت کی بدولت وہ بیسیوں قبائل اور ریاستوں میں بٹے ہونے کے باوجود ایک ہی کل کے اجزا معلوم ہوتے تھے۔ خصوصاً زمانۂ شجاعت کے سرے پر یہ اتحاد مشترکہ تہواروں، تیرتھوں اور باہم رشتہ داریوں سے اور زیادہ مضبوط ہو گیا تھا۔ تاہم وہ زنجیر جس نے ان سب کو ایک سلسلے میں باندھا تھا بھروسے کے لایق نہ تھی اور اسی لئے اب تک ان کا واحد قومی نام کوئی نہ تھا۔

لوگوں کا پیشہ زیادہ تر گوالی یعنی مویشی کی پرورش، اور زراعت تھا۔ صنعت و حرفت برائے نام تھی مگر شکار، ماہی گیری اور جنگ، آمدنی کے معقول ذریعے سمجھے جاتے تھے، زراعت میں غلّہ اور انگور کی کاشت، نیز باغبانی شامل تھی۔ اس میں بیل سے مدد لی جاتی اور بارکشی میں گدھے اور خچّر کام دیتے تھے۔ گھوڑا شاذونادر سواری میں استعمال کیا جاتا تھا، البتہ لڑائی کے وقت جنگی رتھوں میں اُسی کو جوتتے، مویشی میں گائے بھینس اور بھیڑ بکری اور سور پالے جاتے تھے۔ ادنیٰ درجے کا کام غلاموں سے لیا جاتا تھا، جہاز رانی سے بھی اُنھیں واقفیت تھی اگرچہ اُن کے جہازوں میں بالعموم تختوں کا پٹاؤ نہ ہوتا تھا اور بادبانوں کے بجائے وہ پتواروں کے سہارے کھیے جاتے تھے، بہت سی دھاتوں کا انھیں علم تھا اور گو لوہے کا تیار کرنا ابھی تک دشوار تھا مگر اس سے وہ کام لینے لگے تھے، سکّہ ان میں مروّج نہ تھا اور تھا تو بہت کم۔ بُنائی عورتوں سے مخصوص تھی لیکن اچھے بُنے ہوئے کپڑے کنعانیوں سے خریدے جاتے تھے جن کی تجارت کا یونانی سمندروں میں کوئی مدمقابل نہ تھا۔ اسلحہ البتہ خاص یونان میں تیار ہوتے اور زیورات وظروف کے علاوہ ہاتھی دانت، لکڑی اور مٹی کی بھی بعض مصنوعات بنتی تھیں۔ اوران کی تصویروں سے پایا جاتا ہے کہ مصوّرانہ صنّاعی یعنی خوبصورت اشکال بنانے کا شوق اہل یونان میں پیدا ہو چلا تھا۔ شہر و دیہات اور بروج و بارہ کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ فن عمارت میں بھی اُنھیں دخل تھا چنانچہ بادشاہوں کے مکانات پتھروں کے

بنائے جاتے اور ان میں بلند و وسیع کمرے اور ایوان اور پائیں باغ بھی ہوتے تھے۔

ذات پات کی نامبارک قیود یونان میں مفقود تھیں۔ زمانہ شجاعت کے رہنے والوں میں بے شبہ امرا اور عوام دونوں طبقے موجود تھے لیکن ملکی معاملات میں عوام برابر کے شوق اور دعوے کے ساتھ حصّہ لیتے اور اُمرا کا امتیاز محض نسب پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کے لئے ذاتی دلیری اور قوّت و فراست لازمی تھیں اور یہ اوصاف اوروں کی دسترس سے بھی باہر نہ تھے۔ طرزِ سلطنت اگرچہ شخصی تھا لیکن بادشاہ محض اُمرا اور احرار کا ایک سرگروہ ہوتا جو طبقہ اوّل کے مشورے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا اور اہم معاملات میں اُسے قوم کی ضامندی بھی لینی ضرور ہوتی۔ البتہ سپہ سالاری اور اعلیٰ پروہت کا منصب اس کے واسطے خاص تھا اور اسی لئے اُس کی بڑی فوقیت یہ ہوتی کہ جسمانی قوّت، دلاوری اور عقل و تجربہ کاری میں دوسروں سے بڑھ جائے۔ وہ شعائرِ دینی کی ادائیگی میں رہنمائی اور قوم کی طرف سے نذر و نیاز یا قربانیاں کرتا۔ وہ (اکثر سن رسیدہ اور تجربہ کار اُمرا کی معیّت میں) مسندِ عدالت پر بیٹھ کر مقدمات کے جھگڑے چکاتا۔ لیکن اس کا مقصود صرف کمزوروں کو طاقتوروں کے جبر و تشدّد سے بچانا تھا کیونکہ جب تک کوئی مدّعی نہ ہو سرکار کسی کے معاملے میں دخل نہ دیتی تھی۔ غریب الوطنوں کی مہمانی اور سفرائے غیر کی خاطر مدارات کا فرض بھی بادشاہ کے ذمّے تھا۔ مالِ غنیمت میں اُس کا حصّہ اوروں سے کچھ زیادہ ہوتا۔ اور اپنی مقررہ زمینوں کے حاصل کے سوائے، رعایا محض خوشی سے جو کچھ پیش کردے، وہی اُس کی آمدنی تھی اور ایک چوبدار جو عصائے شاہی لئے اس کے آگے آگے چلتا، اُس کا نشانِ بادشاہی! سرکاری مجلسوں اور تہواروں میں اُسے صدر پر جگہ دی جاتی اور قربانی کی ضیافتوں میں بھی اُس کا حصّہ دُہرا ہوتا، گفتگو میں اُسے بہ الفاظ تعظیمی خطاب کرتے مگر اس کے علاوہ اُس کے پاس آنے جانے یا نشست برخاست میں کسی ایسے غلامانہ آداب یا ضابطے برتنے کی ضرورت نہ تھی جو ایشیائی درباروں کی خاص شان ہے۔ لڑائی میں لوگ اپنے

اپنے سرگروہوں کے ماتحت گنجان صفیں باندھ کر لڑتے تھے اور ہرچند ان کے اُمرا کو سپہ سالاری کی کوئی خاص تعلیم نہ تھی لیکن فتح شکست کا دارمدار زیادہ تر انھی کی دلاوری پر منحصر ہوتا۔ ہر سردار اپنی جنگی رتھ میں لڑنے نکلتا اور گھوڑوں کی باگ سنبھالنے کے لئے ایک اور جوان اس کے ساتھ ہوتا کہ اُسے سانگ چلانے میں دقت پیش نہ آئے۔ سانگ چھوٹی برچھی کو کہتے ہیں جسے اکثر پھینک کر مارتے تھے۔ اُس زمانے میں فقط ایک بُرج دار فصیل اور خندق شہر کے بڑے استحکام سمجھے جاتے تھے؛ اور آلات قلعہ شکنی ایک طرف، اُنھیں محاصرہ کرنے کا بھی ڈھنگ نہ آتا تھا۔ ان جنگ جو لوگوں کے مشاغل زندگی میں شعر و موسیقی کو خاص مرتبہ حاصل تھا۔ عبادت و طعام، رزم و بزم، غرض ہر موقع پر وہ ایک ناگزیر چیز تھے۔ ہارپ (یعنی بیلہ یا ستار) الغوزہ اور بانسری اُن کے دلپسند باجے تھے اور عہد شجاعت کے اخیر میں دف یا نقارے کا بھی استعمال ہو چلا تھا، مگر بانسری اور الغوزہ کسانوں اور گڈریوں کا باجہ تھا اور بیلہ شعرا اور امیروں کا جو ہمیشہ گانے کے ساتھ بجایا جاتا؛ زندہ یا مُردہ سورماؤں کے کارنامے اُن کے گیتوں کا مضمون ہوتا تھا اور گانے والوں کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔

مذہب کا سیاسیات یعنی ملکی معاملات سے گہرا تعلق تھا۔ مگر علمائے مذہب ایک علیحدہ فرقے کی شکل میں کوئی خاص اثر و اقتدار نہ رکھتے تھے؛ تمام قربانیاں اور نذر و نیاز بادشاہ کی زیر ہدایت چڑھائی جاتیں یہ ان کی بڑی عبادت تھی اور اس میں کسی پیر یا دری کی موجودگی ضروری نہ تھی۔ البتہ ایسے مندروں کی بنیاد پڑ چکی تھی جہاں سایل تفاؤل یا استکہان (یعنی مکاشفہ یا دیوتاؤں کا مشورہ لینے) کی غرض سے رجوع کرتے اور پروہتوں کی معرفت آسمانی ہدایت اور احکام حاصل کرتے تھے؛ بایںہمہ زمانہ شجاعت میں یہ دستور بھی (جو بعد میں یونانیوں کا قومی آئین بن گیا تھا) زیادہ مقبول نہ تھا اور اس قسم کے استخارے بالعموم معبّروں یا کاہنوں سے کئے جاتے تھے جن کی نسبت اُن کا عقیدہ تھا کہ دیوتاؤں کے

محبوب ہوتے ہیں اور آیندہ کے حالات بتا سکتے ہیں۔ پس تمام اہم معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا اور اسی طرح مصیبتوں کے وقت بھی اُن کی امداد ضروری ہوتی کہ خرابیوں کے اسباب اور پھر چارۂ کار بتلائیں۔ لیکن ایشیائی علمائے مذہب کے مقابلے میں دیکھا جائے تو یہ لوگ کچھ زیادہ بااثر نہ تھے۔ انھیں ناراض دیوتاؤں کا منانے والا اور ایک عمدہ صلاح کار ضرور سمجھا جاتا تھا مگر ان کی پیش گوئی کی بعض اوقات کوئی پروا نہ کرتا اور جب کبھی اُن کے مکاشفے خاطر خواہ نہ نکلتے تو انھیں اہل حکومت کا معتوب بننا پڑتا تھا۔

اس عہد کے عقاید دراصل اُسی نظام کی ابتدائی شکل ہیں جو بعد میں یونانیوں کا قومی مذہب بنا مگر چونکہ یہ عقیدے مختلف ذریعوں سے اُن میں پھیلے تھے اس لئے اہل ہند یا مصریوں کے مذہب کی طرح اس کا کوئی مابہ الامتیاز قایم کرنا محال ہے۔ درحقیقت یونانیوں کے دین نے کبھی ایک مکمل نظام کی صورت ہی اختیار نہ کی تھی اور اس میں برابر متضاد عقیدے گھُسے رہے تھے۔ بہرحال، آسمانوں کی نسبت ان کا خیال تھا (اور شاید آسمان وہ کوہِ اولمپس کی سب سے اونچی چوٹی کو سمجھتے تھے!) کہ زمین کی مثل، جانداروں سے آباد ہیں۔ ان ہستیوں کو صورت و سیرت میں وہ آدمی سے مشابہ جانتے تھے مگر فرق یہ تھا کہ وہ زیادہ طاقتور غیر فانی اور غیر مرئی ہستیاں تھیں اور دنیاوی معاملات میں اُنھیں پورا زور و اختیار حاصل تھا۔ اس طرح، زمانہ شجاعت کے لوگ ایک معنی کر اس مذہب کے پابند تھے جسے جدید اصطلاح میں این تھراپا مورفزم یعنی انسانی شکل خداؤں کی پرستش، کہا جائیگا، لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ ہم بعض اوقات ان دیوتاؤں کا ذکر اس طور پر پاتے ہیں کہ گویا وہ مظاہر فطرت یا مختلف قوتوں کے نام ہیں؛ مثلاً زئیس جو ایک طرف سارے دیوتاؤں کا بادشاہ ہے کرۂ ہوائی کا حاکم بھی بیان کیا گیا ہے؛ یہی نسبت اپالو کو سورج کے ساتھ اور پواسی ڈن کو سمندر سے ہے اور جنگلوں، پہاڑیوں، وادیوں اور کنوؤں میں بھی مانا جاتا تھا کہ آسمانی ہستیاں رہتی ہیں جنھیں نمف (یعنی پریاں) کہتے تھے

بادشاہ کی قربانیوں کا ذکر آچکا ہے یہ ساری قوم کی جانب سے ہوتیں مگر ہر بزرگ خاندان اپنے گھرانے کی طرف سے علیٰحدہ یہی رسم ادا کرتا تھا۔ دیوتاؤں کی عام نیاز کی شکل یہ ہوتی کہ تھوڑا سا گوشت اور شراب آگ میں ڈال دیتے۔ یہ گویا دیوتا کا صدقہ یا نذرانہ تھا۔ اور باقی گوشت اور شراب اپنی ضیافت و خوش دلی میں کام آتا۔ اسی پر منحصر نہیں خاص خاص تہوار کے دنوں کا بھی یہی رنگ ہوتا تھا کہ ہر طرف اکل و شرب کے جلسے جمتے، لطف و زندہ دلی کی صحبتیں گرم ہوتیں، کہیں مردانہ کھیلوں کی نمایشیں قایم کی جاتیں اور کہیں لوگ بھاٹوں کا گانا اور اپنے بزرگوں کے کارنامے بیٹھ کے سنتے۔ باایں ہمہ زمانۂ شجاعت کے یونانیوں میں ایسے موقعوں پر کبھی وہ وحشیانہ بدمستیاں نظر نہ آتی تھیں جو اہل ایشیا کے مذہبی تہواروں کی عام خصوصیت ہیں۔

" ایشیائی ممالک کی مثل جہاں عورت بھی ایک قسم کی مِلک تصور ہوتی ہے، یونانی شادیاں محض خرید و فروخت نہ تھیں بلکہ دولہا اور دُلھن والوں دونوں کی طرف سے بعض تحائف دیے جاتے تھے جن سے ایک حد تک شوہر و زوجہ کی برابری مترشح ہے اور ہر چند ابھی کثرت ازدواج کی وبا سے یہ مُلک پاک نہ ہوا تھا، پھر بھی منکوحہ بیوی کا خاندان میں خاصا اعزاز و اثر تھا" جس کی ہومر کے ہاں بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

مہمان کی وہی خاطریں ہوتیں جیسی کسی رشتہ دار کی۔ اور اُس بدامنی اور دشوار آمد و رفت کے زمانے میں یہ خیال کہ مہمان دیوتاؤں کا بھیجا ہوا ہوتا ہے، واقعی قدیم زندگی کا نہایت خوشگوار پہلو دکھاتا ہے۔ پھر رسم مہمان نوازی کو غالباً زیادہ تقویت اس عقیدے سے پہنچتی تھی کہ کبھی کبھی خود دیوتا مہمان کے بھیس میں فانی انسان کو آزمانے نازل ہوتے ہیں پس ہر شخص خوف کھاتا تھا کہ مبادا ناخواندہ مہمان کے بجائے کسی دیوتا کی شان میں اس سے کوئی گستاخی سرزد ہو جائے۔ یہی مہمان نوازی دُور دُور کے لوگوں میں رشتۂ محبت قایم کر دیتی تھی جو عام اتحاد قومی کا ایک بالواسطہ ذریعہ ہے۔

یونانیوں میں ذات بندی نہ تھی لیکن دورِ جاہلیت کا سب سے شرمناک آئین، غلامی موجود تھا۔ اور اسیرانِ جنگ یا مفتوحین کی شرطِ جاں بخشی یہی تھی کہ وہ فاتحین کا مال ہو جائیں۔ غلامی کی دوسری صورت بچّوں کا چُرائے جانا اور دُور دراز ملکوں میں بیچ دینا تھی اور یہ دونوں (خصوصاً پہلا) ایسے وسایلِ فراہمی تھے جن کا منقطع ہونا کسی طرح ممکن نظر نہ آتا تھا، غلام بننے کے بعد آدمی اپنے تمام حقوق سے محروم ہو جاتا اور اپنی عقل و منشا کے مطابق کوئی کام نہ کر سکتا تھا جو یقیناً انسانیت کی بدترین ذِلّت و توہین ہے۔

شاعری کی عام قدر تھی اور اس قرنِ وحشت و قتال میں بھی حلقے بنا کے شاعر کی نظمیں بیلے کے ساتھ سننا بڑا مشغلہ مسرت سمجھا جاتا تھا۔ اور اُسی زمانے میں ہم بعض جلسوں کا حال پڑھتے ہیں جہاں مناجات خواں یا قومی مطربوں کے مقابلے ہوتے تھے اور غالباً اُن دستوروں کی بنیاد پڑتی تھی جو بعد میں اُن کے آدابِ مجلس قرار پائے۔

فنون و صنّاعی کی ہنوز ابتدا تھی لیکن حُسن و صنعت کا وہ شوق و میلان جس کی شاعروں کے کلام سے تصدیق اور سیّاحوں کے عجیب و غریب افسانوں میں جھلک پائی جاتی ہے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ دورِ قدیم کی سب سے ہُنرمند اور جدّت پسند نسل کا پہلا باب ہمارے سامنے ہے۔

اواخر زمانہ شجاعت کے نمایاں حالات یہ ہیں جو بہ اختصار اوپر بیان ہوئے۔ اس کے رہنے والے ایک جاندار قوم تھے۔ ان کے رسم و رواج سادہ، ان کا مزاج جنگ جویانہ اور ان کا مُلک بہ اعتبار موسم ایک معتدل خطّہ تھا۔ وہ سب ملکی معاملات میں حصہ لیتے تھے، وہ سب آزاد تھے اور کسی قدر فرق مراتب ہونے کے باوجود باہم وابستہ۔ اور ان سب کی تعلیم و تربیت بھی قریب قریب ایک سی ہوتی تھی۔ مُلک کی محدود آبادی ہونے سے اور غلاموں کی ملکیت کی وجہ سے وہ اور بھی بے فکری اور زندہ دلی کی زندگی گزارتے تھے سخت کام بیشتر غلاموں کے سپرد تھا۔ وہ اپنا خالی وقت فنون جنگ کی مشق، کسرت، کُشتی یا سیر و شکار میں صرف کرتے اور اس طرح اپنے جسموں کو سدھاتے اور قوّتوں کو بڑھاتے

تھے۔ اُن کے قوائے ذہنی کو شعائرِ مذہبی اور اُن کے کاہن قوتِ متخیلہ کے استعمال پر مائل کرتے، اور اُمراسے بے تکلّف میل جول، ملکی معاملات میں بحث و مشاورت، اور جنگی مہمات، ان قوتوں کو جِلا دیتی تھیں۔ سب سے بڑھ کر اُن کے بھاٹوں کے گیت اور منظوم افسانے تھے، اور وہ دل کھینچنے والی شے، موسیقی، جو اُن کے جذبات کو بناتی اور ذوق کو نکھارتی تھی۔

لیکن اپنے چمکیلے آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر کی زندگی تھی جو یونانی کو مرغوب تھی۔ حیاتِ مابعد سے اُس کی طبیعت کسی طرح رنگِ آشتی نہ پکڑتی تھی۔ خواہ وہاں اُسے ہزار اعزاز اور اکی لیز کی مانند "تمام مُردوں کے اوپر" بادشاہت ہی کیوں نہ مل جائے، وہ جان کو عزیز رکھتا تھا اور از رہِ نمود اُسے بے ضرورت تلف نہ ہونے دیتا تھا۔ اُسے ایک قوی تر دشمن کے سامنے بھاگ نکلنے میں کچھ عار نہ تھا اور چالاکی یا قوّتِ بازو کی طرح گریز پائی بھی اُس کے ہاں شجاعت اور فنِ حرب میں داخل تھی۔

باب سوم

ڈورین قوم کی ہجرت اور تسلّط پیلوپنی سس میں

(تخمیناً سنہ ۱۱۰۰ تا سنہ ۵۰۰ قبل مسیح)

یونانی قوم کے ابتدا سے دو ممتاز حصّے مانے گئے ہیں: ایک ڈورین جن کے سرگروہ اہل اسپارٹہ ہوئے اور دوسرا آئی اونین جس کی نمایندگی اہل ایتھنز نے کی۔ بلکہ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سارے یونان کی تاریخ انھی دو شہروں کی تاریخ نظر آئے گی۔ حالانکہ وسعت و آبادی یا عالمگیر تجارت کا مرکز ہونے کے لحاظ سے اُن میں سے ایک کو بھی وہ بڑائی نصیب نہ تھی جو فی المثل بابل و نینوا یا بعد میں رومۃ الکبریٰ کو حاصل ہوئی۔ باہمہ انسانی تاریخ کا یہ ایک نادر واقعہ ہے کہ ان یونان کے حقیر شہروں کا دُنیا کی تہذیب و ترقّی پر جو اثر پڑا وہ بڑی بڑی قومیں بھی نہ ڈال سکیں۔ اس میں بھی ایتھنز کو اور اس کی وجہ سے آئی اونی گروہ کو اپنے دوسرے حریف پر فوقیت ہے۔ مگر یونان کی تاریخ میں پہلے ڈورین گروہ کی حکومت و تمدّن کا ذکر آتا ہے اور اس واسطے ہم بھی اس کو مقدّم رکھیں[1] گے۔

یہ سوال کہ ڈورین لوگ یونان میں کب اور کیونکر آئے اور اس سے پہلے اُن کی کیا حالت تھی، بہت مشکل سوال ہے اور اس کا جواب دینا زیادہ ضروری بھی نہیں کیونکہ ڈورین قوم کو تاریخی اہمیت اُس وقت حاصل ہوئی جبکہ انھوں نے خاکنائے کورنتھ کو پار کیا اور

[1] ڈورین لوگوں کے یہ ابتدائی حالات پانچویں صدی قبل مسیح تک اس لئے علٰحدہ لکھے جاتے ہیں کہ اس وقت وہ آئی اونی گروہ سے مُتمیّز اور جداگانہ قوم تھی مگر پانچویں صدی کے قریب ان کا یہ فرق اتنا خفیف اور کم اہم رہ جاتا ہے کہ پھر اس تفریق کی اہل تاریخ کے نزدیک کچھ ضرورت نہیں رہتی ۱۲

پیلوپنی سس میں آن کر آباد ہوئے۔[1] ورنہ اس سے پہلے وہ تھسلی کے جنوبی پہاڑوں کی ایک مبتذل قوم تھی۔ پھر بھی یہ معلوم کرنا ہمارے شوق تجسّس کے لئے تشفّی بخش ہوگا کہ یونانیوں کا (جن میں ڈورئین گروہ بھی شامل ہے) مقدونیہ تک سُراغ چلتا ہے کہ ابتدا میں وہ یہاں آباد تھے اور الّیروی قوم نے اُنھیں تھسلی اور پھر اور بھی جنوب میں دھکیل دیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے یہ الّیروی سیلاب اس شدّومد کے ساتھ تھسلی میں نہ آیا بلکہ جانب مغرب پھیل گیا، چنانچہ گیارھویں صدی قبل مسیح کے قریب ہم اُس کا زور صرف مقدونیہ اور اپی رس کے شمال میں پاتے ہیں، اس طرح مقدونیہ تو گویا بالکل الّیروی اور غیر یونانی ملک ہوگیا تھا لیکن تھسلی نے بعد میں حالت اصلی پر عود کیا اور تین چار صدی میں وہ الّیروی اثرات سے قریب قریب پاک ہوکر پھر "یونانی" علاقہ شمار ہونے لگی، بہرحال بارھویں صدی میں الّیروی وحشیوں کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ ہیل لینز قوم کا عقبی گروہ ڈورئین بھی شمالی یونان میں چین سے نہ بیٹھ سکا اور پیلوپنی سس میں ہجرت کر آنے پر مجبور رہوا۔ اور آہستہ آہستہ اس جزیرہ نما پر پھیلنے لگا، البتہ آئی اونی گروہ کی طرح جو اُس سے پہلے ان علاقوں میں جگہ جگہ آبسا تھا، ڈورئین لوگوں نے قدیم باشندوں سے خلط ملط ہونا پسند نہ کیا اور شاید اپنی کثرت تعداد کے سبب وہ اس ضرورت سے تھے بھی مستغنی۔ نیز قومی غرور اور ان کے طبعی حجاب نے انھیں ایسے اختلاط سے باز رکھا اور جس جگہ وہ جم کر بسے وہاں اپنی زبان و معاشرت اور دیگر خصوصیات کو انھوں نے ایسی مضبوطی سے قایم کیا کہ تھوڑے ہی دن میں سارا ملک ڈورئین ہوگیا۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آنے والوں کی

---

[1] مشہور مورخ یونان کرٹیس لکھتا ہے کہ ڈورئین قوم کی پیلوپنی سس میں آمد گویا پہاڑی لوگوں کا تاریخ میں پہلا داخلہ ہے۔ صدیوں سے یہ کوہستانی تہذیب و تمدّن میں پیچھے پڑے ہوئے تھے اور ہر جگہ ساحلی قوموں کا عروج تھا۔ لیکن اب ان کے دن پھرے: وہ پہاڑوں سے اُترے اور اپنی فطری قوت و برتری کے باعث سب پر غالب آگئے اور انھوں نے اپنی فاتحانہ آمد میں جو انقلاب اور تبدیلیاں پیدا کیں وہ ایسی محکم بنیادوں پر مبنی تھیں کہ جب تک قدیم یونانی رہے ان کا اثر موجود رہا۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے مورخ بھی "زمانۂ شجاعت" کو ایک علحدہ شے سمجھتے ہیں اور ڈورئین قوم کے کارناموں سے اپنی تاریخوں کا آغاز کرتے ہیں ۱۲

حیثیت ہر مقام پر فاتحانہ رہی اور یہ کہکر بھی انھوں نے قدیم باشندوں پر اپنا اثر ڈالا کہ ہم ہرقلیس کی مظلوم و محروم وراثت اولاد کے حامی ہیں اور انھیں کو سلطنت دلانے پیلوپنی سس آئے ہیں۔ چنانچہ اُن کے فرمانروا اولادِ ہرقلیس میں ہونے کے مدّعی تھے اور ابتدا میں اسی شاہی خاندان کی تین بڑی شاخیں شہر آرگس، اسپارٹہ (یا لیسی ڈمون) اور میسینیہ میں قایم ہوئی تھیں۔

ڈورین بادشاہوں کے ہرقلی ہونے کا مذکورہ دعویٰ صحیح ہو یا غلط یہ ظاہر ہے کہ دلائل سے سلطنتیں ہاتھ نہیں آیا کرتیں۔ ڈورین گروہ بھی قوتِ بازو سے برسرِ اقتدار ہوا تھا اور یہاں کے قدیم اکائی باشندے اُن سے مقابلے میں عہدہ برآ نہ ہو سکے تھے۔ پس یا تو وہ مفتوح بن گئے اور یا اٹھ اٹھ کے ایشیائے کوچک (اور خصوصاً جزیرہ لس بوس) میں جا بسے اور یہاں وہ بستیاں بسائیں جو بعد میں یولین نوآبادیاں کہلاتی تھیں، مگر انھیں یہ راہ درحقیقت آئی اونی تارکانِ وطن نے دکھائی تھی جو بڑی بڑی جماعتوں میں پیلوپنی سس اور ایٹی کا سے ایشیائے کوچک میں آ گئے تھے اور وہاں ملی ٹس، ایفی سس وغیرہ بہت سے شہر آباد کیے جنھیں ملا کر اس تمام ساحلی علاقے کو آئی اونیہ بھی کہتے تھے۔ ان آبادکاروں کا ایتھنز سے خاص تعلق تھا اور وہ ایٹی کا کو اپنے آئی اونی گروہ کا وطن تصور کرتے تھے۔

ان دونوں کی دیکھا دیکھی اور ایشیائی ملکوں کی عمدہ آب و ہوا اور پیداوار کا حال سُن کر بہت سے ڈورینوں کو بھی باہر جانے کا شوق ہوا اور انھوں نے ایشیائے کوچک کے جنوبی ساحلوں اور جزیروں میں اپنی ڈوری نوآبادیاں الگ بنائیں جن میں سب سے زیادہ جزیرہ روڈس مشہور تھا۔ اس طرح آنے والوں کے داخلے نے اگر ہومر کے ممدوح اکائیوں کا تختہ اُلٹ دیا تو دوسری طرف ایشیائے کوچک میں بہت سے یونانی شہروں کی بنیاد بھی اسی سے پڑی، جو علم و حکمت کی پرورش میں خاص یونانی شہروں کے ہم رُتبہ ثابت ہوئے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ آبادی کے یہ انقلاب اور مہاجرت کچھ چند مہینوں یا برسوں

میں صورت پذیر نہ ہوگئے تھے۔ ان میں ضرور صدیاں صرف ہوئی ہونگی اور یہ چھوٹے ٹوعصہ دراز کے بعد جاکر کسی ایک حالت پر قایم ہوئے ہوں گے۔ اور ہر چند اہل تاریخ نے ڈورئین قوم کی پیلوپنی سس میں آمد کا زمانہ گیارھویں صدی ق م قرار دیا ہے لیکن غالباً اس میں ان کی ابتدائی یورشیں نظر انداز کر دی گئی ہیں، اور اس کی صحت پر زیادہ اصرار نہیں کیا جاسکتا۔

اس کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہو کہ خاص تاریخی زمانے میں ہم ڈورئین عنصر کو شمال پیلوپنی سس میں قوی اور جنوب میں ضعیف پاتے ہیں۔ گویا نئے لوگ آتے اور پہلوں کے ساتھ مل کر کچھ یہاں رہ جاتے اور کچھ آگے بڑھ جاتے تھے۔ اس طرح آگے چل کر ان کی تعداد کمزور ہوتی جاتی تھی اور یہی سبب ہو کہ مغربی جزیرہ نما میں ڈورئین گروہ اپنا اثر نہ بڑھا سکا اور اکائیہ کے ضلع میں اخیر تک قدیم نسل و معاشرت باقی رہی۔

وسط پیلوپنی سس میں ارکیڈیہ کا پہاڑی علاقہ تھا اور ڈورئین قوم اسے بھی مغلوب نہ کر سکی تھی۔ ہم آگے پڑھیں گے کہ کس طرح اسپارٹہ کو ارکیڈیوں کے مقابلے میں ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا، پس یہ ضلع بھی مدّتوں اپنی قدیم روش پر چلے گیا اور اس میں اتنی کم تبدیلیاں ہوئی تھیں کہ ارکیڈی لفظ کے معنی ہی یوناں میں "قدامت پسند" یا دہقانی کے ہو گئے تھے۔

تیسرا ٹکڑا جہاں ڈورئین حکومت نہ پہنچ سکی ایے لس تھا۔ مگر اس میں قدیم باشندوں کو ایک اور شمالی قوم نے مغلوب کر لیا تھا جو اطولیہ سے آئی تھی اور ہیل لینز قوم کی ایک تیسری شاخ مانی جاتی ہے، مگر باقی حصہ ملک کے مالک ڈورئین تھے اور انھیں کی آمد اور تسلّط سے جس کے بعد منظوم افسانوں کے بجائے اصلی تاریخ شروع ہوتی ہو۔

اُن کی شہری حکومتیں | اب ڈورئین فتحمندوں نے جابجا اپنی بستیاں اور حکومتیں تیار کیں۔ اور چونکہ ملک نہایت دشوار گزار اور پہاڑوں کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کٹا ہوا تھا لہذا بالعموم ہر حکومت کا دائرہ اثر محدود اور اکثر اوقات محض اتنے رقبوں پر ہوتا تھا جتنا کہ ہمارے زمانے میں بعض "بلدیات" (یعنی میونسپل کمیٹیوں) کا ہوا کرتا ہو اور یونان

کی یہی شانِ کثرت الملوک تھی جس نے اخیر تک اُن میں کوئی مرکزی اور ملکی سلطنتِ واحد قایم نہ ہونے دی۔

فوجیں اور مجالس "ملکی" یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں اس لایق نہ تھیں کہ اُن میں لڑنے والوں کی ایک جماعت (یعنی فوج) علیحدہ مخصوص کر دی جاتی جیسا کہ ہمارے زمانے میں دستور ہے۔ بلکہ انھیں جب کبھی لڑائی پیش آتی تو ہر قابلِ جنگ شخص سپاہی کا کام دیتا اور وطن کے لئے لڑنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔ چھوٹے ہونے کی وجہ سے اُنھیں یہ آسانی بھی حاصل تھی کہ قومی معاملات میں غور و خوض کرنے کی غرض سے ان کی ساری مرد آبادی ایک جگہ جمع ہو سکتی تھی۔ اس زمانے میں جبکہ بڑے بڑے ملکوں میں ایک قومی حکومت ہوتی ہے یہ بات ممکن نہیں اور مثال کے طور پر اگر اہلِ انگلستان اپنے قومی معاملات میں مشورے کے واسطے اکھٹے ہونا چاہیں تو سب ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے نیابتی حکومت کا طریقہ رائج ہوا ہے کہ بہت سے آدمی اپنا ایک معتمد علیہ انتخاب کر لیتے ہیں اور وہ ان کی طرف سے امورِ ملکی میں نیابت کرتا ہے۔ یونانی ریاستیں اس ضرورت سے مستغنی تھیں اور اسی لئے اُن کی بلا واسطہ جمہوریت کو ہم اصالتی حکومتِ قومی کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

عقاید مذہبی ماقبل تاریخ عہد کے اوہام و بت پرستی کا پچھلے باب میں ذکر آچکا ہے۔ یہاں اُنھیں کا اعادہ کرنا پڑے گا کہ ڈورئین حملہ آوروں کا قریب قریب وہی مذہب تھا جو ان کے پیش رو اہلِ شجاعت کا، وہ ایسے دیوی دیوتاؤں کو مجسم بنا کے پوجتے جو دراصل مظاہر فطرت تھے۔ انھیں غیر فانی اور ہر کام کے کرنے پر قادر سمجھا جاتا، عجیب عجیب کارنامے اُن سے منسوب ہوتے اور انھیں آدمی کی شکل بنا کے پُوجا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مورتیں قد و قامت اور حسن و جمال کے اعتبار سے غیر معمولی ہوتیں، لیکن یونانیوں نے قدیم اہلِ مصر کی طرح کبھی جانوروں کی پرستش نہیں کی اور نہ اپنے بُت ایسے خوفناک صورتوں کے بنائے جیسے کہ ہندوؤں کے ہاں نظر آتے ہیں۔ دیوتاؤں کے بعد دوسرا درجہ سورماؤں کا تھا۔ قدیم یونانی یا ڈورئین لوگوں میں یہ

ایسے عام معنوں میں استعمال نہ ہوتا تھا جیسا کہ اب ہونے لگا ہی یا جیسے ہومر نے ہر دلیر آدمی پراس کا اطلاق کر دیا ہی۔ اُن کے خیال میں یہ سورما ایک ایسی نسل کے افراد تھے جو آدمی سے پہلے دنیا میں آباد تھی اور ایسے ایسے کام کرسکتی تھی کہ وہ اب انسان کی طاقت سے باہر ہیں۔ سورماؤں کی اس تعریف یا تصور نے اُن کے قصوں میں عجیب رنگینی اور پروازِ تخیل کی گنجائش پیدا کر دی تھی اور چونکہ ابدالوں کی مثل، اکثر مقامات کے محافظ سُورما یا دیوی دیوتا الگ الگ تھے لہٰذا ہر جگہ نئی نئی کہانیاں سُننے میں آتیں جنھیں "متھ" (یعنی خرافات) کہتے اور اب بھی بہت سی کتابیں موجود ہیں جن میں ان کہانیوں کو جمع کیا گیا ہے اور ان کے جُداگانہ علم کو "متھالوجی" یعنی علم خرافات کہیں گے۔ مگر قدیم یونانی ان تمام خرافات کو واقعات سے زیادہ سچا مانتے تھے اور یہی نہیں، بلکہ ہر بستی کی رسم و رواج کو انھیں فوق الانسان ہستیوں سے منسوب کرتے اور ہر بات کی توجیہ اُنھیں کے کسی قصے سے نکالتے۔ مثلاً اگر ایک اسپارٹہ والے سے دریافت کیا جاتا کہ تمہارے شہر میں دو بادشاہ کیوں حکومت کرتے ہیں تو وہ اُس کا یہی جواب دیتا کہ "ارستوڈمس سُورما کے، جو سب سے پہلے اُس مُلک میں اہل اسپارٹہ کو لایا جُڑواں بیٹے ہوئے تھے اور اُسی وقت سے ہمارے ہاں دو بادشاہوں کا مشترک رواج چلا آتا ہے"!

دیوتاؤں کی پرستش دعاؤں (یعنی نماز) اور نذر و نیاز یا قربانی کے ذریعے کی جاتی تھی۔ لیکن زمانہ شجاعت کی نسبت اب یہ فرق نمایاں معلوم ہوتا ہی کہ اس پرستش میں ہر جگہ ہر شخص شریک نہ ہوسکتا تھا۔ قبیلے قبیلے نے اپنی عبادت گاہیں جُدا بنا رکھی تھیں اور ان کے طریقِ عبادت بھی غالباً الگ الگ تھے۔ پس جو شخص اُس قبیلے سے متعلق نہ ہو وہ اُس کی عبادت میں شرکت نہ کرسکتا تھا۔

مذہبی انجمنیں | البتہ اسی زمانے میں ہمیں ایک خاص تحریک تقویت پاتی نظر آتی ہی جو نہ صرف مذہبی بلکہ یونانی ریاستوں کے قومی اتحاد کی سب سے پہلی عملی صورت تھی۔ اس سے کہیں پیشتر کہ

معاہدات امن یا دوستانہ روابط کا دستور ہوا ان کے ہمسایہ قبائل اکثر کسی دیوتا کی پرستش پر متفق ہو جاتے اور ایک قطعۂ زمین کو اس غرض کے لئے مخصوص و مقدّس قرار دے لیتے تھے کہ آپس میں لڑائی کے وقت بھی اس کا احترام کریں گے اور ضرورت ہو تو ہر قسم کی مضرّت یا اہانت سے اُسے مِل کر بچائیں گے، پھر ایسے مقامات میں بالعموم اُن کے مذہبی میلے ہونے لگتے اور متعلقہ قبائل سے لوگ آ آ کر شریک ہوتے اور اپنے اوقاف کی دیکھ بھال میں حصّہ لیتے جس سے رفتہ رفتہ اُن میں مِل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی جو انسانی تمدن کی اصلی بنیاد ہے۔ مبادلہ خیال اور بحث و مشورہ کا زیادہ موقع ملنے سے ضرور ہے کہ ان کی گفتگو بھی مذہبی معالات تک محدود نہ رہی ہو اور وہ اور طرح کی قرار دادیں باہم کرنے لگے ہوں جیسے جنگ میں خاص خاص قواعد کی پابندی کسی مشترک دشمن کے مقابل میں ایک دوسرے کی امداد، وغیرہ الغرض یہی میلان تھا جس نے کچھ عرصے کے بعد دو یا زیادہ بستیوں میں باہمی تعلقات کو مزید قوّت بخشی اور وہ آپس میں حلیف بننے لگیں یعنی اُن میں ہمیشہ امن و صلح کے ساتھ رہنے کا عہد ہوا۔ جس کی عام صورت یہ ہوتی تھی کہ دونوں فریق اپنے متفق علیہ معبود یا دیوتا کے سامنے کھڑے ہو کر قسم کھاتے کہ جو اقرار کئے ہیں اُن سے کبھی انحراف نہ کریں گے

قدیم یونانی ریاستوں کے مابین سیاسی اتحاد کی یہ ابتدا تھی[1] اور ایسے اتحاد میں کسی ریاست کو اوروں پر کچھ نہ کچھ فوقیت حاصل ہوتی تو وہی اُس اتحاد کی سربرآوردہ یا سرگردہ ریاست کہلاتی تھی۔

ڈیلفی کی انجمن | اسی قسم کی ایک مشہور مذہبی انجمن بہت قدیم سے وسطِ یونان (علاقۂ فوکیس) میں قایم ہوئی تھی اور اس کائی نس خطیب کے بقول، اس میں تیرہ قبیلے یا گروہ شریک تھے۔

---

[1] اپنے سیاسی اتحاد کی اسی مذہبی نوعیت کو خیال میں رکھکر، بعد میں بھی اہلِ یونان کا دستور رہا کہ جب کبھی اتحاد قایم کرتے تو اسی طرح دیوتاؤں کے سامنے حلف لیتے تھے۔ اور ایک مذہبی تہوار مقرر کر لیتے کہ اس دن سب حلیف مل کر نذر و نیاز چڑھائیں اور اپنے اتحادوں کی رسم قدیم کو تازہ کریں ۱۲۔

ہر موسم بہار میں وہ اپالو دیوتا کی پوجا کو جمع ہوتے جس کا عظیم مندر شہر ڈیلفی کی پہاڑیوں پر واقع تھا، اُن کا دوسرا جلسہ خزاں کی فصل میں پچیس۲۵ میل اوپر قصبہ انتھی لا میں منعقد ہوتا جہاں ڈمی ٹر دیوی کا بُت خانہ تھا، مگر انجمن کا نام ڈیلفی ہی کے نام پر "ڈیلفک امفک ٹیونی" یعنی ڈیلفی کی انجمن ہمسائیگان رکھا گیا تھا اور اس کی انتظامی جماعت میں ہر گروہ کے دو دو وکیل شریک ہوتے تھے کہ مندر کی دیکھ بھال اور جاترا کا انتظام رکھیں دنیوی معاملات میں اس انجمن یا اُس کی انتظامی جماعت کو کچھ دخل نہ تھا اور اس کے شریک قبائل اکثر باہم لڑائیاں لڑتے، پھر بھی آپس کے میل جول سے اتنا فائدہ ہوا کہ وہ دو باتوں کے پابند ہو گئے: اول یہ کہ لڑائی میں غلبہ پانے کے بعد بھی شرکائے انجمن میں سے کسی قبیلے کی بستی برباد نہ کی جائے گی اور دوسرے یہ کہ بہتا پانی توڑ کر کسی محصور شہر کو پیاسا نہ مارا جائے گا، اس کے علاوہ تیسری شے جس میں وہ سب متفق ہو جاتے، مندر کی حفاظت اور حمایت تھی اور جب کبھی ایسی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے متحد ہو کر اس کا تدارک کیا۔

اس موقع پر یہ لکھنا بھی فائدہ سے خالی نہ ہو گا کہ ڈیلفی کی امفک ٹیونی یا مجلس ہمسائیگان ڈورئین قوم کے پیلوپنی سس میں اقتدار پانے سے پہلے قائم ہو چکی تھی اور اسی لئے اُن کے بھی تھسلی یا بیوشیہ والوں کی طرح صرف دو نائب اس کی انتظامی جماعت میں شریک تھے۔

ڈیلفی کے مکاشفے یا کہن لیکن اس جاترا کے زمانے میں اب ایک ایسی رسم (استکھان) کا آغاز ہوا کہ جس نے ڈیلفی اور اس کے مندر کو یونان اور غیر یونان دُور دُور مشہور کر دیا۔ فال نکلوانے یا مستقبل کے حالات دریافت کرنے کا دستور بجائے خود کچھ نیا نہ تھا بلکہ دورِ سلف میں علمائے مذہب کی بڑی فضیلت ہی کہانت اور معبّری سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ڈیلفی کے عیّار پجاریوں نے اس کا بڑا ڈھونگ بنایا تھا اور بہت سی مُرلیاں[۱] اسی کام کے

[۱] یہ مُرلیاں (جنھیں اپالو کے دوسرے نام پیتھیا پر پیتھی بھی کہہ سکتے ہیں) اوّل اوّل جوان کنواریاں ہوتی تھیں

لئے مخصوص کردی گئی تھیں کہ سایلوں کو اپالو دیوتا کی طرف سے الہامی مشورے پہنچائیں۔ اُنھیں علیحدہ کمرے میں تپائی پر بٹھا کر بخورات کی دھونی دی جاتی تھی اور ایک غشی سی اُن پر طاری ہوتی تو یہ گویا اپالو دیوتا کا اُن کے سر پر آنا تھا۔ اس حال میں جو الفاظ اُن کی زبان سے نکلتے وہ "اوریکل" (یعنی مکاشفہ یا ازغیبی جواب) کہلاتے اور آسمانی وحی کی طرح مانے جاتے تھے۔ بڑی چالاکی اس میں یہ تھی کہ یہاں کے پجاری باعموم لوگوں کے حالات سے خوب واقف ہو جاتے تھے اور اس لئے اُن کی سکھائی پڑھائی مُرلیاں اکثر نہایت عمدہ اور مناسب وقت جواب دیتیں؛ اگر کسی معاملے میں ایسی واقفیت کا موقع نہیں ملا، یا سوال آیندہ کے متعلق ہوا تو اس صورت میں جواب بھی اکثر مہمل اور مبہم الفاظ میں ہوتے کہ اس میں جو چاہے معنی پیدا کر لو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ منجانب اللہ ہونے کی وجہ سے ان کے دروغ و راستی کی کوئی ذمہ داری نہ کہنے والی مرلی پر تھی نہ ڈیلفی کے شعبدہ باز پجاریوں پر۔

اس میں کلام نہیں کہ اوّل اوّل اس رواج نے یونانیوں کو فائدہ پہنچایا اور پجاریوں نے دیوتا کے نام سے اُنھیں عمدہ اخلاق اور عدل و انصاف کی بھی تعلیم دی نیز اُن میں قومیت کی روح پھونکی اور سکھایا کہ منتشر ہونے کے باوجود وہ سب ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی فطری قانون کے ماتحت ہیں؛ لیکن ان تمام فوائد کے باوجود ان تمام کارروائیوں کی بنیاد فریب پر تھی اور ایک بُرائی ہمیشہ دوسری بُرائی کا راستہ دکھاتی ہے؛ چنانچہ جس وقت ڈیلفائی نبیّہ کے الفاظ کا لوگوں میں زیادہ اثر ہونے لگا تو اہل غرض کو بھی اُس سے دوسری طرح فائدہ اُٹھانے کا خیال آیا اور انھوں نے اپنے موافق منشا کہن حاصل کرنے کے لئے رشوتیں پیش کرنی شروع کیں اور اس طرح اگرچہ

لیکن اس میں بعض خرابیاں پیدا ہونے کے باعث بعد میں ایسی عورتیں مقرر کی جانے لگیں جو اگرچہ ناکتخدا مگر پچاس سال سے متجاوز ہوں ۱۲

عوام الناس عرصہ دراز تک اپنے عقیدے پر جمے رہے لیکن اعلیٰ طبقے میں ان الہامی جوابوں کی جلد قلعی کھل گئی۔ خاص کر ایرانی لڑائیوں میں یہاں کے وطن فروش پجاریوں نے اہلِ یونان کو جس جس طرح ہراساں کیا اور حملہ آور دشمن سے رشوتیں لے کر اُن کے موافق مطلب پیشین گوئیاں کیں، اُس نے ڈیلفی کا وہ اثر خاک میں ملا دیا جو تھوڑے عرصے سے ملکی معاملات میں بھی اُسے حاصل ہو چلا تھا۔

لیکن اب ہم عالمِ مذہبی سے لوٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ڈورئین فتحمندوں نے اُن قدیم باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جو اپنے دلیر تر ہم قوموں کی مثل ممالک غیر میں نہ جا سکے تھے اور وطن ہی میں محکومی کی ذلیل زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اسی ضمن میں ہم اُن کے اور آئین و قوانین اور ترقیوں پر بھی نظر ڈالیں گے۔

(۲) اسپارٹہ

ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ ڈورئین گروہ کی تین بڑی شاخیں ارگس، میسینیہ اور اسپارٹہ میں بٹ گئی تھیں۔ ملکی خصوصیت کے موافق ان کی جابجا شہری حکومتیں اور بھی تھیں لیکن اسپارٹہ کو ان سب میں فوقیت حاصل ہے کہ نہ صرف ڈورئین بلکہ یونانی تاریخ میں اُسے جو مرتبہ ملا وہ کسی کو بھی نہ مل سکا۔ پس ہم اسی کے حالات سے شروع کرتے ہیں کہ جب ڈورئین لوگ اسپارٹہ میں گھسے اور یورٹاس ندی کے کنارے قصبہ لیسی ڈموں یا اسپارٹہ کو انھوں نے اپنا مرکز قرار دیا تو اُن کی حالت بالکل ایک فوج کی سی تھی جس نے غنیم کے ملک میں پڑاؤ ڈال دیا ہو۔ اُن کے چاروں طرف قدیم اکائی آبادی پھیلی ہوئی تھی اور ایک ایک چراگاہ کے لئے اس سے لڑنا پڑتا تھا۔ بایں ہمہ وہ رفتہ رفتہ اپنی مقبوضہ زمین بڑھاتے رہے اور آخر مغرب میں کوہِ ٹے گی ٹاس اور جنوب میں ساحلِ سمندر تک کا علاقہ اُن کا ہو گیا اور اسی زمانے سے اس سرزمین کے اصلی مالک بن کر یہی ڈورئین نو وارد

اہلِ اسپارٹہ یا لیسی ڈیمونی کہلانے لگے، مگر یہاں کے قدیم باشندوں کو انھوں نے زبردستی جلاوطن نہ کیا نہ کسی قتلِ عام کے ذریعے خدا کی زمین بدنصیب مفتوحین سے خالی کرائی کہ یہ سعادت انسان کی تاریخ میں یورپین آبادکاروں یا ہسپانیہ کے عیسائیوں کے سوائے غالباً کسی قوم کے حصے میں نہ آئی تھی۔ البتہ انھوں نے اچھی اچھی زمینیں چھین لیں اور قدیم اکائیوں کو حکومت و آزادی سے محروم کر دیا کہ یہ مغلوب ہونے کی معمولی سزا ہے اور ع

حق ہے غالب کا کہ کچلے اور دَلے مغلوب کو

"پے ری اوی کی" اور "ہیلواٹ"

مفتوحین کا یہ گروہ جن کی کچھ نہ کچھ "حقیتیں" باقی رہ گئی تھیں پیری آوئیکی کہلاتا تھا اور گو انھیں ملکی معاملات میں کوئی دخل نہ تھا مگر اسپارٹہ کی لڑائی لڑنے کے لئے اُن میں سے کچھ سپاہی بھرتی کر لئے جاتے تھے۔ قانونی سلوک بھی ان کے ساتھ کچھ زیادہ بُرا نہ تھا اور نہ انھیں حقوقِ ملکیت سے محروم کیا گیا تھا۔ بایں ہمہ حاکم و محکوم کا امتیاز بالکل نہ مٹ گیا تھا اور کالے گورے کا فرق موجود نہ سہی مغرور ڈورین انھیں اپنے میل جول شادی بیاہ کے لایق نہ سمجھتے اور بہ حیثیت مجموعی ایک ذلیل اور ادنیٰ درجے کی قوم جانتے تھے۔ ان سے کہیں بدتر حال قدیم باشندوں کے اُس بدبخت گروہ کا تھا جسے نئے مالکوں نے اپنی خدمت کے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ انھیں ہیلوآٹ کہتے تھے جو غالباً یونانی لفظ ہیلو بہ معنی اسیر کردن سے مشتق ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہیلوآٹ قدیم آبادی کا وہ طبقہ تھا جو عرصۂ دراز تک ڈورین حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا رہا اور مجبور و مغلوب ہونے کے بعد بھی اُن سے اتنی شدید نفرت رکھتا تھا کہ یہ بات مشہور تھی کہ موقع ملے تو ایک ہیلوآٹ خوشی سے ایک اسپارٹی (ڈورین) کو کچّا کھا جائے گا۔

بے شبہ ہر مفتوح قوم کو فاتح سے کینہ اور قدرتی تنفّر ہوتا ہی مگر جس مرتبہ پر ہیلوآٹوں میں یہ جذبہ موجود تھا اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے اور شاید اُن کی تاریخ ہمارے سامنے انسان کی اُس ابتدائی حالتِ قلب کا سماں کھینچتی ہے جبکہ اُس کی فطرتِ صالحہ کسی طرح ذلت و بندگی

سے میل نہیں کھاتی اور اُسے طوقِ غلامی سے اسی قدر وحشت ہوتی ہے جتنی کہ ایک نئے بچھیرے کو گھِسّے سے۔ بہرحال فاتحانِ اسپارٹہ ہمیشہ ہیلواٹوں کے بگڑ بیٹھنے سے اندیشہ مند رہتے تھے اور اپنے نوجوان ہمقوموں کی ٹولیاں ہرسال دیہات میں بھیجتے کہ گھات میں لگے رہیں اور جوان جوان ہیلواٹوں کو جب موقع ملے قتل کر ڈالیں!! اس بنی نوع کے شکار کرنے والے گروہ کا قدیم نام "کرپ ٹیہ" ہے جسے پروفیسر بری خفیہ پولیس کے لفظ سے ترجمہ کرتے ہیں۔ حالانکہ محکمہ مذکور کا مہیب ترین نمونہ اگر ہندوستانی خفیہ پولیس مان لی جائے تو وہ بھی سنِ حجی کے ایسے بیباکانہ اختیارات برتنے کی مجاز نہیں نظر آتی!

مگر ہیلواٹوں کے متعلق بڑی قابل لحاظ بات اور اس امر کا بدیہی ثبوت کہ زیادہ تر محکومی ہی ان کے لئے وجہ اشتعال تھی، یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں غلام نہیں بنائے گئے تھے۔ اُن کا خاص فرض یہ تھا کہ بٹائی کے طرز پر سالانہ پیداوار کی مقررہ مقدار اہل اسپارٹہ کو لا دیا کریں۔ اور اس کاشتکاری کے پیشے کو وہ کسی حال میں نہ چھوڑ سکتے تھے، نہ سکونت بدلنے کے مجاز تھے۔ باقی اور لحاظ سے اُن کی حالت، اگر انصافاً دیکھا جائے تو کچھ ہمارے ہندوستانی کسانوں سے زیادہ بُری نہ تھی اور ایک مصنّف نے لکھا ہے کہ ابتدائی زمانے میں انگریزی قوم کی اور تھوڑے ہی عرصے پیشتر روسیوں کے بڑے حصۂ آبادی کی یہی کیفیت تھی[1] اور دیگر ممالک یورپ میں بھی چند صدی قبل "سرف" اسی درجے کا حیوانِ ناطق ہوتا تھا۔ لیکن ہیلواٹوں کی نفرت انگیزی کے لئے اتنی پابندیاں بھی ناکافی نہ تھیں اور وہ کسی طرح اس حقیقت کو فراموش نہ کرتے تھے کہ ہم بھی چند روز پہلے ایسے ہی آزاد اور شریف قوم تھے جیسے کہ ہمارے نئے آقا۔

قوانین لکرگس | تعلقات کی اس نازکی نے، اسپارٹہ میں ڈورین آبادی کو اخیر تک جنگجو بنائے

---

[1] سی اے فایف جن کی مختصر تاریخ یونان سے اس کتاب کے کئی ابواب کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے ۱۲

رکھا تھا۔ حالانکہ اُن کے اور ہمقوموں کی حالت رفتہ رفتہ بدل رہی تھی اور امن جوئی اور حضریت نے نئے فاتحین کے جذبۂ قتال کو مدھم کر دیا تھا۔ چنانچہ بعض مقامات[۱] پر قدیم باشندوں نے پہلے دولت اور پھر اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کر لی تھی اور یا چند صدی کے باہمی اختلاط نے انھیں ایسا گھُلا مِلا دیا تھا کہ ڈورئین اور اکائی کی قومی تفریق غائب ہو گئی تھی اور بستیاں کی بستیاں ایک ہی مخلوط قوم سے آباد تھیں۔ مگر اسپارٹہ میں اس قسم کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، وہاں کے قدیم باشندے اخیر تک ذلیل و پس ماندہ رہے اور کسی وسیلے سے اپنا گزشتہ تموّل و اقتدار نہ حاصل کر سکے اور گو اُن کے ڈورئین حاکم نسل و خون کے اختلاط[۲] سے نہ بچ سکے ہوں تاہم ان کا قومی امتیاز قایم رہا اور ایک فتحمند فوج کی طرح جو ہر وقت حملہ روکنے اور حملہ کرنے کے لئے تیار رہو ملک پر وہی حاوی رہے اُن کی تعداد قدیم آبادی کے مقابلے میں دسواں حصہ بھی نہ تھی اور اُس کی دلی خصومت کا بھی اُن کو اندازہ تھا کہ ڈھیل ملتے ہی وہ ڈورئین گروہ کو تباہ و برباد کئے بغیر نہ چھوڑیگی پس نہ صرف حکمرانی بلکہ حفاظت خوداختیاری کا مقتضیٰ تھا کہ اسپارٹہ کے فتحمند شہری اپنی

---

[۱] یہ زیادہ تر ساحلی شہر تھے جہاں تجارت کی آسانیاں حاصل تھیں اور جہاں حکومت چھننے کے بعد قدیم باشندوں نے اسی پیشے کے ذریعے دولت و اقتدار بڑھا لیا تھا ۱۲

[۲] اس قیاس کی بُنیاد یہ ہو کہ اسپارٹہ کے شاہانِ متاخرین میں سے ایک بادشاہ کلیومنیز (تیسری صدی ق م) مدّعی تھا کہ میں اکائی نسل سے ہوں، اسپارٹہ میں بوقتِ واحد دو بادشاہوں کا حکومت کرنا بھی اس شبہ کو قوی کرتا ہو کہ ڈورئین حملہ آور ایسی مقاہمت پر مجبور ہوئے تھے کہ قدیم آبادی کے بھی ایک بادشاہ کو شریکِ حکومت تسلیم کرلیں۔ اگرچہ بعد میں بالکل ممکن ہو کہ یہ فرق فراموش ہو گیا ہو اور ڈورئین غلبے کے سامنے قدیم اکائی خاندانِ شاہی اپنے شرکائے حکومت میں رَل مِل کے اپنا نام او رامتیازِ نسلی کھو بیٹھا ہو (دیکھو انسائی کلوپیڈیا طبع نہم "یونان") رومی تاریخ کے ابتدائی عہد میں ہمیں ایسے تثنیۂ حکومت کی مثال ملتی ہو مگر قدیم اہلِ اسپارٹہ نے اس کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور جدید اہلِ تحقیق بھی اس قیاس کو زیادہ وقعت نہیں دیتے

جنگی برتری کو برقرار رکھیں اور جہاں تک ہو سکے قدیم آبادی کو اُبھرنے کا موقع نہ دیں یہی وجہ ہے کہ یونان کی دوسری ریاستوں کی طرح اسپارٹہ میں تجارت اور صنعت وحرفت کو کبھی فروغ نہ ہوا بلکہ وہ اخیر تک ایک بڑا گانوں یا لشکری پڑاؤ بنا رہا جس میں نہ سربہ فلک محلّات و مکانات تھے نہ فصیل و بروج۔ اپنے موقع کے اعتبار سے ان جنگی استحکامات کی اُسے چنداں ضرورت بھی نہ تھی اور پھر لکرگس کے بقول "سب سے مستحکم شہر تو وہ ہے جس کی فصیلیں آدمیوں کی ہوں نہ کہ اینٹوں کی"!

مگر اُن کی سب سے عجیب خصوصیت وہ آئین اور قوانین ہیں جنھوں نے ساری قوم کو ایک ایسی فوج بنا دیا تھا جس کا مشغلۂ حیات جنگ ہو اور جو ہر وقت اُس کی تیّاریوں میں مصروف رہے۔ بچّے کے پیدا ہوتے ہی ان قوانین کا عمل شروع ہو جاتا (بلکہ اس لحاظ سے کہ شادی بیاہ اور دولھا دُلھن کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں کے بھی ضابطے مقرّر تھے پلوٹارک کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں معلوم ہوتا کہ مقنّن نے استقرارِ حمل اور جنین تک کی پرورش، قانون کی جکڑبند سے مستثنیٰ نہ چھوڑی تھی) اور ولادت کے چند روز بعد ہی مولود کو پنچایت میں پیش کرتے کہ اُس کی شکل اور قویٰ کا معائنہ کیا جائے۔ اگر پنچوں کے نزدیک وہ تندرست اور مضبوط سپاہی بننے کے لائق ہے تو اُس کا نام قوم کی فہرست میں داخل کر لیا جاتا اور نو ہزار مساوی قطعاتِ زمین میں سے ایک قطعے کا وہ حقدار ہو جاتا لیکن اگر وہ ناتوان اور برے قویٰ کا ہے تو کمال سرد مہری سے اُسے کوہِ ٹے گی ٹاس کے ایک کھڈ میں پھکوا کے تلف کرا دیتے کہ اس کی زندگی نہ اپنے لئے مفید ہے نہ قوم اور آیندہ نسلوں کے لئے۔

سات برس کی عمر سے ان کی فوجی تربیت شروع ہوتی تھی اور ان کے دستے سرکاری افسروں کی نگرانی میں جنگی ورزشیں اور وہ قواعد سیکھتے جن کی لڑائی میں ضرورت پیش آتی ہے۔ اسی عمر میں اُنھیں ہر قسم کی مشقّت اور جفاکشی کا عادی بنایا جاتا اور غذا اتنی کم

دی جاتی تھی کہ وہ مجبوراً شکار سے اپنی شکم پُری کریں۔ یا چوری کرنی سیکھیں کہ اہلِ اسپارٹہ اسے بھی سپہ گری کا ایک فن سمجھتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا اُس عہد میں چرچا نہ تھا اور ہو بھی تو اسپارٹہ والے اس پر التفات نہ کرتے تھے۔ لیکن لڑکوں کو محض بے خبر اور جاہل نہ رکھا جاتا تھا، بلکہ نظم و موسیقی کے علاوہ وہ اپنی قومی تاریخ اور کارناموں سے بخوبی آشنا ہوتے اور اُنھیں آدابِ مجلسی اور ظرافت و بذلہ سنجی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس طرح اُن کا لڑکپن گزرتا۔ اور جب وہ جوان ہوتے تو اُس وقت بھی ان کی زندگی ویسی ہی سادہ اور پُرمشقّت رہتی۔ کیونکہ بیویوں کے ساتھ گھر پر رہنے کے بجائے انھیں روزانہ قواعدِ جنگ کرنی پڑتی اور رات کو مشترکہ مکانوں میں اپنے ہم جولیوں کے ساتھ سونا ہوتا تھا۔ اس شرکت میں بالعموم پندرہ پندرہ آدمی شریک رہتے اور کھانا بھی ایک جگہ مِل کر کھاتے تھے جو اپنی سادگی بلکہ بد مزگی میں ضرب المثل تھا۔

عورتوں کے واسطے قاعدے الگ مقرّر تھے۔ اور اگر وہ فنونِ جنگ سیکھنے سے محروم تھیں تو صحتِ جسمانی کے لئے دوسری ورزشیں اور بھاگ دوڑ کے کھیلوں سے مستثنیٰ نہ کی گئی تھیں حتیٰ کہ ان کے قانونی دستور العمل میں کُشتی بھی داخل تھی۔ مطلب یہ کہ اگر وہ خود نہ لڑ سکیں تو اچھے لڑنے والے ضرور پیدا کرسکیں اور نیز مردانہ اور جنگی فنون سے فی الجملہ کچھ نہ کچھ شناسا ہو جائیں۔ چنانچہ اسپارٹہ کی عورتیں بلند نظری اور عالی ہمتی میں مردوں سے کچھ زیادہ گھٹی ہوئی نہ تھیں اور درحقیقت کوئی اسپارٹی ماں اپنے بیٹے کی موت پر اتنی رنجیدہ نہ ہوتی تھی جتنی اُس کی بُزدلی، یا میدان سے ہٹ آنے پر۔ انھیں اوصاف کی وجہ سے، عورتوں کی جو قدر و منزلت اور آزادی، اسپارٹہ میں تھی وہ دورِ قدیم کی اور کسی قوم میں نہیں پائی جاتی۔ یہاں تک کہ اُن کی آزادی پر بہت سے اہل الرّائے حرف گیر ہیں اور اخلاقاً اُسے اچھا نہیں سمجھتے، خصوصاً بعض ڈراما نویسوں نے اس کا بڑا خاکہ اُڑایا ہے۔

لیکن اسپارٹہ کے اس نظام معاشرت کی سب سے نرالی خصوصیت یہ تھی کہ اُن میں صنعت وتجارت قریب قریب ممنوع تھیں، دولت اور دولتمندی کے فرق مراتب معدوم سے تھے اور سامانِ تکلفات وعیش کا اسپارٹہ میں نام ونشان نظر نہ آتا تھا۔ اس حیرت انگیز نتیجہ کے بڑے سبب تین تھے (۱) زمینوں کی مساوی تقسیم، کہ کوئی شہری ایک رقبہ معینہ سے زیادہ لینے کا مجاز نہ تھا (۲) لوہے کے سکّے کا رواج جو بہت بھاری اور کم قیمت ہوتا تھا اور جس سے چند اشرفی کے برابر مال جمع کرلینا بھی بہت دشوار بات تھی۔ سونے چاندی کا سکّہ ان کے ہاں ممنوع تھا اور اسی وجہ سے نہ ان کی اندرونی تجارت فروغ پاسکتی تھی نہ باہر کے تاجروں کو وہاں مال لانے کی ہمّت پڑتی تھی (۳) اُن کے مکانات حکماً سادہ ہوتے اور کھانا بھی وہ اوروں کی شرکت میں کھاتے تھے جہاں تکلف برتنے کی کوئی گنجایش واجازت نہ تھی۔ اُن کی ضروریات زندگی کے لئے ہیلواٹ کھیتی کرتے تھے اور اہل اسپارٹہ کو بلا مشقت اجناس کی کافی اور مقررہ مقدار سالانہ مل جاتی تھی۔ اس طرح وہ اپنا سارا وقت اطمینان کے ساتھ جنگی مشاغل میں صرف کرسکتے تھے اور یہی اُن کے آئین و قوانین کی اصلی غایت تھی۔ اسپارٹہ کے عجیب وغریب تمدّن کا خلاصہ یہ تھا۔ اسی تمدّن کی بدولت تاریخ میں اُسے نمایاں امتیاز اور عرصہ دراز تک اقتدار حاصل رہا اور اس کے بگڑتے ہی اہل اسپارٹہ کا طلسم فوقیت بھی باطل ہوگیا۔

لکرگس ایک عام اور دلپسند روایت کے بموجب یہ سارا مجموعۂ قوانین ایک ہی شخص کا نتیجۂ فکر تھا اور اُسے اسپارٹہ کے لوگ واجبی طور پر اپنی قوم کا سب سے بڑا محسن مانتے تھے۔ اُس کا نام لکرگس تھا اور اس کا زمانہ جدید تحقیقاتوں نے قیاساً نویں صدی قبل مسیح کی پہلی بیسی قرار دیا ہے۔ مگر یورپ کے بہت سے بدگمان اس روایت کو مصنوعی قرار دیتے ہیں اور اُن کے خیال میں لکرگس اسپارٹہ کا ایک بہت پُرانا دیوتا تھا جس سے بعد میں وہ تمام رسم ورواج منسوب کردیئے گئے تھے جو بتدریج اسپارٹہ میں جاری ہوئے۔ قدیم مؤرخ طوسی ویدِش اور ہیلانی قس

بھی لکرگس کی قانون سازی کو تسلیم نہیں کرتے اور کئی مخالف قراین اور بھی شمار کیے جاسکتے ہیں۔لیکن دُنیا سے مشاہیر پرستی کا اثر ابھی اتنا زایل نہیں ہوا ہی کہ وہ ایسے نامی مقنن کے وجود سے انکار کرنا بہ آسانی گوارا کرلے اور شاید اسی لیۓ اہل تاریخ کا ایک بڑا گروہ لکرگس اور اس کی قانون سازی[۱] کا قایل ہی۔اور خود ہم بھی پسند نہیں کرتے کہ ان کے خلاف بدگمانوں کے سلسلے میں اپنا نام داخل کرائیں۔

مگر قدیم تاریخ کے مطالعہ میں کسی شخص کے وجود و عدم کی بحث اتنی اہم نہیں ہوتی جتنی کہ اُس سے منسوب کام اور اُن کے نتایج و اثرات کی۔پس دیکھنا یہ ہے کہ لکرگس کے انوکھے قوانین کے متعلق اہل الراۓ کا کیا خیال ہی:۔

قدیم مصنف تو اکثر لکرگسی قوانین کے مدّاح پاۓ جاتے ہیں لیکن حکماۓ اکے ڈمی[۲] اور حکیم ارسطو ان کے خلاف ہیں اور نہ صرف اصولاً اُنھیں بُرا بتاتے ہیں بلکہ عملاً بھی ان کے نزدیک یہ قوانین بالکل ناکارہ ثابت ہوۓ۔کچھ اسی قسم کی راۓ بعض جدید اہل تحقیق کی معلوم ہوتی ہے اور وکٹر ڈورُے اخلاقی لحاظ سے بہت سی بُرائیاں بیان کرنے کے بعد

---

[۱] لکرگس کی سوانح عمری اور ان عجیب قوانین کا ذکر پلوٹارک کی دلچسپ کتاب الیسٹر ڈیریرے مل لایوں میں بہ تفصیل تحریر ہی۔اور انجمن ترقی اُردو نے حال میں اس کتاب کا ترجمہ شایع کیا ہے۔ہم اس کی ابتدائی سوانح عمریوں میں لکرگس کے حالات مطالعہ کرنے کی اپنے ناظرین سے سفارش کرتے ہیں ۱۲

[۲] "اکے ڈمی" درحقیقت شہر ایتھنز کے قریب ایک باغ کا نام تھا جہاں حکیم افلاطون فلسفہ سقراط کی تعلیم دیتا تھا۔بعد میں یہ مقام ایک خاص حلقۂ درس بن گیا اور افلاطون کے جانشین یا پیرو اسی کے نام سے حکماۓ اکے ڈمی کہلانے لگے۔اس میں بھی تین علٰحدہ گروہ مشہور ہوۓ۔اوّل قدیم اکیڈمی،جس میں افلاطون اور اس کے قریبی جانشین شامل ہیں۔دوسرے وسطی اکیڈمی (دوسری اور تیسری صدی قبل مسیح) جس کے حکما گروہ مشککین کے ایک حد تک ہمخیال بن گئے تھے۔تیسرے جدید اکیڈمی جس کا فروغ پہلی صدی قبل مسیح سے اس حلقہ درس یعنی اکیڈمی کے بند ہوجانے تک رہا (۵۲۹ء) اس گروہ کے حکما اخلاق اور الٰہیات کی تعلیم پر زیادہ زور دیتے تھے ۱۲

ایسے "آلہ جنگ وقتال" پر بھی معترض ہے جیسا کہ لکرگس نے اپنی قوم کو بنا دیا تھا۔ اور لکھتا ہے کہ اس قسم کی "مشین" سے تخریب کے سوائے کسی "تکوین" کی توقع کرنا عبث تھا۔ چنانچہ طوسی ڈیڈس کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی کہ زوال حکومت کے ساتھ ہی اسپارٹہ کا ورقِ عظمت پارہ پارہ ہوگیا اور آج صنعت وفن یا علم وحکمت کی ایک یادگار بھی ایسی موجود نہیں جو لکرگس کے وطن اسپارٹہ سے منسوب کی جاسکے!

اخیر میں دوریے نے اہل اسپارٹہ کی بعض خوبیوں کی ستایش بھی کی ہے کہ وہ موت اور تکلیف سے ذرا نہ ڈرتے تھے اور جذبات پر جو قابو انھیں حاصل تھا اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ اصول کے لئے "اطاعت کرنا اور جان دے دینا اُنھیں کو آتا تھا اور قانون اُن کی نگاہ میں اس کرۂ خاک کا سب سے زیادہ واجب التعظیم فرمانروا تھا"! لیکن اسپارٹہ کی عظمت کا حقیقی سبب سائی مونی دس نے خوب سمجھا۔ یعنی لکھتا ہے کہ یہ وہ شہر ہے جہاں آدمی ہلائے جاتے ہیں! واقعی "اوروں پر حکومت بالعموم اُنھیں کو ملتی ہے جنھیں اپنے اوپر حکومت کرنی آتی ہو" اور عرصۂ دراز تک یہ دونوں باتیں اسپارٹہ کو حاصل تھیں۔

طرزِ حکومت | اس قدر مساوات اور جمہوریت کے باوجود کہ قانوناً کوئی شخص دوسروں سے زیادہ زمین واملاک نہ رکھ سکتا تھا، اسپارٹہ میں موروثی بادشاہت کا آئین نہ ٹوٹا۔ بلکہ قوانین لکرگس کے صدیوں بعد بھی، جبکہ تقریباً سارے یونان میں بادشاہت کی جگہ حکومتِ خواص رائج ہوگئی تھی، اہل اسپارٹہ نے اپنا طرز نہ چھوڑا اور اخیر تک اُن کے ہاں وقتِ واحد میں دو موروثی بادشاہ حکومت کرتے رہے۔ قدامت پسندی ہو تو ہو، اس میں شک نہیں کہ اس تقسیم حکومت کی وجہ سے کسی بادشاہ کو جبر ومطلق العنانی کا موقع نہ ملتا تھا اور اگر اُن کے دل میں ایسا ناپاک وسوسہ پیدا ہوجائے تو اُس کی دوسری روک مجلس بزرگان تھی جس میں اٹھائیس "شصت سالہ" ارکان شامل ہوتے تھے۔ ان کے انتخاب کا دستور بھی نرالا تھا اور پلوٹارک نے لکرگس کی سوانح عمری میں بڑے لطف سے اس کا حال لکھا ہے۔ خصوصیتِ سن کے

باعث مجلس کا نام گیروسیہ تھا جو "گیرو" بہ معنی ضعیف العمر سے نکلا ہے۔ ملکی معاملات میں بادشاہ ان بزرگوں کی رائے کے پابند تھے اور مجموعی طور پر اُنھیں تقریباً وہی اقتدار حاصل تھا جو زمانہ شجاعت کی مجلس امراکو۔ اور جس طرح ہومر کے ہاں عوام الناس بادشاہ کی تقریر سننے چوک میں جمع ہوتے ہیں، اسی طرح اسپارٹہ میں نیا قانون بناتے وقت ساری قوم کو بلانا ضروری ہوتا تھا۔ لیکن تقریر کا حق صرف حکام کو حاصل تھا اور جمہور مُثبت یا منفی رائے دینے کے مجاز تھے۔ اور اس حد تک اسپارٹہ اور قدیم اکائیوں کے طرز سلطنت میں کوئی اصولی فرق نظر نہیں آتا۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، حالات میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اسپارٹہ میں ایک نیا عہدہ ایفور (بمعنی نگراں کار) قایم ہوا جس کی تعداد اور قوت رفتہ رفتہ خود بادشاہوں پر فایق ہو گئی اور قوانین کی تجویز و تشریع اور ممالک غیر سے رسل و رسائل کلیتہً اسی نئی جماعت کے عمّال کے ہاتھ میں آگئی۔ یہاں تک کہ اخیر میں ان کے کاموں میں کسی کو دخل واحتساب کا بھی حق حاصل نہ تھا۔

اسپارٹہ کی لڑائیاں لیکن بادشاہ، مجلس بزرگان یا ایفور، یہ تمام عہدے اُس نظام معاشرت میں کوئی اصولی فرق پیدا نہ کر سکے تھے، جسے لکرگس کے غیر معمولی دست و دماغ نے تیار کیا تھا: اسپارٹہ کا ہر فرد ویسا ہی شمشیر زن اور اس کی تمام آبادی وہی خوفناک آلۂ جنگ و قتال تھی۔ اور گو مقنن نے کمال دُور اندیشی سے غیر ضروری چڑھائیاں یا لمبی لمبی لڑائیاں لڑنے کی انھیں ممانعت کر دی تھی، تو بھی اس پر عمل ہونا امر محال تھا۔ دُنیا نے ابھی تک کوئی ایسی امن پسند قوم نہیں دیکھی ہے جو اس دورِ جدید کی زبان میں "محض مدافعت یا قیام امن" کے لیے ہمیشہ جنگی تیاریوں میں مصروف رہی۔ اہل اسپارٹہ کی جنگی قابلیت کو بھی امتحان کی ضرورت تھی اور تھوڑے ہی دن میں اُن کے زعم شجاعت کا ہوسِ اقتدار کی صورت میں بدل جانا بھی ناگزیر تھا۔ چنانچہ آٹھویں صدی قبل مسیح ہی میں ہم اُنھیں آرگس کے ساتھ دست و گریباں پاتے ہیں۔

آرگس | یہ ڈورئین ریاست ارگولس کے علاقے میں، اگامینن کے قدیم پایۂ تخت مائی کینہ کے قریب قایم ہوئی تھی اور اکائیوں کی اس نامی راج دھانی کے اُجڑنے کے بعد وہی ڈورئین باشندوں کی سب سے قوی حکومت سمجھی جاتی تھی۔ اس کے شمال میں کورنتھ سکیان وغیرہ کئی ڈورئین ریاستیں تھیں اور یہ سب اپالو دیوتا کی پرستش میں شریک اور ملکی اعتبار سے باہم حلیف تھیں۔ شہر آرگس میں ان کا مشترکہ معبد بنا ہوا تھا جہاں ہر سال چڑھاوے چڑھتے، میلا لگتا اور دستور (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۶) کے بموجب اس اتحاد میں آرگس کو سر برآوردہ ریاست تسلیم کیا جاتا تھا۔ اُس کا علاقہ بھی اوّل اوّل سب سے زیادہ اور انتہائی مشرق سے خلیج لقونیہ تک پھیلا ہوا تھا۔ پس اپنے مغربی ہمسایوں کی ترکتاز سے پہلے وہی متاثر ہوا، اور دونوں کے درمیان ایک طویل و شدید لڑائی چھڑ گئی۔ اس لڑائی کے تفصیلی حالات بہت کم معلوم ہوئے ہیں، لیکن یہ یقینی ہے کہ فتح زیادہ تر اسپارٹہ کے پہلو پر رہی۔ کیونکہ اخیر میں اُس کو ہم تمام لقونیہ پر قابض اور فریق مقابل کو پیلوپنی سس کے جنوبی ساحل سے بے دخل پاتے ہیں۔ مگر ایک معقول علاقہ جانے کے علاوہ آرگس کو بڑا نقصان یہ پہنچا کہ اُس کا گزشتہ اقتدار اپنے حلیفوں پر سے کم ہو گیا اور اب رفتہ رفتہ اس کی جگہ اسپارٹہ نے لینی شروع کی۔

اولمپیہ کا مذہبی میلا | پیلوپنی سس کے مغربی ضلع (رالے لس) میں زِئیس دیوتا کی ایک پُرانی خانقاہ شہر اولمپیہ میں بنی ہوئی تھی۔ یہاں بھی اٹھارہ بستیوں کی ایک مذہبی انجمن قایم تھی اور ہر چوتھے سال بڑا بھاری میلا لگتا تھا۔ اسی کے متعلق بعض حقوق پر شرکائے انجمن میں تنازعہ ہوا اور پیزا اور رالے لس کی ریاستیں آپس میں جھگڑ پڑیں۔ اُس وقت نوخیز اسپارٹہ نے نہ بطریق پنچایت بلکہ بزور، رالے لس کے حق میں فیصلہ کر دیا اور متنازعہ انتظامات اسی کے سُپرد کر دیئے۔ پھر اس چیرہ دستی پر کسی کو مخالفت کی ہمت نہ ہوئی تو اسپارٹہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور سرپرست بن کر اس تہوار میں نئی نئی رسمیں اور دلکشی کے سامان

اضافہ کئے اور تمام یونان کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دی کہ میلے کی شان اور اپنی نمود بڑھے اور اسپارٹہ تمام یونانیوں میں سربرآوردہ تسلیم کیا جانے لگے۔

میلے میں اوّل معمولی دوڑیں مگر پھر کشتی اور گھونسے کے مقابلے اور مردانہ کرتب طاقت آزمائیاں اور بعد میں گھڑ دوڑ اور رتھوں کی دوڑ بھی داخل کرلی گئی جن میں ہر شخص شریک ہوسکتا تھا۔ اور اگرچہ جیتنے والے کا انعام صرف جنگلی زیتوں کا ایک تاج ہوتا تھا مگر اسی کو لوگ بڑا اعزاز سمجھتے اور تاج شاہی سے بڑھکر اس کی آرزو کرتے تھے۔ ان جدتوں کے ساتھ یونان کی ہر ریاست میں نقیب میلے کی تاریخ اور دعوت کا عام اعلان کرنے کے لئے بھیجے جانے لگے اور اولمپیہ کے راستوں کی بھی باقاعدہ نگہبانی ہونے لگی تاکہ جاتری حفاظت واطمینان کے ساتھ وہاں آجاسکیں۔ ابتدا میں یہ انتظام میلے سے چندروز پہلے اور بچھڑنے کے چندروز بعد تک رہتا تھا، لیکن ہوتے ہوتے تہوار کا سارا مہینہ محترم سمجھا جانے لگا اور اس "امن وعبادت کے زمانے" میں جنگ اور خونریزی ناجائز قرار پائی۔

میلے میں دُور دُور کے جاتری جمع ہوتے تھے اور تقریباً سب یونانی ریاستیں اپنے اپنے وکیل بھیجتی تھیں کہ دیوتا کی درگاہ پر نذرونیاز چڑھائیں اور نیز اپنی ریاست کی جاہ و طمطراق دکھانے میں دوسروں سے مسابقت کریں۔ اس طرح کچھ دن میں یہ میلا واقعی سارے یونان کی ایک شاندار چہارسالہ نمایش بن گیا اور اُس نے اُن کے درمیان نہ صرف دوستانہ روابط بڑھانے میں بڑی مدد دی بلکہ ایک معنی کر قومیت کا سبق سکھایا اور اُن کے دلوں میں یہ خیال جاگزیں کیا کہ متعدد ریاستوں میں بٹے ہونے کے باوجود وہ سب ایک ہی باغ کے پودے اور ایک ہی وطن کے باشندے ہیں۔

دوسرا قابلِ ذکر فائدہ جو اسی تہوار[1] کی ہمہ گیری سے حاصل ہوا، وہ یونانیوں میں

---

[1] اولمپیہ کی مثل ڈیلفی، نیمیہ اور خاکنائے کورنتھ پر چہارسالہ اور دوسالہ میلے ہوتے تھے مگر انھیں اولمپی تہوار کے برابر شہرت وعظمت کبھی میسّر نہ آئی ۱۲

ایک سمّت کا رواج پا نا تھا۔ اب تک ہر علاقے کے لوگ اپنے اپنے طور پر سنین کا حساب رکھا کرتے تھے لیکن اولمپی تیرتھ کی شہرت نے ان مقامی حسابوں کو بیکار کر دیا اور اب وہ اولمپیاڈ سے اپنی تاریخیں شمار کرنے لگے۔ اِس لفظ سے مُراد اولمپی تیرتھ کا وقت ہے اور چونکہ یہ تیرتھ چار سال میں ایک مرتبہ جُڑتا تھا، اس لئے ایک اولمپیاڈ چار سال کی مدّت کا نام قرار پایا اور پہلے اولمپیاڈ[ل] کا زمانہ متحقق ہونے کے بعد اسی سمّت سے، تاریخ یونان کے موجودہ سنین عیسوی مطابق کئے گئے ہیں۔

مگر محض ان بنجر وسیلوں سے اسپارٹہ کی ہوس ملک گیری سیر نہ ہو سکتی تھی اور غالباً آٹھویں صدی کے آخری نصف میں اُس نے آرگس کی طرح اپنے مغربی ہمسایوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ ان لڑائیوں کا پہلا سلسلہ کم و بیش بیس برس تک جاری رہا اور پھر فریقین، گویا ستانے کی غرض سے ٹھیر گئے۔ لیکن دو نسلیں نہ گزری تھیں کہ اُن میں دوبارہ ایک خونریز جدوجہد شروع ہو گئی اور مسینیہ کی کامل ہزیمت پر اس کا اختتام ہوا (قیاساً ۶۴۸ سے ۶۳۰ ق م تک)۔

مسینیہ سے لڑائیاں

مشہور ہے کہ اس موقع پر مسینیہ کو آرگس ارکیڈیا اور سکیان کی ریاستوں نے مدد دی تھی اور کورنتھ و ایلس اسپارٹہ کی طرف تھے۔ مگر ان پردیسیوں میں سب سے نامور طیوس شاعر ہے جو ایتھنز کا باشندہ تھا اور ڈیلفی کے الہامی مشورے کے موافق امداد کے لئے اسپارٹہ بلایا گیا تھا۔ اس کا بڑا کمال یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنی پرجوش نظموں سے اُس نے اہل اسپارٹہ کو ایسا جوش دلایا کہ ٹوٹتے ٹوٹتے اُن کی ہمت بندھ گئی اور وہ استقلال سے لڑے گئے یہاں تک کہ اہل مسینیہ کو آخر کار اطاعت قبول کرنی پڑی اور یہ سارا علاقہ فتحمند لیسی ڈیمونیوں کے قبضے میں آگیا۔ مفتوحین کی عمدہ سے عمدہ زمینیں، اور ان سے بھی کہیں زیادہ عزیز و محبوب شے آزادی چھین لی گئی اور وہ ہیلوا ٹوں کی طرح اسپارٹہ کے غلام بنا لئے گئے۔ حالانکہ

ل پہلا اولمپیاڈ جمہور اہل تحقیق کے نزدیک ۷۷۶ ق م سے شروع ہوتا ہے ۱۲

نسلاً اُن میں اور اہل اسپارٹہ میں کچھ فرق نہ تھا اور اپنی بدترین شکستہ حالی میں بھی وہ یہ نہ بھول سکتے تھے کہ ہم ڈورئین خاندان سے ہیں۔ لیکن جو کچھ ہو دُنیا کے اس اٹل اور بیرحم اصول کے مطابق کہ محکوموں کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی تین سو برس کے لئے میسینیہ کا نام مٹ گیا۔ اور جب تک اپامنن داس نے اسپارٹہ کو شکستیں دے کر اس بدنصیب خطے کو نعمتِ آزادی عطا نہ کی وہ اپنی کسی کوشش سے دوبارہ زندہ نہ ہوسکا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سنہ ۳۶۹ ق م تک یونان کی تاریخ کو میسینیہ کے ذکر سے خالی پاتے ہیں۔

ٹیگیہ

لیکن ملک گیری وہ خوفناک مرض ہے کہ جس میں ہر کامیابی سے حرص بڑھ جاتی ہے میسینیہ کا وسیع علاقہ ہضم کرنے کے بعد اسپارٹہ پر بھی یہی بلا مسلط ہوگئی تھی۔ جنوبی جزیرہ نما پر قابض ہوتے ہی وہ شمال کی طرف اپنی للچائی نظریں ڈالنے لگا اور علاقہ ارکیڈیا کی جنوبی ریاست ٹیگیہ پر اُس نے چڑھائی کی۔ لیکن اہل ٹیگیہ نے بڑے جوش اور بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا اور پے در پے شکستیں دے کر اسپارٹہ کے صدہا سپاہی گرفتار کرلئے اور وہی طوق اُن کے گلوں میں ڈالے جنھیں وہ ٹیگیہ والوں کے واسطے لائے تھے۔ پھر غلاموں کی طرح کھیتوں میں کام کرنے پر مجبور کیا کہ خود اہل اسپارٹہ کو بھی اس تکلیف کا کچھ اندازہ ہوجائے جو ہیلوٹوں کو اُن سے پہنچ رہی تھی۔

اس ناکامی نے اسپارٹہ والوں کے حوصلے پست کردئے۔ ارکیڈیہ کو فتح کرنے سے وہ مایوس ہوگئے اور ٹیگیہ کو انھوں نے خوشی سے اپنا حلیف اور برابر کا اتحادی تسلیم کرلیا (سنہ ۵۶۰ ق م) پھر مصالحت کی یادگار میں الفیئس ندی کے منبع پر ایک مینار تعمیر کیا گیا جس کے پتھروں پر شرائط صلح منقوش تھیں۔ ٹیگیہ بھی آئندہ سے اسپارٹہ کا سچا رفیق ہوگیا اور اس کے سپاہی جنھوں نے اپنی شجاعت کا سکہ بٹھا دیا تھا، اسپارٹہ اور اس کے دوسرے حلیفوں کی فوج میں بائیں پر جگہ پاتے تھے جو اُن میں بڑا اعزاز تھا۔

لیکن اس واقعہ کے اثرات صرف بالائی نہ تھے بلکہ سچ یہ ہے کہ اُس نے اسپارٹہ (اور

اس لئے یونان کی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ ٹگیہ سے یہ سبق آموز شکست پانے کے بعد ہی اسپارٹہ کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا اور جنگ وجدال کے بجائے اب اس نے دوستانہ طریقوں سے اپنا اقتدار بڑھانے کی حکمت عملی اختیار کی جس میں دوسروں کو مفتوح کرنے کی نسبت کامیابی یقیناً زیادہ سہل تھی۔ اور ہمارا قیاس ہے کہ یونان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی مدنیت میں اتنی ترقی کر گئی تھیں کہ اب انھیں آئے دن کے باہمی جھگڑے اور کشت وخون خوش نہ آتا تھا اور ان میں سے اکثر کمزور شہروں کو کسی طاقتور حلیف کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ سو جنگجو اسپارٹہ سے بڑھکر اس کام کے واسطے کوئی موزوں نہ تھا۔ انھی وجوہ سے ہم آیندہ دیکھینگے کہ کس طرح متعدد ریاستوں نے اسپارٹہ کا اقتدار تسلیم کر لیا اور اس کا حلقۂ اتحاد کس طرح قریب قریب تمام پیلوپنی سس میں بتدریج پھیل گیا۔

۳۔ دوسری ڈورین ریاستیں

ڈورین مہاجرین کے سب سے بڑے گروہ کا حال پڑھنے کے بعد جس کی فتح میسینیہ کے وقت سے صرف دو شاخیں باقی رہ گئی تھیں، اب ہم اس قوم کی چند اور ریاستوں پر نظر ڈالتے ہیں کہ اس عرصے میں وہاں کیا کیا واقعات پیش آئے؟ یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ یہ حالات صرف ان ریاستوں کے ہیں جو اُس عہد میں زیادہ مشہور تھیں اور نیز جن کی تاریخ باقی ریاستوں کے واسطے بھی نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ ورنہ یوں تو ہیلاس میں شہر شہر علحدہ حکومت قایم تھی اور حکیم ارسطو ہی نے ڈیڑھ سو سے زیادہ خود مختار ریاستوں کے حالات جمع کئے تھے، جو بدنصیبی سے اب ناپید ہیں، لیکن ہم نے یہاں اختصار اور انتخاب سے کام لیا ہے اور کورنتھ، سکیان اور مگارا کے ذکر پر اکتفا کی ہے۔

طرز حکومت | مذہب و معاشرت کے اعتبار سے یہ لوگ بھی ویسے ہی تھے جیسے اُن کے ہم قوم اہل اسپارٹہ یا اہل آرگس۔ لیکن ان کی تاریخ شروع ہوتے وقت ہم اُن کے طرز حکومت میں بڑا فرق یہ دیکھتے

ہیں کہ شخصی بادشاہوں کے بجائے اُن میں خاندانی امرا کا زور بڑھ گیا ہے اور جا بجا وہ طرزِ حکومت قایم ہوتی جاتی ہے جسے اہلِ یونان حکومتِ خواص (اَولی گارکی یعنی چند آدمیوں کی حکومت) کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی قبل مسیح تک سوائے اسپارٹہ کے یونان کی ہر ریاست میں انتظام سلطنت انھی امرائے خاندانی کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اور اگر بادشاہت شاذونادر کہیں باقی رہی تو وہ محض ایک نمایشی اور رسمی چیز تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یونانیوں نے جمہوریت کے دوسرے درجۂ ارتقائی میں قدم رکھا اور شخصی بادشاہت کے بدلے، جو ابتدائے تمدن میں ایک معتدل اور گویا قدرتی طریق حکومت ہوتا ہے اب یہ اختیارات کئی اشخاص میں تقسیم ہو گئے؛ لیکن یہ آئین کہ محض نسب وجہ امتیاز ہو، موروثی بادشاہت سے کچھ کم غیر معقول نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ آدمی مل جائیں تو ملک کو اتنا نقصان پہنچے کہ ایک موروثی بادشاہ سے بھی نہ پہنچتا؛ چنانچہ یونان میں بھی اُمرا، اوّل یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم سُورماؤں کی نسل سے ایک علاحدہ اور برگزیدہ قوم ہیں۔ پھر اُن کی مراسمِ پرستش جُداگانہ قرار پاتی ہیں اور ان میں عوام حصّہ نہیں لے سکتے۔ اور آخر میں ان خاندانی امیروں کو یہ تکلیف دہ خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے کہ ملکی قوانین سے اُن کے سوائے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔ اُن کا قیدِ تحریر میں آنا سخت بدعت ہے اور یہ عزیز ورثہ فقط امیروں ہی کو سینہ بسینہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن انھی امتیازات نے مل کر خواص و عوام کو بالکل دو جداگانہ گروہ بنایا اور یہ قوی تر گروہ سلطنت کے جزو کل پر اس درجے حاوی ہو گیا کہ اُس کے نزدیک کمزور عوام تمام حقوقِ شہریت سے عاری اور گویا محض خواص کی خدمت کرنے کے واسطے خلق ہوئے تھے۔ وہ امرا کی جاگیروں میں زراعت اور مشقت کر کے اپنا پیٹ پالتے اور بعض اوقات انھیں خواص کے قریب مکان بنانے کی بھی اجازت نہ ہوتی تھی جیسا کہ سکیان میں تھا جہاں ڈورین امرا پہاڑیوں کے چڑھاؤ پر رہتے تھے اور عوام النّاس

کو سمندر یا اسوپس ندی کے کنارے نشیبی میدانوں میں رہنے کا حکم تھا۔ اسی نسبتِ مکانی کی وجہ سے اُمرا اُنھیں اجالین، یعنی اہلِ ساحل کہتے تھے اور ملکی معاملات میں حصّہ دینا ایک طرف یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو سکیں۔ اس سے نہ صرف اُمرا کی کبر ونخوت ثابت ہے بلکہ یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اُن دنوں اہلِ یونان کی فوجیں بہت چھوٹی ہوتی تھیں۔ ہاں تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ قوموں کی جنگی تیاریاں بھی وسیع ہوئی ہیں اور شاید اسی لیے ہم امرائے سکیآن کو کچھ عرصے بعد عوام کی فوجی امداد کا محتاج دیکھتے ہیں۔ اگرچہ اتنا فرق اس وقت بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا کہ امرا نیزہ وشمشیر سے اور عوام محض لٹھوں سے مُسلّح ہوتے کہ اس زمانے میں یہ بھی ایک ادنیٰ درجے کا آلۂ جنگ تھا۔

مدتوں سکیآن میں یہی کیفیت رہی، لیکن جب صنعت وحرفت اور تجارت نے وہاں فروغ پایا تو عوام الناس ان پیشوں سے بہت مالدار اور رفتہ رفتہ خواص کے قابو سے باہر ہوتے گئے۔ کیونکہ قدیم امرا کا طبقہ اپنی جاگیروں پر قانع تھا اور ایسی زمینداری یا زرعی خوش حالی لوگوں کو عیش دوست اور سست بنا دیتی ہے۔ پس جس وقت وہاں کی قدیم اور ادنیٰ طبقے کی آبادی میں شورش پیدا ہوئی (قیاساً ۶۷۶ ق م) اور ایک دولتمند عامی، ارتاگورس نے علمِ بغاوت بلند کیا تو امرا اس کا انسداد نہ کر سکے اور اُن کی حکومت پہلے ہی تصادم میں لڑکھڑا کر گر پڑی۔ ارتاگورس تمام ریاست کا مالک بن گیا اور حکومتِ خواص کے بجائے سکیآن میں حکومتِ جابریہ کا آغاز ہوا۔

حکومتِ جابریہ | اس جگہ یہ تصریح نہایت ضروری ہے کہ حکومتِ جابریہ سے مُراد ایسی مطلق العنان بادشاہت ہے جو مُروّجہ آئین اور طرزِ سلطنت کے خلاف قایم کی جائے۔ اگر کسی ملک میں مطلق العنانی پہلے سے موجود ہے تو وہاں کے بادشاہ کو جابر (یونانی لفظ "ٹرنوس") نہ کہیں گے خواہ وہ طرزِ عمل کے لحاظ سے کتنا ہی جابر اور ظالم کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ایران یا اور ایشیائی ممالک کے بادشاہ، جن کی تاریخ بدترین مظالم کی ایک مسلسل داستان ہے،

جابر نہیں کہلا سکتے کیونکہ اُن کے ملک میں طرز حکومت ہی "مطلق العنانی" تھا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی آئینی بادشاہ مُروّجہ قیود و دستور توڑ کر شخصیت حاصل کرے تو گو وہ وراثتاً بادشاہ جایز ہو، پھر بھی جابر کہلائے گا اور اس کی حکومت جابریہ ہوگی، خواہ اپنی مطلق العنانی میں وہ کتنا ہی رحمدل اور اعتدال پسند کیوں نہ ہو۔

ارتاگورس اور اس کے جانشین

مذکورۂ بالا تعریف کے مطابق ارتاگورس بھی (جو ذات کا باورچی مشہور رہے) ریاست سکیان کا پہلا جابر تھا کہ مروجہ طرز حکومت کو اُلٹ کر اُس نے مطلق العنانی حاصل کی تھی۔ اور اسی بنا پر اُس کی اولاد جو سو برس سے زیادہ تک وارثِ تاج و تخت رہی، جابر کہلاتی ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ خاندان بہت اچھا فرمانروا تھا اور سب سے بڑا کام جو اُس نے کیا وہ عوام الناس کی منزلت افزائی تھی کہ اسی طبقے کی بدولت اُسے بادشاہت نصیب ہوئی تھی اور اسی کو طاقتور بنانے میں ان بادشاہوں کا فائدہ تھا۔ پس ڈورین امرا کے امتیازات مٹانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے عوام کو بہت سے حقوق شہریت عطا کئے اور حکیم ارسطو کے ایک قول سے پایا جاتا ہے کہ ان کی یہی جمہوریت پسندی اور عدل گستری تھی جس کے باعث ان کا خاندان اتنے عرصے تک بادشاہی کرتا رہا۔

پہلی جنگ مقدّس

ارتاگورس کا پروتا کلیس تھینیز تھا۔ اُس کے زمانے میں ریاست کریسیا نے ڈیلفی کے جاتریوں پر محصول راہداری لگا دیا تھا اور اپالو دیوتا کے خدام نے ہرچند روکا وہ لوگ اس بدعت سے باز نہ آئے۔ اسی اثنا میں کلیس تھینیز کو اپنے موافق منشا ایک کہن، حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی اور انھیں خدام کی رضاجوئی میں اُس نے کریسیا سے لڑائی مول لی، جو پہلی جنگ مقدّس کے نام سے موسوم ہے (از ۵۹۵ تا ۵۸۵ ق م) کلیس تھینیز کے ساتھ اس لڑائی میں اور بھی کئی ریاستیں شریک تھیں اور ان کی متحدہ قوّت نے آخر کار اہل کریسیا کو برباد و منتشر کرکے چھوڑا۔ شہر کو

متقدین نے خوب لُوٹا اور پھر منہدم کرکے اس کی زمین اپالو کے نام پر وقف کردی گئی۔
کہتے ہیں کہ اسی لُوٹ میں کلیس تھنیز کے ہاتھ وہ بے شمار دولت آئی تھی جس سے اُس نے
اپنے وطن میں عالی شان عمارتیں بنوائیں اور صنعت وفن کی وہ قدردانی کی کہ عرصۂ دراز
تک سکیان ہنرمند باکمالوں کا مرکز مانا جاتا تھا۔ اس کی تزئین وآراستگی پر دُور دُور کے
بادشاہ رشک کھاتے تھے اور جب کلیس تھنیز نے اپنی بیٹی کا "سویمبر" کیا تو اس کا تزک و
احتشام یونان میں ضرب المثل ہوگیا تھا۔

باہمہ کلیس تھنیز طرزِ حکومت میں اپنے بزرگوں کی طرح جمہوریت پسند اور ایک سادہ
مزاج بادشاہ نہ تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی یہی نمایش اور فیاضی، رعونت وخودپرستی کا
ایک شعبہ تھی جس کی نظریں اکثر شخصی بادشاہوں کے حالات میں ملتی ہیں۔ اور غالباً اسی کے
اخیر زمانے میں خاندان ارتاگوریی کو زوال ہوا اور غالباً ۵۰۰ ق م میں سکیان کی حکومتِ جابرہ
کا خاتمہ ہوگیا۔ اُس کی جگہ پھر حکومتِ خواص نے لی۔ مگر اب سکیان کے عوام الناس ویسے
بے حق اور ذلیل نہ تھے جیسے کہ پہلی حالت میں ہم انھیں دیکھ چکے ہیں۔ بلکہ قیاس کہتا ہے کہ
اگر اسپارٹہ کی مدد شامل نہ ہوتی تو وہاں کے ڈُوریَن اُمرا دوبارہ اوج واقتدار حاصل نہ
کرسکتے اور کرلیتے تو اُسے قایم نہ رکھ سکتے تھے۔

کورنتھ جزیرہ نمائے پیلوپیسیا اور شمالی یونان کے بیچ میں کورنتھ کی حُسن پرست سرزمین واقع
تھی مگر خاکنائے کورنتھ پر ایک مینار گڑا ہوا تھا جس کے شمالی پہلو پر اِدھر آئی اونیہ ہے نہ کہ
پیلوپنی سس" کندہ تھا اور اسی طرح جنوبی پہلو پر کھُدا ہوا تھا کہ

یہ پیلوپنی سس ہے آئی اونیہ نہیں ہے!

اور اِس پُرمعنی کتبے سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کورنتھ اپنے تئیں پیلوپنیسی جانتے تھے اور
باشندگان ایٹکا یعنی آئی اونی گروہ سے اپنی علیحدگی جتانا چاہتے تھے۔ بہرحال کورنتھ
کی جائے وقوع یونان میں سب سے اچھی تھی۔ اُس کے دونوں طرف سمندروں میں ہروقت آمدرفت

رہتی تھی اور جنوب کے تمام برّی راستے اُس میں ہو کر گزرتے تھے۔ پس شہر کورنتھ جو اپنے ہمنام علاقے کا مرکزِ حکومت بھی تھا، بہت جلد یونان کی سب سے بڑی تجارتی منڈی بن گیا تھا اور منجملہ دوسری صنعتوں کے فن جہازسازی نے قدرتی طور پر وہاں سب سے زیادہ ترقی کی تھی۔ کورنتھ کے جہاز دُور دُور مشہور تھے اور وہاں کے مستری ایک سے ایک بڑھکر جدتیں کرتے رہتے تھے کہ اُن کی یہ فوقیت برقرار رہے۔ چنانچہ دورِ قدیم کے مشہور و معروف "ٹرائی ریمی" جہاز کی ایجاد بھی اسی شہر سے منسوب ہے۔ اِس میں کھینے کے لئے تین طبقے رکھے جاتے تھے اور اس لئے وسعت میں اوروں کی برابر ہونے کے باوجود اُسے کہیں زیادہ تیز چلا سکتے تھے۔

جہازسازی اور پھر جہازرانی کے فروغ ہی نے کورنتھ والوں کو خلیج کورنتھ کی جانب ایک عمدہ بندرگاہ بنانے کا خیال دلایا کیونکہ سمندر کے اس ٹکڑے کا ساحل زیادہ تر بے قاعدہ اور جہازرانی کے واسطے ناموزوں تھا۔ اس غرض کے لئے انھوں نے مقام لی کیئم کو منتخب کیا اور وہیں یونان کی سب سے پہلی مصنوعی لنگرگاہ بنی۔ دوسرا فائدہ جو بحری اولوالعزمی کی بدولت کورنتھ کو حاصل ہوا وہ یہ تھا کہ جب ان کی قدیم بادشاہت کا تختہ لوٹا اور ایکیان کی مثل یہ ریاست بھی ڈورین امرا کے قبضۂ اقتدار میں آگئی تو ان طاقتور غاصبوں کے ظلم اُٹھانے کے بجائے کورنتھ والے جوق جوق نئے مُلکوں میں جا بسے اور متعدد نوآبادیاں قایم کیں جن میں کرکایرا (موجودہ جزیرہ کارفو) سائراکیوز یا سیراقیوز (جزیرہ صقلیہ میں) بہت مشہور ہیں۔ خصوصاً اہل سیراقیوز کا یونان کی تاریخ سے قریب قریب وہی تعلق ہے جو یونان خاص کے کسی اور شہر کا، اور اس قسم کی آبادکاری اور ہجرتوں کو کورنتھ کی حکومت خاص بھی اپنے مفید مطلب سمجھتی تھی اور ایسے امیرزادوں کی، جو وطنی حکومت کے واسطے خطرناک نظر آتے ہوں، حوصلہ افزائی کرتی تھی کہ وہ باہر جا بسیں اور اپنی نوآبادیوں کا جس پرواز پر چاہیں انتظام کریں۔

مگر ان تمام احتیاطوں اور دُوراندیشی کے باوجود امرائے کورنتھ اپنی حکومت کو قایم نہ رکھ

سکے اور ان کی ناحق شناسی کے خلاف خود انھیں کے ایک ہم خاندان کپ سی لوس نے علَم مخالفت بلند کیا اور ۶۵۵ ق م میں عوام الناس کی امداد سے حکومتِ خواص کو ہٹا کر حکومتِ جابریہ کی بنیاد ڈالی۔

پیری انڈر | کپ سی لوس کے بعد اس کا بیٹا پے ری اَنڈر وارثِ تخت ہوا (۶۲۵ ق م) جو کورنتھ کا آخری اور یونان کا سب سے نامی جابر گزرا ہے۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر چالیس سال کی تھی اور اسے اپنے باپ کے سی سالہ عہدِ حکومت میں بادشاہی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا بے نظیر موقع میسّر آیا تھا۔ اسی لئے پیری آنڈر نے ایشیائی بادشاہوں کے طرز سلطنت اور مطلق العنانی سے وہ واقفیت بہم پہنچائی تھی کہ مشہور تھا کہ فن ملک داری میں جو دست گاہ اُسے ملی وہ کسی یونانی حاکم کو نصیب نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ پیری آنڈر یونان کے "سات عقلا" میں شمار ہوتا تھا اور دو ہزار شعر یا اخلاقی کہاوتیں اس سے منسوب تھیں جن میں حاکم و محکوم کے فرایض اور حقوق کو سمجھایا ہے اور آزادی اور جمہوریت کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ باایں ہمہ خود پیری آنڈر مطلق العنان رہا اور اپنے عہد میں باپ سے بھی زیادہ شخصیت کی شان دکھلائی، چنانچہ قلعہ کورنتھ کے سب سے اونچے حصّے پر ایک عالی شان محل اپنے واسطے تیار کرایا، اس کے گرد پہرے چوکی والے مقرر کئے اور ایشیائی بادشاہوں کی طرح مصاحبوں میں گھرا رہنے لگا۔ حالانکہ اُس کے باپ کپ سی لوس نے اس قسم کی نمود و نمایش کبھی جائز نہ رکھی تھی اور وہ جب تک زندہ رہا معمولی شہریوں کی مانند اپنے ہموطنوں میں رہتا سہتا تھا اور اُسے اپنے جانشین کی مثل شخصی امتیاز و حکومت قایم رکھنے کا اتنا خبط بھی نہ تھا کہ قوم کے کسی اور فرد کا دولتمند یا مقتدر ہونا گوارا نہ ہو یہ پیری آنڈر کی خصوصیتیں تھیں اور اس کا عذر یہ تھا کہ یہ جو کچھ میں کرتا ہوں حفاظت خود اختیاری اور محض مجبوری کی وجہ سے ہے ورنہ اصولاً مجھے شخصی بادشاہت سے طبعی اور ایسی ہی نفرت ہے جیسی کہ ہر معقول [illegible] کو ہونی چاہیئے۔

یہ عذر غلط ہو یا صحیح، استبداد کی تلخی میں اس سے کچھ کمی نہ آسکتی تھی اور نہ باآں ہمہ کر و فر پیری انڈر کے دل سے یہ خوف دُور ہوتا تھا کہ ملک میں آزادی کی روح پیدا ہوگئی تو میرا کہیں ٹھکانا نہ رہیگا۔ کورنتھ کے عوام اور اہل حرفہ سے تو اُسے زیادہ اندیشہ نہ تھا کیونکہ یہ طبقہ نسل ہا نسل سے بادشاہوں اور پھر امیروں کی غیر مشروط غلامی کرتا رہا تھا اور اسے ایک جابر کی نرم حکومت برداشت کرلینی چنداں دشوار نہ تھی۔ لیکن وہ گھرانے جن میں ایک دو پشت پہلے تک حکمرانی رہی تھی پیری آنڈر کی نظر میں کانٹے سے زیادہ کھٹکتے تھے اور وہ طرح طرح کی تدبیریں کرتا کہ ان میں آزادی اور یکجہتی سے کام کرنے کا جوش پیدا نہ ہوسکے۔ چنانچہ قانون بنایا تھا کہ ایسا کوئی جلسہ نہ ہو جس میں شرفا جمع ہوکر ملکی معاملات پر غور و بحث کرسکیں۔ یہاں تک کہ وہ عام دعوتیں بھی اسی ضمن میں ممنوع قرار دی تھیں جو ڈورئین حملہ آوروں کے وقت سے ان کا قومی دستور چلی آتی تھیں۔ اور اسی طرح فنون جنگ در کنار معمولی ورزشیں کرنے کی بھی نوجوان امیرزادوں کو اجازت نہ تھی۔ سب سے بدتر یہ کہ پیری آنڈر عجیب عجیب شیطانی طریقوں سے اُن میں نفاق ڈلواتا رہتا اور نت نئی تدبیریں ایجاد کرتا کہ جس سے ان میں باہم دشمنی اور بے اعتباری قائم رہے اور اُن میں مِل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہ ہو۔ پیری آنڈر کی تمنا یہ تھی کہ اس تمام علاقے کی رعایا نوکروں کی طرح اُس کی دست نگر اور تابع فرمان ہوجائے جیسا کہ ایشیائی بادشاہتوں میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس سے بے خبر تھا کہ غیر محدود قوت آدمی کو بہائم سے ملا دیتی ہے اور ایک مطلق العنان بادشاہ ہمیشہ اپنے جذبات کا غلام اور دنیا کا نہایت بدبخت انسان بن جاتا ہے۔ . . . ''

لیکن پیری آنڈر کی زندگی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس میں وہ علم و فضل کے دربار کا صدر نشین نظر آتا ہے۔ اس کی محفل شعرا اور اہل کمال کی مرجع عام ہے۔ صنعت و فن کا وہ سچا قدردان ہے اور مصوّر و صنّاع کا فیاض مُربّی۔ کورنتھ کی بحری تجارت اس کے

عہدِ حکومت میں بڑا فروغ پاتی ہے اور اپنے جانشینوں کے واسطے وہ ایک زبردست بڑا اور ایسا آراستہ ملک چھوڑ کر جاتا ہے جو تکلفات اور سامانِ زیست کی افراط میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔

پیریؔ انڈر کے بعد کورنتھ نے بھی سکیان کی طرح حکومتِ جابریہ سے نجات حاصل کی (۵۸۳ء ق م) اور وہاں امرا کی ایک مناسب اور معتدل حکومت قایم ہوئی جس میں بڑے بڑے ملکی کام ایک سینٹ یعنی مجلسِ اعلیٰ انجام دیتی تھی اور ادنیٰ طبقوں کے قومی معاملات میں حصہ لینے کی غرض سے ایک دوسری مجلسِ عوام تھی جسے تجویز و رائے زنی کے سوا نظم و نسق میں عملاً کوئی دخل نہ تھا۔ اخیر تک کورنتھ میں یہی نظامِ حکومت رہا اور اسی پر وہاں کے خاص و عام سب قانع رہے۔ اور چونکہ وہاں کے امرا میں جمہوریت یا کم سے کم انصاف و مساوات اور قانون کی پابندی کا مادہ تھا اس لئے یہی آئین صدیوں تک بخوبی نبھ گیا اور ادھر کورنتھ کی عیش دوست[۱] اور تجارت پیشہ آبادی کو بھی کسی ایسے ردّ و بدل کی ہوس نہ ہوئی جو ملکی انقلاب یا تلاطم کا باعث ہوتی۔

مگارا کورنتھ کے شمال میں مگارا کا علاقہ تھا جو ابتدا میں امرائے کورنتھ کے زیرِ تسلط رہا اور اُن سے مخلصی پائی تو خود اپنے امرا کا بندۂ مجبور بنا لیا گیا۔ مگر ان لوگوں کے ظلم و جبر نے بہت جلد عوام کو فساد پر آمادہ کر دیا اور غالباً (۶۲۰ء ق م) میں وہاں تھیاجنیز نے حکومتِ جابریہ کی بنیاد ڈالی۔ یہ وہ شخص ہے جو اتھینیز کے ساتھ اکثر مصروفِ جنگ رہا اور

---

[۱] دولت و عیش پسندی میں کورنتھ کو اُن دنوں وہی شہرت حاصل تھی جو آجکل پیرس یا لندن کی سرمایۂ امتیاز ہے۔ شاہدانِ بازاری کی وہاں وہ کثرت اور رسوخ تھا کہ دورِ قدیم کے نامور شاعر پنڈار نے کورنتھ کے اندرونی امن و اتحاد کو بھی انھی "عیش برسانے والی" دیویوں کا صدقہ حسن بتایا ہے۔ اور جس طرح اتھینیز میں ذوقِ سلیم اور اسپارٹہ میں جذبۂ وطنیت عورتوں کا بڑا وصف مانا جاتا تھا اسی طرح کورنتھ میں خوبصورتی اُن کی سب سے بڑی وجہ امتیاز سمجھی جاتی تھی ۱۲

جس نے اپنے ایتھنزی داماد کیلن کو وہاں کا حاکم جابر بھی بنانا چاہا تھا، ان کوششوں میں اُسے ناکامی ہوئی اور اندازاً ۵۸۵ ق م، میں خود تھیا جینیز اپنے شہر سے جبراً نکال دیا گیا۔ اس کے بعد جو حکومت میگارا میں قایم ہوئی ارسطو کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ جمہوریت سے مشابہ تھی اور اسی کے زمانے میں امرائے میگارا پر وہ وہ ظلم وستم ہوئے کہ ہر طرف لڑائیاں اور بدامنی پھیل گئی اور پھر کبھی وہاں حکومت خواص قایم ہوئی کبھی جمہوریت اور کبھی لانظمی

عام تبصرہ | ساتویں اور چھٹی قبل مسیح صدیوں میں یونانی ریاستوں کا بالعموم یہی حال تھا جس کے تین نمونے اوپر بیان ہوئے۔ حکومتِ جابریہ کی وبا ایشیائے کوچک کے آئی اونی شہروں سے شروع ہوئی تھی جہاں کے لوگوں کو ایشیائی بادشاہت اور مطلق العنانی سے زیادہ شناسائی حاصل تھی۔ مگر اس تحریک کو بڑی قوت حکومتِ خواص کی زیادتیوں سے پہنچی کہ ہر جگہ خاندانی امرا نے عوام الناس کو مویشی کی مثل محض ایک خدمتی مخلوق بنا رکھا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جابروں کو ہمیشہ عوام کی مدد سے اقتدار ملا اور آیندہ اپنی غرض کے لئے انھیں لازم ہوا کہ اسی دبے ہوئے طبقے کو ابھاریں۔ پس اس حد تک کہ انھوں نے مدعیانِ نسب کا زور توڑا اور یہ بیہودہ اوہام کہ "عوام حقوقِ انسانیت ومساوات کے مستحق نہیں ہیں" مٹائے، جابروں سے یقیناً ملک کو فائدہ پہنچا۔ اب سے پہلے خاص خاص مذہبی مراسم امرا سے مخصوص تھیں۔ عوام کا اُن میں کوئی حصّہ نہ ہوتا تھا اور وہ غالباً قدیم باشندے ہونے کی وجہ سے ایک علیحدہ گروہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن جابروں نے اُن کے لئے بڑے بڑے تہوار اور مذہبی میلے جاری کئے جن میں خاص وعام سب شریک ہوسکتے تھے۔ اور گو امرا ابھی تک اپنی رسمیں نباہے جاتے تھے بایںہمہ نئی مراسم پرستش نے ان کا امتیاز گھٹا دیا تھا اور تمام آبادی میں ہموطنی اور قومیت کا اتنا احساس ہو چلا تھا کہ جابروں کے بعد جب پھر حکومتِ خواص کا دَور ہوا یا جمہوریت کا، تو ہم اُن میں عام وخاص کی پہلی سی تفریق نہیں پاتے اور سب کو اپنے مشترک وطن کی محبت میں ہم خیال دیکھتے ہیں۔

یونان کو جابروں سے دوسرا فائدہ یہ پہنچا کہ اُن کے عہد میں شعر و صناعت کی گرم بازاری ہوئی، دُور دُور سے شعرا اور اہلِ ہنر اُن کے درباروں میں جمع ہوتے اور ان کے بنا نہادہ میلوں میں اپنا کمال دکھاتے تھے جس سے نہ صرف اہلِ شہر کے حُسنِ ذوق اور شوقِ منافست کو ترقی ہوتی بلکہ تماشائیوں کے ذریعے نئے نئے خیال اور صنّاعی کے اچھے اچھے نمونے بہت جلد اطرافِ ملک میں پھیل جاتے تھے جو اُس مشکل سفر کے زمانے میں ایک بڑی بات تھی۔

حکومتِ جابریہ کی بنیاد ڈالنے والے عام طور پر قابل اشخاص ہوتے تھے اور جب تک اُن میں خاص اوصاف نہ ہوں وہ کسی طرح سربرآوردہ اور مطلق العنان بادشاہ نہ بن سکتے تھے۔ لیکن اُن کے جانشین وارث جنھیں بادشاہت محض ترکے میں بے ہاتھ پاؤں ہلائے مل جاتی تھی یہ قابلیت نہ رکھتے تھے اور ان کا "پیدایشی شہزادہ" ہونا ہی اس بات کی دلیل تھا کہ وہ یا نکمّے نالایق ہوں گے یا سخت جابر، خودغرض اور اپنی قوّت بڑھانے کے آرزومند۔ اسی بنا پر وہ بہت جلد امرا کو اپنا دشمن بنا لیتے اور پھر خود ہی حکومت کے زور سے لوگوں کی ہمت اور آزاد خیالی کو مٹانے کے درپے ہو جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اُن کی خودپرستی کے ہم قدم ملک میں ظلم و ناانصافی کا زور بڑھتا اور رفتہ رفتہ یہ بادشاہ قوم کے لئے عذابِ عظیم بن جاتے تھے۔

یونان کے عوام الناس ان بیچ کے دنوں میں شخصی بادشاہت کی بُرائیاں ٹھیک ٹھیک نہ سمجھتے تھے اور چونکہ انھیں امرا کی غلامی میں صدیاں گزر چکی تھیں لہٰذا اُنکی اختیارات کا کئی کے پاس رہنا یا فردِ واحد کے ہاتھ میں منتقل ہو جانا ان کے لئے ایک سی بات تھی۔ البتہ آزادی کی قدر جاننے کا زمانہ قریب آگیا تھا اور ان کی بہت سی ریاستوں میں ہوائے عدل و مساوات کے صحت بخش جھونکے آنے لگے تھے۔

مگر پیلوپنی سس میں ایک ریاست ایسی تھی جسے جابروں کی حکومت سے دلی بیزاری تھی

اور جو اُن کی بیخ‌کنی میں امداد دینے کے لئے ہر وقت اور ہر کہیں مستعد رہتی تھی۔ اس سے ہماری مراد اسپارٹہ ہے۔ ڈورین امرا کی قوت توڑنا اور جابروں کا ادنیٰ طبقے اور قدیم آبادی کو اُبھارنا، اسپارٹہ کو بالطبع ناگوار تھا اور اُسے اندیشہ ہو گیا تھا کہ مبادا اُس کی ہیلوٹ رعایا میں بھی اسی قسم کی شورش پیدا ہو جائے اور خود اُس کی ڈورین حکومت کا تختہ اُلٹ دے۔ اسی لئے جب کبھی موقع ملا اُس نے حکومتِ جابریہ کی مخالفت کی اور جابجا اُن کے استیصال میں حصّہ لیا۔ اور اس سے ایک دوسرا فائدہ یہ اُٹھایا کہ اکثر ریاستیں اس کی احسان مند ہو گئیں اور وہ یونان میں سر برآوردہ مانا جانے لگا۔ خصوصاً پیلوپنی سس کے بہت سے شہر اس کے حلیف بن گئے اور لامرکزیت کے باوجود اس جزیرہ نما کا بیشتر حصّہ گویا ایک متحدہ سلطنت کی شکل اختیار کرنے لگا جس کی عنانِ حکومت اہلِ اسپارٹہ کے طاقتور ہاتھوں میں تھی۔

نوآبادیاں اس عہدِ انقلابات میں کہ ہر کہیں حکومت اُلٹ پُلٹ اور شہروں میں ہل چل ہو رہی تھی، بہت سے لوگوں کو ترکِ وطن کی خواہش پیدا ہوئی اور اُن کی جماعتیں ہجرت کر کے بحرِ روم کے ایسے ساحلی مقامات پر جا بسیں جہاں پہلے سے اُن کی آمد رفت یا کسی قدر واقفیت تھی؛ وطنی مخمصوں سے چھوٹنے کے علاوہ اس میں آبادکاروں کو بڑا فائدہ یہ تھا کہ سرسبز و شاداب زمینیں کثرت سے میسّر آجاتی تھیں اور دوسرے یہاں انھیں ہر قسم کی آزادیاں حاصل ہوتی تھیں کہ حکومت کو جس طرز پر چاہیں چلائیں۔ نوآبادی کا وطنِ اصلی کے ماتحت رہنا ضروری نہ تھا۔ نہ بہ آسانی ممکن تھا البتہ یہ نوآبادے اپنے جنم بھوم سے عزیزانہ تعلقات قایم رکھتے تھے اور مذہبی طور پر بھی انھیں بتوں کی جو اہلِ وطن کے معبود تھے پرستش کرتے تھے اسی طرح بعض اور مراسم کی یہ نوآبادیاں کسی نہ کسی حد تک پابند ہوتی تھیں۔

ہم ڈورین حملہ آوروں کے پیلوپنی سس میں آنے کے وقت بھی اسی قسم کی ہل چل دیکھ چکے ہیں کہ کسی طرح یہاں کے آئی اونی اکائی اور خود ڈورین باشندے اُٹھ اُٹھ کر

ایشیائے کوچک اور قریب کے جزیروں میں جا بسے تھے لیکن اب ہمیں یونانی مستعمرات میں ایک نمایاں فرق یہ نظر آتا ہے کہ چار سو برس میں ان کے فنِ جہازرانی اور اسی نسبت سے بحری اولوالعزمی نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ وہ قریبی جزائر و سواحل کو چھوڑ کر فرانس (غالیہ) اور اندلس (ہسپانیہ) تک پہنچتے ہیں اور ان کی ایک بستی بحرِ اسود کے شمال میں آباد ہوتی ہے تو دوسری بحرِ روم کے انتہائے مغرب میں۔ حالانکہ نہ صرف درازیِ مسافت کے خطرے بلکہ سب سے بڑھکر اہلِ قرطاجنہ کی رقابت ان کے سنگ راہ تھی اور غربی بحر روم میں کسی طرح روادار نہ ہوتی تھی کہ کنعانی تاجروں کی بجائے یونانی آبادکاروں کے وہاں پاؤں جمیں

قرطاجنہ[۱] عصرِ قدیم کا یہ مشہور و معروف شہر افریقی ساحل پر اُس مقام کے قریب ہی آباد تھا جہاں کہ اب شہر ٹیونس واقع ہے۔ اپنی اور نوآبادیوں کی طرح اسے بھی چھٹی صدی قبل مسیح کے بالکل آغاز میں فنیقی یا کنعانی تاجروں نے بسایا تھا، جن کے تجارتی اور بحری تفوق کا ہم کچھ مختصر حال پہلے پڑھ چکے ہیں۔ مگر قرطاجنہ کو بحرِ روم میں ایسی اچھی اور مرکزی جائے وقوع ملنے کے باعث جلد ہی وہ فروغ حاصل ہوا کہ اس قوم کی تمام مستعمرات اُسکے زیرِ اقتدار آگئیں اور وہ ایک مستقل اور زبردست سلطنت بن گیا۔ مغرب میں شمالی افریقہ کا نصف ساحل اندلس کے مشرقی کنارے اور جزائر مالٹا، گوزو (ملیطہ اور غولوس) اُس کے تسلط میں تھے اور ادھر صقلیہ اور جنوبی اطالیہ کے لئے وہ یونانیوں سے اور پھر سالہا سال اہلِ رومہ سے دست و گریبان رہا، جن میں بعض کشمکشوں کا حال ہم آگے پڑھیں گے۔ لیکن اس موقع پر جرمن مؤرخ بیلاخ کا یہ قول ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ یونانی اور قرطاجنی مستعمرات میں ایک اصولی فرق یہ تھا کہ اہلِ یونان بالعموم زرعی نوآبادیاں بساتے تھے جہاں کی آب و ہوا اور زمینی پیداوار اچھی ہو۔ اور اہلِ قرطاجنہ کی بستیاں محض تجارتی ہوتی تھیں۔ اسی لئے وہ اندرونِ ملک میں پھیلنا نہ چاہتے بلکہ

---

[۱] فنیقی زبان میں "کارتاژ" علِ جدید کو کہتے تھے ۱۲

ساحل اور عمدہ بندرگاہوں پر نظر رکھتے تھے۔ پس جب وقت جنوبی اطالیہ اور صقلیہ کے قبضے کے واسطے ان قوموں میں لڑائی چھڑی تو آخر میں اہلِ یونان ہی کا پلّہ بھاری نکلا۔ ساحل کے چند قرطاجنی شہروں کے سوا تمام اندرونی علاقوں پر یونانی پھیل گئے اور عرصہ تک یہ حصۂ ملک بھی انھیں کے تسلط کی وجہ سے "مہا یونان" کے نام سے موسوم رہا۔

باب چہارم

قومِ آئی اونین اور ایٹی کا (۵۰۰ ق م تک)

"———— ایتھنز!

یونان کی آنکھوں کی پُتلی، ماں صنعت اور فصاحت کی!!" (ملٹن)

ہیلاس کے وسط مشرقی ساحل کی طرف زمین کا ایک قطعہ تھوڑی دُور تک بحرِ ایجین میں چلا جاتا ہی جسے بعضوں نے بگڑے ہوئے مثلث سے تشبیہ دی ہی۔ اس کا طول ساٹھ میل سے اور عرض چوبیں میل سے کسی جگہ زیادہ نہیں اور اس اعتبار سے وہ رقبے میں ہمارے ملک کی کسی چھوٹی سے چھوٹی قسمت کے بھی مشکل سے برابر ہوگا۔ اگرچہ عظمت و شہرت میں وہ ساری قدیم دنیا سے بڑا ہی!

نام اس خوش نصیب جزیرہ نما کا ایٹکا ہی اور اسی کے وسط میں مدینۃ الحکما شہر "ایثنی" واقع تھا جسے ہم انگریزوں کی، اور وہ فرانسیسیوں کی، تقلید میں ایتھنز کہنے لگے ہیں۔ اس کی آب و ہوا صحت بخش معتدل مگر زمین سنگستانی اور غیر شاداب ہی۔ مغرب کی جانب الیوس اور لے فی سس دو پہاڑی نالے بہتے ہیں جن کی روانی اور صفائی پر شعرائے ایتھنز کو بڑا فخر تھا اور کوثر و سلسبیل سے بڑھ کر اُن کی تعریف میں زمین آسمان کے قُلابے ملاتے۔ حالانکہ موسمِ طغیانی کے علاوہ ان میں اکثر جگہ سے پانی ٹوٹ کر فقط بدّھے رہ جاتے تھے اسی قسم کا غلو انھیں اپنی پہاڑیوں کی تعریف میں تھا۔ کوہِ سِتھراَن اور پارنس کے سوا جو بیوشیہ اور ایٹکا میں حد فاصل بناتے ہیں دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیمٹس اور پین ٹی کس ایتھنز کے شمال اور مشرق میں واقع تھیں۔ مگر اہل ایتھنز کہتے تھے کہ ہر چہ بقامت کہتر بہ قیمت بہتر

عہد شجاعت کا نامور سُورما ہرقلیس ایشیا چلا گیا تھا اور وہ خونی راہ زن اور اشرار جنھیں اُس کے بازوئے قوی نے مغلوب و مقہور کر دیا تھا اب پھر آمادۂ فساد تھے۔ تھی سی اس ہرقل کا رشتے دار ہوتا تھا اور لڑکپن میں اُس کی بہادریاں سُن سُن کر خود بھی اسی کے نقش قدم پر چلنے کا مشتاق تھا۔ چنانچہ جب اس کے نانا اور ماں نے اسے غیر محفوظ راستے ہو کر ایتھنز جانے سے روکا اور سمندری راہ اختیار کرنے کی صلاح دی تو اُس نے ہرقل کی مثال پیش کی اور اسی کی تقلید میں وہ خطرناک راستہ پسند کیا جس کی منزلیں رستم کی ہفت خواں کی طرح مخدوش اور کٹھن تھیں۔ مگر تھی سی اس کی شجاعت اور قوت سب مشکلات پر غالب آئی اور وہ بخیر و عافیت ایتھنز پہنچ گیا جہاں ایک عام دعوت میں ایجیس نے اپنی نشانیاں دیکھ کر اُسے پہچان لیا اور بہت جلد اعلان کر دیا کہ تھی سی اس میرا بیٹا اور ولی عہد حکومت ہے۔ اس واقعہ پر ایجیس کے بھتیجے جو لاولد چچا کے بعد سلطنت کو اپنا ورثہ سمجھے ہوئے تھے، نہایت ناراض ہوئے اور جب تک انھیں مقابلے میں شکست نہ ہوئی چین سے نہ بیٹھے۔ لیکن عوام الناس تھی سی اس کی شجاعت و ناموری کے مدّاح اور اُس کے انتخاب پر دل سے خوش تھے۔ اور جب اُس نے اپنے تئیں خطرے میں ڈالا اور خود اسیر ہو کر قریطش چلا گیا تو ایتھنز میں کوئی نہ تھا جو اس کی وطن پرستی کا دل دادہ نہ ہو گیا ہو۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ بہت عرصے پہلے جب مینوس شاہِ قریطش کے مقابلے میں اہل ایتھنز کو سخت شکست ہوئی تو انھیں یہ معاہدہ کرنا پڑا تھا کہ ہر سال سات نوجوان لڑکے اور اتنی ہی لڑکیاں بطور خراج فتحمندوں کو بھیجا کریں گے۔ چنانچہ تھی سی اس کے ایتھنز پہنچنے کے بعد بھی یہی موقع پیش آیا اور قریطش کے سفیر اپنا خراج وصول کرنے آ پہنچے۔ اس وقت ایک روایت کے بموجب لوگوں میں ایجیس کے خلاف بڑی بددلی پیدا ہوئی کہ اُس کی نالایقی سے اہل ملک کو یہ تاوان بھرنا پڑتا ہے حالانکہ خود وہ اس مصیبت سے متاثر نہیں ہوتا۔ ان شکایتوں کو سُن کر تھی سی اس نے اپنے تئیں جانے والوں میں پیش کیا اور ہرچند ایجیس نے اُسے روکا کہ قریطش جانا گویا

موت کے مُنہ میں گھُستا ہی کیونکہ وہاں قیدیوں کو ایک بھُول بھلیاں میں ڈال دیتے تھے اور یا ایک خوفناک بلا منوتُور سے ہلاک کرا دیتے تھے جو مشہور تھا کہ "ایک انسان چہرہ سانڈ" تھی مگر تھی سی اس نے کسی خطرے کو نہ مانا اور قریطش جا کے منوتُور کو مارا اور شاہِ قریطش کی بیٹی (اریاڈن) بیاہ کر مظفر و منصور مراجعت کی۔

ان روایتوں میں معلوم نہیں کتنا سچ ہی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تھی سی اس کا ازخود قریطش جانا ہی شجاعت و ایثار کا ایسا نمونہ تھا جس نے اہلِ ایتھنز کو اس کا گرویدہ بنا دیا اور عجب نہیں جو شاہِ قریطش پر بھی اسی واقعہ کا اتنا اثر ہوا ہو کہ اُس نے ازخود اپنی بیٹی ایتھنز کے جواں مرد شہزادے سے بیاہ دی اور آیندہ سے خراج لینے کی رسم کو منسوخ کر دیا ہو۔ اصلیت جو کچھ ہو یہ یقینی ہے کہ تھی سی اس کی اپنے ہموطنوں کے ساتھ مراجعت اُس کی بڑی ناموری کا باعث ہوئی اور اس واقعے کی یادگار میں کئی تہواروں کی بنیاد پڑی جو عیسائیت کے آنے تک ایتھنز میں رائج تھے۔ وہ کشتی بھی جس میں یہ جماعت قریطش سے آئی تھی ایسی متبرک سمجھی جاتی تھی کہ صدیوں تک اُسے محفوظ رکھا گیا اور حکیم افلاطون کے زمانے میں اُس کی اتنی دفعہ مرمت ہو چکی تھی کہ سوفسطائیوں میں یہ بھی ایک سخت مناظرہ طلب مسئلہ بن گیا تھا کہ یہ کشتی وہی رہی جس میں تھی سی اس بیٹھ کر آیا تھا، یا اس کی اصلیت بدل گئی؟

القصہ جب ایجیس کے بعد تھی سی اس بادشاہ ہوا تو اپنی ہر دلعزیزی کی بنا پر اس نے اپنے وطن میں اُس اصلاح کا بیڑا اُٹھایا جو قدیم ایتھنز کی آیندہ عظمت و شہرت کا مبدا اور موجب ہوئی۔ نیز تمام ایٹی کا کو (جو پہلے بارہ حصّوں میں منقسم تھا) ایک حکومتِ قومی کے ماتحت متحد کر دینے سے اُس نے لفظ قومیت میں عملاً ایک ایسی وسعت پیدا کر دی جو اس وقت تک انسان کے تصوّر میں نہ آئی تھی۔ اس عہدِ قدیم میں یونانیوں کا تمدن سب سے بہتر اور بااصول مانا گیا ہی لیکن درحقیقت وہ محض "شہری تمدن" تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک خود قوم

اُس آزاد جماعت کا نام تھا جو کسی شہر کی چار دیواری میں آباد ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب تھی سی اس نے سارے ملک کے باشندوں کو ایک قوم، یعنی ایک حکومت قومی کے افراد بنانا چاہا تو بھی شہر، ملک میں جذب نہ ہوا بلکہ خود ملک شہر میں ضم ہو گیا اور حکومت اٹی کا حکومت ایتھنز کے نام سے موسوم ہوئی اور اسی طرح وہاں کے لوگ بھی بہ لحاظ قومیت ایتھنزی کہلائے، تھی سی اس کے مُلکی نظام کا وہ نام نہ پانا جس کا مستحق وہ تھا، درحقیقت اسی بات کی بالواسطہ شہادت ہے کہ اُس زمانے میں وہ بالکل ایک نئی چیز تھا۔

نظامِ حکومت میں ایسی اصولی تبدیلی تھی سی اس کا سب سے شاندار کارنامہ ہے جس میں سخت دقتیں پیش آئی تھیں لیکن اُس نے خود اپنے بعض شاہی اختیارات ہاتھ سے دینے گوارا کئے اور یہ پسند نہ کیا کہ تمام آبادی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم رہے۔ باقی اس کے اور واقعات زندگی جن میں اُس کی فوق الانسان قوت اور نیز بیہودہ حرکتوں کا ذکر مروی ہے یہاں لکھنے فضول ہیں البتہ یہ یاد دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تھی سی اس ماقبل تاریخ زمانے کا آدمی ہے اور بعض جدید اہل تحقیق کو حسب معمول اس کے وجود سے بھی انکار ہے۔ لیکن پلوٹارک نے اس کی سوانح عمری کو اپنی کتاب السیر میں درج کیا ہے اور تمام روایات و قراین سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ایتھنز کے پُرانے تمدن کو بطرز نو ڈھالنے اور بنانے میں سب سے بڑا حصہ اتھرا کے بیٹے تھی سی اس کا تھا۔

۲۔ زمانۂ تاریخی

ماقبل تاریخ زمانے کے اس روشن باب کے بعد ایٹی کا میں خاموشی اور اندھیر انظر آتا ہے اور اس کے حالات کے متعلق روایتیں اتنی کم اور دُھندلی میسر آتی ہیں کہ ان کی گلجھٹیوں سے تاریخی سچائی کو نکالنا کوہ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ ناگوار ہے۔ مختصر طور پر یہ لکھ دینا کافی ہوگا کہ تھی سی اس کے بعد چند صدی میں شخصی بادشاہت کی بیاں بھی دہی

کساد بازاری ہوئی جیسی کہ پیلو پنی سس کی ریاستوں میں اور بتدریج ایتھنز کی حکومت بھی خواص گروہوں کے ہاتھ میں آگئی جو اگرچہ ڈوریین فتحمندوں کی مثل غیر قوم کے لوگ نہ تھے پھر بھی عوام الناس سے اپنے تئیں علیحدہ اور ممتاز سمجھتے اور حکومت و قانون سازی کو اپنا مخصوص ورثہ جانتے تھے۔ اوّل اوّل انھوں نے بادشاہوں سے صرف مذہبی اختیارات لئے تھے اور اسی وجہ سے وہ بے سی لوس کے بجائے آرکن کہلانے لگا تھا۔ پہلا لفظ دینی امام اور دنیاوی حاکم دونوں کے مشترک معنی پر حاوی ہے جیسے مسلمانوں میں خلیفہ کا لفظ سمجھا جانے لگا تھا۔ مگر آرکن محض دنیاوی حاکم کو کہیں گے جو ابتدا میں شخصی بادشاہ کی مثل موروثی ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ دس سال کے لئے صرف ایک میعادی عہدے دار رہ گیا۔ پھر (۶۸۳ ق م) سب سے بڑی اور اصولی تبدیلی یہ ہوئی کہ ایک کے بجائے نو آرکن مقرر کئے گئے جو سال بھر ہی کے بعد اپنے عہدے سے علیحدہ ہو جاتے اور نیا انتخاب عمل میں آتا یہ گویا اس نظامِ حکومت کا آغاز ہے جسے حکومتِ خواص (اولی گارکی) کے نام سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ عہدہ آرکنی کا استحقاق اور انتخاب دونوں طبقہ اعلیٰ کے حقوق امتیازی تھے عوام کو اس میں کچھ دخل نہ تھا، مگر یہی وہ طرزِ حکومت ہے جس کے زمانۂ قیام سے ایتھنز کا تاریخی عہد شروع ہوتا ہے۔

خاندانی امرا ساتویں صدی قبل مسیح کی اس پہلی بیسی (یعنی ۷۰۰ تا ۶۸۰ ق م) میں ایٹی کا کی آبادی تین طبقوں میں منقسم نظر آتی ہے: اُمرا (یو پٹ رِڈی)، کسان (جیو موری) اور مزدور (ڈمی اورگی)، ان میں پہلے اور مقتدر طبقے کی کئی شاخیں یا قبیلے تھے جن کا دعویٰ تھا کہ وہ نیم دیوتا سورماؤں کی اولاد سے ایک علیحدہ نسل کے لوگ ہیں۔ انھی میں جو قبیلہ زیادہ طاقتور اور کثیر الافراد ہو جاتا سلطنت پر اسی کا غلبہ ہوتا، اور مجموعی طور پر (زمانہ تاریخی کے شروع میں) مراسمِ مذہبی اور حکومت دنیاوی انھی امرا کے قبضے میں تھی اور ادنیٰ طبقہ تمام حقوقِ سلطنت سے محروم تھا۔ سب سے بڑی آفت یہ تھی کہ مظلوم عوام کو دادرسی کا کوئی قابلِ اطمینان وسیلہ نہ ملتا تھا۔ کیونکہ اوّل تو انصاف کرنے والے وہی طبقہ اعلیٰ کے لوگ ہوتے تھے

دوسرے کوئی تحریری مجموعہ قوانین نہ تھا جسکی بنیاد پر انصاف کی طلب یا سزا کا فیصلہ کیا جائے۔

بعض اصول قانون ضرور موجود تھے جو سینہ بہ سینہ امرا میں ورثہ کے بطور منتقل ہوجاتے لیکن غریبوں کی شکایت یہ تھی کہ اُن کے میعادی حاکم یعنی آرکن، اکثر اوقات کسی اصول کی پروا نہیں کرتے اور اپنے دوستوں کی طرفداری یا حکومت دکھانے کے شوق میں عوام کا گلا کاٹتے ہیں۔

قوانین ڈریکو

غرض بڑی جد وجہد کے بعد یہ طے پایا کہ ڈریکو نامی، شرفائے شہر میں سے ایک شخص، قوانین کو قید تحریر میں لے آئے تاکہ سب کو اُن سے واقفیت ہوجائے اور اسی مجموعے کے مطابق انصاف کیا اور کرایا جاسکے (سنہ ۶۲۴ ق م) - یاد رکھنا چاہیے کہ ڈریکو نے خود کوئی قانون نہ بنایا تھا بلکہ اُنہی اصول کے بموجب، جن پر اس کی وطنی عدالتیں عامل تھیں، اُس نے مروّجہ قوانین اور جرائم کی سزائیں ایک جگہ ترتیب کے ساتھ لکھدی تھیں، مگر اُن کی سختی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معمولی بدمعاشی اور اچکے پن کے لیئے بھی ان قوانین میں قتل کی سزا مقرر کی تھی۔ اور اسی بنا پر جب ڈریکو سے دریافت کیا گیا کہ چھوٹے چھوٹے جرائم کی وہی سزا کیوں ہے جو بڑے سے بڑے جرم کی رکھی گئی، تو اُس نے یہ منطقی جواب دیا کہ "چھوٹے جرم اسی قابل ہیں کہ ان میں سزائے موت دیجائے لیکن سنگین جرائم کے معاملے میں مجبوری یہ تھی کہ موت سے زیادہ شدید کوئی سزا ذہن میں نہ آئی"! اس لطیفے سے اُس عہد کے اصول قانون کا کچھ تصور ہوسکتا ہے اور انہیں سختیوں کے باعث ڈریکو اور اس کا مجموعہ قوانین آج تک بدنام اور ضرب المثل ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اُس دور وحشت وجہل میں عام طور پر مقنن سنگین سزاؤں کو اصلاح اخلاق کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے اور غریب ڈریکو تو واضع قوانین نہیں، محض جامع قوانین تھا!

فتنہ کیلن | اس وقت تک ایتھنز میں ادنیٰ طبقہ امرا کے صرف طرزِ عمل کا شاکی تھا لیکن جدید اہلِ تحقیق کا قیاس ہے کہ جب قوانین ڈریکو شائع ہوئے تو خود اصول قانون میں ظلم اور بے انصافی نظر آئی اور اُن میں اُمرا کے خلاف زیادہ بددلی پیدا ہوئی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ لوگوں میں شورش موجود تھی اور اسی سے خود غرض کیلن نے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ یہ شخص مگارا کے جابر تھیاجینز کا داماد اور ایتھنز کے نہایت دولتمند خاندان سے تھا اور خسر کی ریس اور رشہ سے اپنے وطن میں بھی حکومت جابر یہ قائم کرنے کا آرزومند تھا۔ لوگوں کو اُمرا سے ناراض دیکھکر اُس نے ۶۱۳ ق م میں یکایک ایتھنز کے قلعے پر قبضہ کرلیا اور یقین رکھتا تھا کہ میرا ساتھ دینے کے خیال سے نہ سہی، کم سے کم اُمرا کی مخالفت میں عوام الناس ضرور اُٹھ کھڑے ہونگے۔ لیکن اس کا یقین غلط نکلا اور حکام وقت نے اسے قلعے میں محصور کرلیا۔ کیلن نے اس وقت بہ مشکل بھاگ کر جان بچائی لیکن اسکے ساتھی نہ نکل سکے اور جب بھوک سے نیم جان ہوئے تو قلعے کے مندر میں گھُس بیٹھے اور دیوتاؤں کی پناہ لی۔ محاصر فوج کا افسرِ اعلیٰ مگاکلیز تھا اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر باغی مندر سے باہر آجائینگے تو انکی جان بخش دی جائیگی۔ اس قول پر بھی پناہ گزینوں نے ایک ڈورا دیوی کے بُت سے باندھا اور دوسرا سرا خود ہاتھ میں لیئے باہر نکلے۔ مشہور ہے کہ تھوڑی دور چلکر یہ ڈورا ٹوٹ گیا اور اُس وقت مگاکلیز نے اس عذر پر کہ دیوی نے ان کی پناہ سے قطع تعلق کرلیا ہے، تمام باغیوں کو قتل کرادیا۔ مگر اس فعل میں بدعہدی کے علاوہ توہین مذہبی کا پہلو بھی مضمر تھا اور عوام الناس، جو معلوم ہوتا ہے کیلن کے مقاصد سے کچھ نہ کچھ ہمدردی رکھتے تھے، اس حرکت پر نہایت برافروختہ ہوئے۔ اُنھوں نے بہ آہنگ بلند مگاکلیز اور اس کے تمام خاندان کو سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ اُن کے عقیدے میں یہ گناہ اتنا سخت تھا کہ اگر مجرم اور اس کے تمام اعزا سزا نہ پائیں تو اس کا وبال قوم پر پڑتا، مجموعی طور

امرا (یا مگاکلیس) کے طرفدار تھے اور جانتے تھے کہ اُس نے درحقیقت حکومت خواص کی بڑی خدمت انجام دی ہے یعنی کیلن کے ساتھیوں کا نہیں، بلکہ امرا کے دشمنوں کا استیصال کیا ہے۔ غرض سالہا سال تک یہی قضیہ رہا اور عوام الناس روز بروز زیادہ مخالف اور قوی ہوتے گئے۔ کیونکہ کمزور جماعتیں ہمیشہ مخالفت اور شورش جاری رکھنے سے قوت حاصل کرتی ہیں اور اُن میں اتحاد عمل کی صلاحیت اور زور آتا جاتا ہے۔

سولن (سنہ ۶۳۸ تا ۵۵۹ ق م) اس ناگوار نزاع کی اصلاح کے واسطے امرا اور طبقۂ عوام دونوں نے سولن کو منتخب کیا جو ایک دانشمند وطن پرست اور خاندان کے اعتبار سے طبقۂ اعلیٰ کا فرد تھا لیکن آزاد خیالی اور حق پسندی کے لحاظ سے عوام الناس کا سچا ہمدرد مانا جاتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسی کی کوشش سے مگاکلیس کے اہل خاندان عدالت میں آنے پر تیار ہو گئے تھے۔ عدالت نے انہیں مجرم قرار دیا اور جلاوطنی کی سزا دی جس نے عوام الناس کو ایک حد تک مطمئن کر دیا تھا اور اسی لیے وہ اب آمادہ تھے کہ سولن کو ملک کی عام اصلاح اور نئے قوانین بنانے کا پورا اختیار دیدیا جائے، اُمرا بھی اس پر رضامند ہو گئے تھے کیونکہ اُن کے عاقبت اندیش افراد اچھی طرح جانتے تھے کہ عوام کی مخالفت محض کیلن کے اغوا سے نہیں پیدا ہوئی تھی بلکہ اُس کے اسباب زیادہ گہرے تھے اور اس کا تدارک نہ کیا گیا تو آیندہ حکومتِ خواص کو قائم رکھنا محال ہو جائیگا۔ المختصر سولن کثرت رائے سے آرکن منتخب ہوا اور سب سے پہلے اُس نے اہل وطن کی اندوہناک مالی حالت پر توجہ مبذول کی کہ شکستہ حالی اور افلاس ہی قوموں کی اکثر خرابیوں کی جڑ ہے۔

اصل یہ ہے کہ اُن دنوں اٹیکا پر سب سے بڑی بلا جو مسلط تھی وہ سودی قرضے تھے جن میں غریب کسانوں کا بال بال بندھا ہوا تھا۔ بہت سی زمینیں انہیں قرضوں میں رہن پڑی تھیں اور جابجا کھیتوں میں "سنگ کفالت" نصب نظر آتے تھے جن پر اصل وسود

کی مقدار اور قرض خواہوں کے نام کندہ ہوتے تھے اور جو اس قطعے کے مکفول ہونے کی علامت تھی۔ مگر ایک ہی مرتبہ قرضہ لینے کے بعد سود در سود کے چکر سے بدنصیب کسانوں کا نکلنا بالعموم محال ہو جاتا تھا اور رفتہ رفتہ اُن کی ساری آمدنی بھی سود کی ادائیگی کو کافی نہ ہوتی تھی۔ اس وقت وہ زمین کے بجائے نام مالک ور نہ درحقیقت قرضخواہ کے بے بس مزدور بن جاتے اور اُن کی معاش بھی محض قرضخواہ کی مہربانی پر منحصر رہ جاتی تھی۔ ان سے بھی بدتر حال مزدوری پیشہ قرضداروں کا سمجھنا چاہیے جن کے پاس کفالت کے لیے بھی کوئی ملک نہ تھی اور جو کسانوں کی نسبت جلد اور زیادہ آسانی سے قرضخواہ کے قبضے میں آجاتے اور اپنے ''جسم و جان'' کو رہن رکھنے کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔ یہ گویا غلامی کی ناپاک ترین قسم تھی جس میں ''شخص مرہون'' کے بال بچے بھی مرتہن کی ملک بن جاتے اور وہ جب چاہے اُنھیں فروخت کر ڈالتا تھا۔ ان حالات کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک سے رفتہ رفتہ آزاد کسانوں کا طبقہ نابود ہوتا جاتا تھا۔ بعض کو قرضخواہوں نے باہر والوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ بعض منہ چھپا کر خود وطن سے نکل گئے تھے اور اکثر حصہ جو اپنے دولت مند قرضخواہوں کی خدمت کے واسطے باقی تھا وہ ہیلوٹوں کی طرح غلامانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔

اصلاحی تدابیر: (۱) ایسی افسوسناک تباہی سے ملک کو بچانا کچھ آسان کام نہ تھا اور اس مقصد کے حصول میں سولن کو چار و ناچار غیر معمولی کارروائیاں کرنی پڑیں۔ اول تو اس نے حکم دیا کہ چاندی کا سکہ آیندہ سے وزن میں کم اور قیمت قانونی میں بدستور رکھا جائے۔ اس حد تک کہ ۱۰۰ جدید سکے پُرانے ۷۳ سکوں کے ہموزن ہوں اور اسی جدید سکے سے بلالحاظ کمی وزن، پچھلے قرضے ادا کیے جائیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک قدیم ۱۰۰ درہم کا مقروض جدید سکوں میں یہی رقم ادا کریگا تو درحقیقت اُسے ۱۰۰ کی بجائے صرف ۷۳ درہم دینے ہونگے اور اس طرح اُس کے قرض میں سے ۲۷ فیصدی رقم کی تخفیف ہو جائیگی۔

(۲) دوسرے جو کسان سرکار کے مقروض تھے انہیں سولن نے بالکل معاف اور

سبکدوش کر دیا کہ آیندہ سے جدید سکّے کے مطابق حساب شروع کریں۔

(۳) تیسرے غیر ملکوں سے اکثر اہل ایتھنز جو قرض کی وجہ سے غلام بنا کر بیچ دیئے گئے تھے یا خود بھاگ گئے تھے، واپس بلوائے گئے اور انھیں از سر نو زندگی یعنی آزادی دی گئی اور آیندہ کے لیے یہ قانون بنا دیا گیا کہ ایتھنز کا کوئی شہری قرض کے باعث دوسرے کا غلام نہ بنایا جا سکے گا۔ اس طرح ملک پر سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا اور وہ ہیبت انگیز سنگ کفالت بھی جو ہر کہیں گڑے ہوئے تھے معدوم ہو گئے۔

سولن کا نظام حکومت | اس کے بعد سولن ایک نیا نظام اور نئے قوانین بنانے پر متوجہ ہوا کہ عوام الناس کی واجبی شکایتوں کو بحدّ مناسب رفع کرے اور ڈریکو کے شدید قوانین کے بجائے ایک معتدل مجموعہ ترتیب دے۔

سلطنت میں اب تک جو کچھ دخل تھا، خاندانی اُمرا کا تھا۔ سولن پہلا شخص ہے جس نے یہ ناواجب اور غیر قدرتی شرط توڑ کر تمام آزاد شہریوں کو حکومت میں حصہ دار بنایا، اور مجلس عوام کو جس کا عرصے سے عدم وجود برابر ہو گیا تھا، از سر نو قوت و اختیارات دیئے اور قوانین کی منظوری، آرکنوں کا انتخاب اور عمّال سے محاسبے کا حق، اسی جماعت کے لیے خاص کر دیا جس میں ہر آزاد باشندہ ایٹکا بلا لحاظ خاندان رائے دینے کا منصب رکھتا تھا۔ مگر اس خیال سے کہ اتنی بڑی جماعت قوانین کی تجویز و ترتیب اور بحث و مباحثے میں بہت زیادہ وقت لگائے گی اُس نے یہ مراتب ابتدائی ایک کونسل (بولہ) کے ہاتھ میں دیئے جنھیں مجلس عوام ہر سال اپنے میں سے منتخب کر لیتی تھی اور جو تعداد میں چار سو افراد کی چیدہ جماعت ہوتی تھی۔

حکومت متاعیہ | سولن نے قدیم خاندانوں کا اثر زائل کرنے کی غرض سے اپنی قوم کی ایک نئی تقسیم بھی کی۔ یعنی تمام باشندوں کے مال و املاک کے مطابق چار طبقے قائم کیے ان میں جو سب سے دولتمند (پنٹاکوسی ادمی ڈمنی) طبقہ قرار دیا گیا تھا اس پر مصارف

سلطنت کا بھی سب سے زیادہ بار تھا اور اس کے عوض میں اعلیٰ حکام یعنی آرکن صرف اسی طبقے سے منتخب ہو سکتے تھے۔ نیچے کے دو طبقوں سے بھی علیٰ قدر مراتب سرکاری مالیہ وصول کیا جاتا تھا اور جنگ کے وقت اُنھیں اپنے اپنے گھوڑے اور اسلحہ خود فراہم کرنے پڑتے تھے۔ مگر چوتھا اور سب سے ادنیٰ طبقہ ان تمام ذمہ داریوں سے آزاد تھا اور گو آرکنی یا بولہ میں رکنیت کا استحقاق بھی نہ رکھتا تھا تاہم مجلس عوام میں رائے دینے اور عدالتوں میں جوری بننے کا اُسے حق حاصل تھا اور یہ بھی اُس عہد جبر میں کچھ کم بات نہ تھی۔ کیونکہ مقتدر امرا مفلس عوام کو بالکل حیوان سمجھتے تھے اور ابھی تک دنیا میں اصول مساوات وانصاف کو کسی نے نہ جانا تھا۔ پس یہ سولن کا نہ صرف قدیم ایتھنز پر بلکہ عالم تمدن پر احسان عظیم ہے کہ اُسی نے صحیح معنوں میں قومی حکومت کا نقش اوّل تیار کیا اور اُسی کے ساتھ وقتی حالات کو بھی پیش نظر رکھا کہ مبادا اہل ثروت واقتدار ایسے ناراض ہو جائیں کہ ان معتدل مگر اصولی اصلاحات کا عمل میں آنا محال ہو۔ باقی دولت و ثروت کی جو اُس نے اتنی رعایت رکھی وہ اُس عام جہالت کے زمانے میں کچھ زیادہ بے اصول نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اُن دنوں ہر شخص کو دماغی اور اخلاقی تربیت حاصل کرنے کے ذرائع میسر نہ تھے۔ پس امرا یا اہل دولت ہی سولن کے نزدیک یہ اہلیت رکھتے تھے کہ سلطنت کے اعلیٰ عہدے اور بڑی بڑی ذمہ داریوں کے کام اُن کو دیئے جائیں؛

البتہ حسب نسب کے نامعقول معیار کو اُس نے مٹا دیا تھا اور اب ہر شخص کو موقع تھا کہ وہ دولت حاصل کر کے اونچے طبقے اور اعلیٰ مناصب کا حقدار بن جائے یہی وہ طرز سلطنت ہے جسے اہل یونان (ٹموک ریسی) حکومت متاعیہ کہتے تھے، یعنی ایسی حکومت جس میں لوگوں کو حسب مدارج املاک و دولت، حقوق حاصل ہوں۔

مجلس بزرگان | مگر مجلس عوام کے علاوہ سولن نے اُس مشہور مجلس بزرگان کو بھی از سر نو مضبوط اور قوی کیا جو اے ریوپے گس، نام پہاڑی پر اجلاس کرنے کے باعث خود بھی

تاریخ میں اےریوپےگس کے خطاب سے معروف ہوئی ۔اس میں قوم کے سن رسیدہ اور تجربہ کار بزرگ شامل ہوتے تھے اور اوّل اوّل وہ صرف مقدماتِ خون کی سماعت کرتی تھی لیکن سولن نے اُس کے ارکان کو اختیار دیا کہ جس قانون کو سلطنت کے لیے اندیشہ ناک پائیں اُس کا نفاذ روک دیں اور عام طور پر بھی اہل ملک کے نگراں رہیں کہ کوئی شخص بداطوار اور گمراہ نہ ہونے پائے ۔اس طرح، اگرچہ سلطنت میں اُن کا کوئی باضابطہ اور معین حصہ نہ تھا۔ پھر بھی وہ بڑے محترم سمجھے جاتے اور امرا کے لیے اےریوپےگس کی رکنیت آخری تمغہ اعزاز ہوتا تھا۔ اُس کے ارکان زیادہ تر اسی طبقے سے لیے جاتے تھے اور ہر آرکن کو عہدے سے دستکش ہونے کے بعد یہ حق ہو جاتا تھا کہ اگر ارکان انجمن چاہیں تو اُسے اپنی معزز جماعت میں شامل کریں ۔ آگے چلکر اس جماعت کے اختیارات میں بہت کچھ توسیع ہو گئی تھی اور وہ بار بار جمہوری اصلاحات کے راستے میں بھی حارج ہونے لگی تھی جس کی وجہ سے ہم آگے بڑھینگے کہ کس طرح پیری کلیس (فارقلیس) نے اپنے زمانے میں اس کا زور توڑا ۔لیکن اس وقت اےریوپےگس بڑے بوڑھوں کی صرف ایک باوقار جماعت تھی جسکی ہدایتیں اُسی ارادت وادب کے ساتھ تسلیم کی جاتی تھیں جسطرح خورد ۔ اپنے بزرگوں کی بات مانتے ہیں ۔

یہ تھا سولن کے نظام حکومت کا ایک مختصر خاکہ ۔اور اگرچہ دورِ قدیم میں اُسے بڑی وقعت و شہرت حاصل ہوئی لیکن جدید اہل تحقیق اس میں جمہوریت سے زیادہ امارت پسندی کی شان پاتے ہیں اور بعض سولن کو ایک معمولی قانون ساز سے زیادہ مرتبہ دینا پسند نہیں کرتے۔ اُن کا قول ہے کہ اُن دنوں اور یونانی ریاستوں میں بھی ایسے بہت سے قانون ساز (نوموتھےٹی) پیدا ہوئے تھے اور سولن کو جو یہ شہرت و منزلت نصیب ہوئی اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اتھنز کا رہنے والا تھا جہاں کے وطن پرست اہل قلم کی تحریریں دنیا میں باقی اور ابتک مقبول و شائع ہیں اور انھیں تحریروں کی

بدولت ایتھنز کا ہر نامور شہری بھی زندہ جاوید اور مشہور آفاق ہی خواہ بجائے خود اُس میں کوئی غیر معمولی قابلیت نہ ہو۔

لیکن معلوم ہوتا ہی کہ نظام سوؔلن کی پوری قدر شناسی کا ایک سبب یہ بھی ہی کہ خود اہل ایتھنز کی آزاد خیالی نے اس زمانے میں ایسی تیز ترقی کی کہ پچاس ہی برس کے اندر وہاں سوؔلن کا نظام حکومت بدلنے کی ضرورت پیش آگئی اور کلیس تھنؔز (کلیس تھنز) کے جمہوری طرز سلطنت نے اُس کی جگہ لے لی۔ گویا درحقیقت سوؔلن کے آئین پر عمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی کہ اُس سے بہتر اور زیادہ جمہوری آئین وجود میں آگئے۔ شاید اسی بہتر تبدیلی اور تیز تغیر نے بعض اہل الرائے کو سوؔلن کی خدمات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ کرنے دیا اور ان کی رائے میں زیادہ تعصب اس وجہ سے پیدا ہوا کہ جہاں متقدمین نے سولن کی مدح میں بہت کچھ قصیدہ خوانیاں کی ہیں وہاں کلیس تھنؔز کو ظاہرا کمتر درجہ کا وطن پرست مدبر ثابت کیا ہی۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ قدمائے یونان اکثر انفرادی آزادی کے پختہ حامی ہونے کے باوجود زیادہ تر حکومت خواص کے نظام کو آئین جمہوریت پر ترجیح دیتے تھے اور غالباً اسی واسطے وہ سوؔلن کے کلیس تھنؔز سے زیادہ مدّاح ہیں۔ مگر اُنکی ستایش سے قطع نظر کر لی جائے اور ہمیں یہ تسلیم ہی کہ کلیس تھنیز انسانی تمدن کی اصلاح میں سوؔلن سے بھی بڑا درجہ رکھتا ہی، تو بھی سوؔلن کے جلیل الشان کام کا اعتراف نہ کرنا سراسر ناانصافی ہی۔ یہی مقنن تو ہی جس نے آزادی کا نقش اوّل درست کیا اور حقوق نسبی کی قوت توڑی۔ اور اگر حکومت کو وہ دولت کی نامسعود گرفت سے آزاد نہ کرا سکا تو اس حسن ظن کی گنجائش باقی رہتی ہی کہ ہم اس فعل کو اس کی حکمت عملی اور مصلحت وقتی پر مبنی مان لیں اور یہ سمجھیں کہ اس وقت اتنا بڑا انقلاب اور یکایک جمہوریت کامل کا قیام ناممکن العمل تھا۔

لیکن اب ہمیں سوؔلن کے نظام حکومت کو چھوڑکر عام قوانین کی طرف توجہ کرنی چاہیے

کہ ان میں بھی اُس نے بہت کچھ رد و بدل کی تھی۔

قوانین سولن | ڈریکو کے مجموعے میں جو شدید سزائیں درج تھیں اُس نے انہیں یک قلم منسوخ کردیا اور قتل عمد یا دو ایک اور سنگین جرائم کے سوا کسی میں قتل کی سزا جائز نہ رکھی۔ نئے قوانین میں اس کا سب سے عجیب اور قابل ستائش قانون یہ تھا کہ ہر شہری جو کسی بغاوت یا شورش کے وقت "غیر جانب دار" رہے، اپنے تمام حقوق شہریت سے محروم کردیا جائے! کیونکہ اسکی غیر جانب داری کے معنی تو یہ ہوئے کہ گویا وہ قوم کے برے بھلے کی کوئی حس نہیں رکھتا اور فقط ذاتی کاروبار میں منہمک ہے۔ یا اسی کو کافی سمجھتا ہے کہ خود سلطنت کے خلاف کسی شورش میں حصہ نہ لے۔ حالانکہ سولن کی رائے میں اُس کا فرض ہے کہ وہ خاموش تماشا دیکھتے رہنے کی بجائے اڑے وقت میں قوم کی مدد کرے اور کسی شورش یا فساد کے رفع کرنے میں قوم کا شریک ہو۔ اگر وہ ایک جماعت کا فرد اور ایک کُل کا جزو ہے تو اسکے کیا معنی کہ جب یہ کُل معرض خطر میں ہو تو وہ اسکی کچھ پروا نہ کرے اور جاہلانہ بے غیرتی سے اپنی ذات کو بچائے؟

اس ضمن میں سولن نے یہ عام اجازت بھی دیدی تھی کہ مظلوم کی طرف سے ہر شخص کو چارہ جوئی کی اجازت ہے۔ مثلاً اگر کوئی مضروب یا مجروح خود مقدمہ چلانے کی قابلیت نہیں رکھتا تو ہر شہری کو مجاز تھا کہ وہ اسکی جانب سے ضارب پر دعویٰ دائر کردے؛ مدعا یہ کہ تمام قوم کے افراد اعضائے جسمانی کی طرح آپسمیں ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس کریں اور ایک کو آزار پہنچے تو سب کے سب اُس سے متاثر ہوں جو سولن کے خیال میں بہترین حکومت قومی کی علامت تھی۔ چنانچہ کسی نے اُس سے دریافت کیا تھا کہ شہر (یا قوم) کا سب سے بہتر نمونہ کونسا ہے؟ اُس نے کہا "وہ جہاں غیر ضرر رسیدہ بھی نا انصاف ظالموں کو اُسی سرگرمی کے ساتھ سزا دلانے میں کوشاں ہوں جتنا کہ خود ضرر رسیدہ کوشاں ہوتے"!

ایتھنز میں قدیم الایام سے یہ رسم چلی آتی تھی کہ بے اولاد مرنے والوں کا مال متاع اس کے کنبے میں بٹ جاتا تھا۔ اور اسی طرح ایک پرانا قانون یہ تھا کہ والدین کو اپنی اولاد کے فروخت اور قتل کر دینے کا بھی اختیار رہتا۔ پہلے کی سولن نے ترمیم کی اور ہر لاولد شخص کو اجازت دی کہ وہ جس کے نام چاہے اپنا ترکہ وصیت کر جائے۔ دوسرے قانون کو اُس نے بالکل منسوخ کر دیا اور باپ کے ہاتھوں بھی قتل یا انفرادی آزادی کا سلب ہونا جائز نہ رکھا۔ البتہ بڑھاپے میں باپ کی خدمت، اولاد کا قانونی فرض تھا۔ لیکن بے نکاحی ماؤں سے جو (حرامی) اولاد ہو یا باپ نے اُسے بچپن میں کسی قسم کی تعلیم نہ دلائی ہو تو ایسے بیٹے پر یہ فرض بھی باقی نہ رہتا تھا۔

عورتوں کے متعلق سولن نے بعض عجیب عجیب ضابطے بنائے تھے مگر انکی تفصیل حقیقتاً دلچسپ ہے اتنی ضروری نہیں اور یہی حال اس کے معاشی قوانین کا ہے۔ ان کا مطالعہ کرنے کیلیے ہم شائقین کو پلوٹارک کی کتاب کا حوالہ دینگے۔ لیکن اس کے عہد آرکنی کا یہ آخری کام ضرور قابل ذکر ہے کہ فتنہ کیلن کے سلسلے میں جو لوگ مجرم قرار دیئے گئے تھے اُن سب کو معاف کر دیا اور مگاکلیس کے جلاوطن خاندان کو بھی واپس آنے کی اجازت عنایت کی۔

آخر میں سولن نے اپنے مجموعہ قوانین کو چوبی تختوں پر لکھوایا اور تمام قوم سے اُن کی سَو برس تک پابندی کرنے کا حلف لیکر ایتھنز کے پیری ٹانیم (یعنی بیت العام) میں محفوظ کرا دیا۔ جہاں پہلی صدی عیسوی کے غالباً اخیر میں پلوٹارک نے بھی اُن کی باقیات کو رکھے دیکھا تھا۔ اس کے بعد جب ان کا نفاذ ہو گیا اور لوگوں نے سولن کو طرح طرح سے دق کرنا شروع کیا کہ فلاں قانون بہت سخت ہے اور فلاں حد سے زیادہ نرم۔ تو وہ اس قسم کی متضاد نکتہ چینیوں سے تنگ آ گیا اور سیاحت کے بہانے دس برس کی اجازت لیکر باہر چلا آیا کہ اس عرصے میں اس کے قوانین سے وہ لوگ بخوبی

مانوس اور آشنا ہوجائیں۔

حکومت جابریہ

سولن کے پردیس جاتے ہی ایٹی کا میں پھر باہمی جھگڑے اور فساد شروع ہو گئے۔ اُس کے قوانین کی عمدگی اور اصلاح کی خوبیوں کا سب کو دل سے اعتراف تھا مگر اسکے باوجود اُن میں فرق مراتب اور فرق مراتب کی وجہ سے فرقہ بندی کی بلا نہ مٹی تھی، اور چونکہ اُس قدیم تمدن کے اعتبار سے ایٹی کا کا رقبہ اور آبادی اتنی بڑی تھی کہ اس میں ایک سے زیادہ قومی ریاستیں (یا شہری حکومتیں) قائم ہوسکتی تھیں اس لیے وہ اتحاد اور قومیت جو شاہ تھی سئیس نے چاہی تھی، ان میں ابھی تک نہ پیدا ہوئی تھی، اگرچہ یہ ضرور پایا جاتا ہے کہ اُن کے ہر طبقے میں اتحاد قائم ہو گیا تھا لیکن سولن کے زمانے میں جب اُن کی آبادی تین فرقوں میں بٹ گئی تو اُمرا کے بھی آپس میں تنازعے ہونے لگے۔ چنانچہ پی سس ٹراٹس نام ایک چالاک امیرزادہ سب سے ادنیٰ اور غریب فریق سے آملا جس کو ان دنوں اہل جبال کہتے تھے۔ اُسکے مقابل میں متوسط لوگ اہل ساحل اور امرا اہل میدان کہلاتے اور ان میں سے ہر فریق اپنے لیے حکومت و اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ سب سے زیادہ بے چینی اہل جبال میں تھی اور انہیں کی سرگرہی میں پی سس ٹراٹس نے اپنی ہوس جاہ پوری کرنے کا منصوبہ باندھا تھا۔ طبقہ امرا کا سرگروہ لکرگس ایتھنزی اور متوسط طبقے یا ساحل والوں کا سردار مگا کلیس تھا۔ یعنی اُس مگا کلیس کا پوتا جس نے کیلن کے طرفدارں کو قتل کرایا تھا۔ غرض سولن واپس آیا ہے تو ایتھنز میں یہی طوفان بے تمیزی برپا تھا اور اُن کے مناقشے اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ سولن کا رسوخ و اثر بھی ان کو دفع کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا اور آخر کار خودغرض پی سس ٹراٹس کو حکومت جابریہ کی بنیاد ڈالنے کا موقع ملگیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بینٹھ کے دن جب ادنیٰ طبقے

کے بہت سے لوگ شہر میں جمع تھے پی سس نے اپنے جسم کو زخمی اور خون سے آلودہ کیا اور منڈی میں آکر فریاد کی کہ جمہور کی طرفداری کے جرم میں دشمنوں نے مجھے قتل کرنے کا تہیہ کیا تھا اور کئی زخم کھانے کے بعد میں بہ مشکل زندہ بچ کر آسکا ہوں، ساتھ ہی چند آدمیوں نے جو غالباً پہلے سے ملے ہوئے تھے، ہنگامہ مچادیا اور ایک شخص نے کھڑے ہو کے یہ تجویز پیش کی کہ پی سس کی حفاظت کے لیے پچاس برقنداز قوم کی جانب سے مقرر ہونے چاہئیں تاکہ جمہور کے ایسے خیر خواہ کو کوئی گزند نہ پہنچائے۔"

سولن پی سس ٹرائس کا عزیز قریب ہوتا تھا اور اس کے عیارانہ منصوبوں سے بہت دن پہلے کھٹک چکا تھا۔ اس موقع پہ کبرسنی کے باوجود ممبر پر چڑھا اور ایک پر جوش تقریر میں لوگوں کو پی سس کے فریب میں آنے سے روکا۔ لیکن جب اُسکی سماعت نہ ہوئی تو گھر جاکر اُس نے اپنے تمام ہتیار دروازے کے باہر رکھدیئے اور اُس دن سے معاملات ملکی میں حصہ لینا ترک کر دیا۔ ادھر پی سس ٹرائس نے تھوڑے دن کے بعد اپنے سپاہیوں کی تعداد بڑھائی اور جب کافی قوت پالی تو ایک روز قلعۂ شہر پہ قابض ہوگیا (سنہ ۵۶۰ ق مسیح) یہ گویا ایٹی کا میں حکومت جابریہ کا آغاز تھا اور اگرچہ اُمرا اور متوسط طبقے نے جب کبھی ملکر کام کیا، پی سس کے قدم اُکھڑ گئے، لیکن آخر ۵۴۵ ق م میں تیسری مرتبہ فتحمند ہوا اور اسکے بعد سے مرتے دم تک استقلال اور مضبوطی کے ساتھ اٹھارہ برس حکمرانی کرتا رہا۔

پی سس ٹرائس کا عہد پی سس کے بارے میں سولن کی رائے یہ تھی کہ وہ جابروں میں سب سے اچھا جابر ہے اور اُس میں سوائے جاہ طلبی کے اور کوئی عیب نہیں۔" واقعات سے بھی اس قول کی تصدیق ہوتی ہے اور گو پی سس شخصیت پسندی کے شرمناک مرض میں مبتلا تھا اور ذاتی اقتدار و حکومت حاصل کرنے کے لیئے ہر قسم کی مکاری اُس نے جائز رکھی تھی بایں ہمہ جب وہ مطلق العنان حاکم ہو گیا تو اہل تاریخ کو اقرار ہے کہ اُس نے

نہایت نرمی سے حکومت کی۔ اُس نے سولن کے آئین و قوانین کو بجنسہ نافذ رہنے دیا اور اپنے واسطے بھی بجز چند سپاہیوں کے کوئی شاہی اعزاز یا امتیاز نہ رکھا اور جب ایک مرتبہ اُس پر قتل کا الزام لگایا گیا تو معمولی ملزموں کی مانند اے ریوپی گس کی عدالت میں حاضر ہوا اور حسب قانون اپنی صفائی پیش کی۔ اسی طرح وہ بہت سی باتوں میں بڑا اعتدال بلکہ انکسار برتتا کہ جہانتک ہوسکے طرز حکومت کی تبدیلی لوگوں کو ناگوار نہ گزرے۔ مگر گروٹ کی رائے میں، جو یونان کا نہایت مستند اور بلند پایہ مورخ ہے، پی سس کی یہ مسکینی محض مصلحت وقتی اور مجبوری سے تھی کیونکہ اہل ایتھنز آزادی اور جمہوریت کی اتنی قدر ضرور جان گئے تھے کہ اُن پر ایک بُری یا ایشیائی قسم کی مطلق العنانی کا چلنا محال تھا۔

بہرحال اس حاکم جابر سے ایتھنز کو بعض فائدے بھی پہنچے۔ اوّل تو اُس نے بند باندھکر پانی کا حوض تیار کرایا جس کے بغیر شہر میں بعض اوقات بڑی تکلیف رہتی تھی۔ پھر اُس نے وسائل آمد و رفت درست کیے اور عمدہ سڑکیں تیار کرائیں اور ساتھ ہی ایتھنز کی تزئین کے لیئے خوبصورت عمارات اور مندر تعمیر کیئے جنکی بدولت قدیم یونان میں اس شہر کا رتبہ بڑھگیا۔ اسی طرح اُس نے معاصر شعرا کی ہمت افزائی اور قدیم کلام کی ترتیب و تدوین کرنے کی بدولت بڑی ناموری پائی۔ اور ہومر کی نظمیں کمال احتیاط سے جمع کرائیں اور یہ دنیائے علم و تحقیق پر اُس کا ایک بڑا احسان ہے۔

جابروں کی عام خصوصیت کے مطابق، پی سس بھی امرا کا زور توڑنا چاہتا تھا اور شاید آئین سولن کا جو اُس نے پاس کیا اُس کی بھی ایک وجہ یہی خیال تھا کہ ہر ذریعہ سے خاندانی امرا کا اقتدار گھٹایا جائے۔ بعض مذہبی میلے بھی اُس نے اسی غرض سے ترتیب دیئے تھے کہ امیر و غریب سب برابری کے دعوے سے شریک ہوں اور فرق مراتب کا جو پشتینی اثر ابھی تک دلوں میں باقی ہے وہ محو ہو جائے۔

حکومت جابریہ کا خاتمہ پی سس ٹراٹس کے بعد اس کا بیٹا ہپیاس پادشاہ ہوا (۵۲۷ ق م)

اور کئی سال تک اپنے باپ کی طرح بہت نرمی سے حکومت کرتا رہا۔ لیکن ۵۱۴ ق م میں اُسکے بھائی ہپارچس نے ایک نوجوان شہری ہرموڈئیس کی بہن کی توہین کی اور غیور ہرموڈئیس نے اپنے دوست ارس ٹوگی ٹن کی شرکت میں ہپارچس اور اُس کے بھائی ہپیاس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اُن کا اصلی مجرم ہپارچس مارا گیا لیکن اُس کے بھائی نے اپنی جان بچائی اور حملہ آور ہلاک کر دیئے گئے؛ اس واقعہ کے بعد سے ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ ہپیاس کا طرز عمل بدل گیا اور وہ بڑا شکی اور ظالم حاکم ہو گیا۔

مگر چند ہی سال میں تقدیر نے ایک اور پلٹی کھائی۔ مگاکلیس کے اعزا جو پی سس ٹراٹس کے فتح پاتے ہی ایتھنز سے جلاوطن کر دیئے گئے تھے (۵۴۵ ق م) اور اپنے قدیم گناہ کا بھی کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے مندر ڈیلفی کے پجاریوں سے ملے اور طرح طرح کی کوششوں سے جس میں اُنھوں نے بے دریغ روپیہ خرچ کیا، آخر کار دیوتا کی خوشنودی حاصل کر لی۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک پی سس ٹراٹس اور اُس کا خاندان ایتھنز میں حاکم ہے اُنھیں وطن کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا اور یہ بھی یقین تھا کہ اب ان جابروں کی قوت صرف ایک ہی تدبیر سے ٹوٹ سکتی ہے اور وہ یہ کہ جس طرح ممکن ہو پیلوپنی سس کی سر برآوردہ ریاست اسپارٹہ کی مدد کی جائے۔ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ مذکورہ جزیرہ نما میں جہاں کہیں حکومت جابریہ قائم ہوئی اہل اسپارٹہ اُسکے استیصال میں کوشاں ہوئے۔ کیونکہ ڈورین اُمرا کی حکومتیں بگڑنے میں، اُنھیں خود اپنے ہاں انقلاب کا خطرہ نظر آتا تھا کہ مبادا اُن کی غیر ڈورین رعایا بھی آمادہ فساد ہو جائے۔ اور گو پی سس ٹراٹس کے مقابلے میں وہ دخل دینا نہ چاہتے تھے، مگر مگاکلیس نے ڈیلفی والوں کو رشوتیں دیکر ایسا ملا لیا تھا کہ جب کبھی اسپارٹہ سے کوئی مکاشفہ طلب کیا جاتا، اُس کے جواب میں ہمیشہ اپالو دیوتا یہی کہتے کہ "ایتھنز کو آزاد کرانا فرض ہے"!

ڈیلفی کی مرلیوں کا یہ اصرار اُن دنوں یونان میں قریب قریب وہی اثر رکھتا تھا جو

چند صدی پہلے پوپ کے احکام یورپ میں۔ پس اہل اسپارٹہ آخر اس فرض کی ادائیگی پر مستعد ہو گئے اور انھوں نے ہپیاس پر فوج کشی کی۔ پہلی دفعہ انہیں ناکامی ہوئی لیکن دوسری دفعہ ہپیاس کے بیٹے لڑائی میں اسیر ہو گئے اور انہیں چھوڑنے کا معاوضہ حکومت سے دست برداری قرار پایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں مطلق العنان بادشاہوں میں یہ فساد پیدا نہ ہوئی تھی کہ سلطنت کے آگے ہر چیز کو بے حقیقت سمجھیں۔ ہپیاس کی محبت پدری بھی ہوس حکومت سے مغلوب نہ ہوئی اور اپنے بیٹے کو لیکر وہ ملک سے رخصت ہو گیا (۵۱۰ ق م)۔

یہ گویا ایتھنز میں حکومت جابرہ کا خاتمہ تھا اور چونکہ ہرموڈئیس اور ارسٹو گےٹن کے واقعہ کے بعد سے ہپیاس نے سخت مظالم کیے تھے، اس لیے اہل شہر ان دونوں کو مظلوم شہید سمجھتے اور اپنی قومی آزادی کو بھی قدرت کی جانب سے انہیں فدائیوں کا خوں بہا جانتے تھے۔

۴۔ جمہوریت

مگر اب خواص و اشخاص کی حکومت سے گزر کے ہم جمہوریت کی حدود میں داخل ہوتے ہیں یعنی اُس عہد زریں میں جس کی یاد ابتک دُنیا کو عزیز ہے، جو قومی اتحاد اور انسانی عدل و مساوات کا پہلا مرقع ہے، جس میں تمدّن کی عظمتیں ظہور پاتی ہیں اور اُن قوتوں کو فروغ ہوتا ہے جن کی نشو و نما پر بنی آدم کی اصلی ترقی کا انحصار ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ آدمی کا بڑا امتیاز اُس کی مدنیت یعنی ملکر رہنا اور کام کرنا ہے۔ پس جس قدر یہ استعداد بڑھے گی اسی قدر وہ زیادہ ممتاز انسان ہو گا۔ لیکن اس سیدھے سادھے اصول کو مان لینے کے بعد اصلی پیچیدگی اُس وقت سامنے آتی ہے جب کہ اس مدنیت کی عملی صورت اور وسائل تلاش کیے جائیں بہت سے آدمیوں

کے ملک یا ایک قوم بنا کر رہنے کے لیئے مقدم شرط تو یہ ہے کہ اُن میں باہمی محبت اور پیوستگی ہو اور محبت کے معنی یہ ہیں کہ وہ کامل عدل و مساوات برتتے ہوں۔ خود غرضی اور ناجائز ذریعوں سے ایک دوسرے کو دبانا نہ چاہتے ہوں بلکہ سب کی بھلائی میں اپنی بھلائی اور سب کی خوشی پر ذاتی خوشی کو منحصر جانیں۔ یہ صورت جمہوریت کے سوائے اور کسی طرز حکومت میں ممکن نہیں۔ پس درحقیقت صحیح معنوں میں اعلیٰ مُدنیت کا شرف اس وقت تک کسی قوم یا جماعت کو حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس میں جمہوری حکومت نہ ہو کہ جس میں ہر شخص کا رتبہ مساوی ہوتا ہے اور ہر فرد یقین رکھتا ہے کہ اپنی محنت و استعداد کے مطابق قوم میں جگہ پائے گا۔ کیونکہ ایسے یقین اور اعتماد کے بغیر مساوات جمہوریت اور محبت سب الفاظ مہمل اور قوم کی بجائے لوگوں کا مجمع بازار کی بھیڑ ہے۔ کسی نے کیا خوب لکھا ہے کہ قوم تو وہ ہے جس کے تمام افراد یہ سمجھیں کہ ہمیں ایک دوسرے کے رنج و خوشی میں شریک ہونا اور ایک ہی جگہ رہ کر عمر گزارنی ہے، نہ یہ کہ جہاز کے مسافروں کی طرح انہیں یہ خیال ہو کہ محض اتفاقات اور ذاتی کاروبار نے اُن کو تھوڑی دیر کے لیے اکھٹا کر دیا ہے اور وہ چند گھنٹوں کے بعد منتشر ہو جائیں گے۔

ایتھنز اور قدیم یونان کی وجہ امتیاز یہی ہے کہ اس فطری تمدن کے اصول کو اُنھوں نے سمجھا اور اُس پر عمل پیرا ہوئے۔ ایشیائی اقوام کبھی ذہانت و عقل کے اس درجے تک نہ پہنچ سکیں کہ کوئی "حضری جمہوریت" اُن میں قائم ہوتی۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ روحانیات میں جس قدر اُنھیں انہماک تھا اُس نے اگر ایک طرف قادر مطلق خدائے واحد کے برگزیدہ تصور تک اُنھیں پہنچایا تو دوسری طرف دنیاوی حاکم کے لیئے مطلق العنانی اُن کی نظر میں لازمی شرط قرار پائی۔ یہی "اپنے ہاتوں کے تراشے ہوئے" بُت تھے جن کی اُنھوں نے دُنیا میں ہمیشہ پرستش کی اور جمہوریت ایک طرف خود انسانی حقوق و مساوات کا صحیح تصور کرنے سے بھی وہ بالعموم قاصر رہے۔ اب جو ہم ایشیا میں کہیں کہیں ایسے الفاظ اور یہ خیالات

سُنتے ہیں تو ان سب کو یورپ کی رہ آورد ایک نئی پود سمجھنا چاہیے جو اہل مغرب یا اُن کے مشرقی مداحوں نے ایک غیر مانوس زمین میں لاکے لگائی ہی ورنہ جہاں تک تاریخ گواہی دیتی ہی وہ پہلے یہاں کبھی سرسبز نہیں ہوئی۔

مگر اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں کہ جب ہپیاس ایٹی کا سے رخصت ہوا تو پھر لوگوں میں وہی فرق بندی ہونے لگی اور اُمرا اور مگاکلیس کے خاندان میں بھی ایک سخت تنازع پیدا ہوگیا۔ حکومت جابریہ کے استیصال میں خاندان مگاکلیس نے ایسا اہم حصّہ لیا تھا کہ انھیں بہت سے لوگ واجبی طور پر جمہوریت کا بانی مبانی سمجھتے تھے مگر چونکہ یہ مقصد اسپارٹہ کی امداد سے حاصل ہوا تھا اس لیے اُمرا کا دعویٰ تھا کہ ایتھنز میں اب پھر حکومتِ خواص کا قدیم نظام جاری ہونا چاہیے۔ چنانچہ آئین سولن کی رُو سے جو حقوق عوام کو مل گئے تھے اُمرا انھیں بھی منسوخ کرنے کے درپے تھے۔ ان کوششوں میں اُن کا سرگروہ ایساگورس نام ایک خاندانی امیر تھا۔

اصلاحات کلیس تھنیز ایساگورس کا حریف مقابل کلیس تھنیز (یا کلیس تن) تھا جو مگاکلیس کا بیٹا اور شہر سکیان کے حاکم جابر کا نواسہ ہی اور جب اُس نے اُمرا کی مخالفت اور جمہور کی طرفداری میں زیادہ سرگرمی دکھائی تو اسی ننہیالی رشتے کی بنا پر اُمرا اُس کو یہ الزام دیتے تھے کہ وہ خود بادشاہت غصب کرنے کا سامان کر رہا ہی۔ لیکن ایسا کینہ ارادہ اُس کے دل میں ہو یا نہ ہو اس میں تو شک نہیں کہ جو کچھ اُس نے ایتھنز کے لیے کیا اُس سے وہ ایک اعلیٰ درجے کا جمہوریت پرست ثابت ہوتا ہی نہ شخصیت پسند۔ ایک قدیم مورّخ نے لکھا ہی کہ کلیس تھنیز کا طبعی میلان جمہوریت کی جانب نہ تھا بلکہ اُمرا کی مخالفت دیکھکر ہوس ناموری نے اُس کو اس راستہ پر ڈال دیا تھا۔" مگر یہ بھی اُسی قسم کی بدگمانی معلوم ہوتی ہی جیسی کہ اکثر مصلحین کی نسبت لوگ کیا کرتے ہیں اور اگر وہ صحیح بھی ہو تو اُس سے کلیس تھنیز کے کام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

الغرض کلیس تھینز نے امرا کے علی الرغم آئین و قوانین کو بطرز نو مرتب کیا اور سب سے اول سولن کی تقسیم آبادی کی اصلاح کی۔ یعنی مدارج دولت کے مطابق جو چار طبقے اُس نے قائم کیے تھے اُنھیں معطل کر دیا۔ اور اسی طرح وہ تقسیم بھی جو خاندان اور برادری کے اُصول پر اُن میں قدیم سے چلی آتی تھی برقرار نہ رہنے دی۔ اصل یہ ہے کہ اہل اٹی کا سے ابھی تک خاندان پرستی کی بُو نہ گئی تھی اور وہ چار برادریوں یا ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے اور سولن کی نئی تقسیم بھی اس اثر کو زائل نہ کر سکی تھی۔ حالانکہ اس قسم کی تمام ذات بندیاں قومیت کے منافی ہوتی ہیں۔ پس دوراندیش کلیس تھینز نے سارے ملک کو متعدد اضلاع میں اور پھر غلاموں کے سوائے تمام آبادی کو دس نئے قبیلوں میں تقسیم کر دیا جن میں پرانی برادریوں کی طرح کوئی ہم نسبی کا رشتہ موجود نہ تھا اور نہ مقنن نے اس بات کو جائز رکھا تھا کہ اُس کے یہ نو ساختہ قبیلے ایک ہی جگہ یا ایک ہی ضلع میں رہیں۔ اس کے برخلاف ہر قبیلے میں بالکل مختلف اضلاع اور جداگانہ حصص ملک کے باشندے شامل کیے گئے تھے اور اس طرح اُنھیں یہ بھی موقع نہ تھا کہ یک جا ہونے کے باعث فرقہ بندیاں کر سکیں۔ اب انہی دس قبیلوں کے آدمی مجلس عوام میں شرکت کے حقدار ہوتے اور کونسل (مجلس شوریٰ) کے ارکان کا نیز دوسرے مُلکی عہدے داروں کا انتخاب کرتے تھے۔ مقامی انتظام اور کاروبار کے واسطے ہر ضلع میں علٰحدہ ایک عامل اور مجلسیں تھیں اور ان میں قبیلوں کے بجائے محض سکونت کا لحاظ کیا جاتا تھا۔

کلیس تھینز کی اس نئی تقسیم سے کئی اہم فائدے حاصل ہوئے۔ اوّل تو اُس کے قبیلوں میں تمام آزاد آبادی داخل اور امور مُلکی میں حقدار ہو گئی اور پردیسی لوگ بھی جو اٹی کا میں بہ تعداد کثیر آبسے تھے اور سیاسی حقوق سے ہنوز محروم تھے، نئے قانون کے حلقے میں آ گئے۔ دوسرے اہل دولت و نسب کا زور ٹوٹ کر پہلی سی ذات بندیاں اور تفریق بھی یا مفقود ہو گئیں یا ان کا اثر کم ہو گیا۔ تیسرے مُلک اور آبادی کی دوہری تقسیم نے مقامی اور ملکی انتظامات

میں سہولت پیدا کر دی۔ اور چونکہ ہر قبیلے کے لوگ اب مختلف اضلاع میں بٹے ہوئے تھے اس لیے ملکی ضروریات اور انتخابات کے موقعوں پر اُنھیں دور دور سے آ کر ملنا اور یک جا ہونا پڑتا تھا۔ اس کا ایک عمدہ نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کے تعلقات محض اپنے کنبے اور گانوں تک محدود تھے اب مُلک کے ہر گوشے سے قائم ہونے لگے اور باہم دوستانہ روابط پیدا ہوئے جنھوں نے قومیت کی تازہ روح اُن میں پھونک دی۔ اور اب اُن کے کم فہم سے کم فہم افراد بھی سارے ملک کو صحیح معنوں میں اپنا گھر سمجھنے لگے۔ قوم کے بناؤ میں یہ بہت بڑی بات ہے اور اس کے بغیر جذبہ ملک پرستی کا وجود میں آنا دشوار ہے۔

کونسل سولن کے نظام حکومت میں کونسل چار سو ارکان پر مشتمل تھی۔ یعنی قدیم آئیونی برادریوں میں سے ہر ایک کے سو سو آدمی لے لیے جاتے تھے۔ کلیس تھینز نے یہ تعداد بڑھا دی۔ اور اپنے دس نئے قبائل میں ہر ایک سے پچاس ارکان لیکر اُسے پانسو کر دیا۔ اُس نے قدیم برادریوں کو قانوناً نہیں توڑا تھا اور نہ سولن کی حسب دولت تقسیم کو، مگر بالواسطہ طور پر جو صورت اُس نے پیدا کر دی اُس نے ان دونوں کو جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں فرسودہ اور قریب قریب بیکار بنا دیا تھا۔ البتہ اہل دولت کے بعض خاص خاص حقوق ابھی تک بحال تھے اور گو قدیم برادریاں اور امرا کے خاندان بھی اپنے دیرینہ مراسم مذہبی اور غرور عالی نسبی نباہے جاتے تھے، مگر ملکی معاملات میں ان امتیازات کو دخل نہ تھا اور اُن کی جگہ نئے قبیلوں اور نئے ضلعوں نے لے لی تھی۔

مجلس عوام مجلس عوام کو کلیس تھینز زیادہ باوقار اور ذی اختیار بنانا چاہتا تھا اور چونکہ اُس میں کوئی کارروائی کونسل کی تحریک اور وساطت کے بغیر پیش نہ ہو سکتی تھی پس کلیس تھینز نے پہلے کونسل کو زیادہ باقاعدہ اور کارآمد جماعت بنانے کا سامان کیا۔ پانسو آدمیوں کا گروہ کثیر ظاہر ہے کہ معاملات کو سہولت اور خوش اسلوبی کے ساتھ طے نہیں کر سکتا لہذا اُس کے بھی دس حصے کر دیئے اور پچاس پچاس ارکان کی کمیٹیاں بنائیں جو باری باری

سے پوری کونسل کے فرائض انجام دیتی تھیں اور اُن کے کام کرنے کے لیے سال کو بھی دس حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

مزید برآں مجلس عوام کو اُس نے مقدمات فیصل کرنے کا بھی اختیار دیا اور جوریاں بنائیں جن میں اسی مجلس کے افراد بیٹھتے تھے اور مجلس بزرگان (اے ریوپےگس) یا آرکنون کی بجائے اپنے اہل وطن کی خود دادرسی کرتے کہ خواص کی طرفداری یا اور ناروا رعایتوں کا کوئی امکان نہ رہے۔

اس ٹرے ٹےجس | مگر نئے قبیلے اور اُن کی کمیٹیوں کے ساتھ ہی کلیس تھینز نے ایک نئے عہدے کا بھی اضافہ کیا تھا۔ یہ عہدہ دار جسے اس ٹرے ٹےجس یعنی سپہ سالار کہتے ہیں ہر قبیلہ کی طرف سے ایک کُل دس منتخب ہوتے اور باری باری سے ایک ایک دن فوج کی کمان کرتے اور انھیں کے ساتھ ایک آرکن (حاکم میعادی) ہوتا جو اپنے منصب کی خصوصیت سے پول مارک یعنی جنگی حاکم کہلاتا تھا۔ اسپارٹہ کے نئے حکام الیفوروں کی مانند یہ سپہ سالار بھی رفتہ رفتہ خارجی معاملات میں دخیل اور پھر پوری طرح اُن پر قابض ہو گئے تھے۔

قرعہ | اگرچہ تشخیص محاصل کی غرض سے کلیس تھینز کو وہ چار طبقے بحال رکھنے پڑے تھے جو سولن نے حسب مدارج دولت قائم کیے تھے اور غالباً اُن کے خاص حقوق (یعنی صرف اعلیٰ طبقوں کا بڑے عہدے حاصل کرنا) بھی اُس نے منسوخ نہیں کیے تھے، بایںہمہ اس کے تمام قوانین سے یہ امر صاف مترشح ہے کہ وہ فرقہ بندی اور امرا کے ناواجب اقتدار کو توڑنا چاہتا تھا۔ اور اس بات کا اُس نے طرح طرح سے انسداد کیا تھا کہ کوئی جاہ طلب یا دہ رسوخ اور پھر بادشاہت یا خودمختاری حاصل نہ کر سکے۔ اسی مقصد کے لیے اُس نے ایک تدبیر یہ نکالی تھی کہ آرکنی کے امیدواروں کا تقرر قرعہ کے ذریعے کیا جائے تاکہ کسی شخص کو ناجائز وسائل سے رائیں حاصل کرنے کا موقع نہ ملے۔ اور جن امیدواروں کے نام قرعے میں نکل آئیں وہی آرکن مقرر ہوں۔ مگر مشہور مورخ گروٹ اس قانون کو کلیس تھینز کی

جمہوریت پسندی کے منافی تصور کرتا ہے اور پلوٹارک کے ایک قول سے بھی یہ معنی نکالتا ہے کہ قرعہ کی رسم اُس کے بعد اور اُس وقت جاری ہوئی جب کہ عہدہ آرکنی کا دروازہ امیر غریب سب کے لیے کھل گیا۔ اور کوئی دولت مندی کی شرط اس کے حصول میں حارج نہ رہی۔

لیکن زیادہ رائیں اسی طرف ہیں کہ قرعے کے ذریعے انتخاب کلیس تھینز کا رواج دادہ طریقہ ہے۔

فتوی عام

ان تدبیروں کے علاوہ کلیس تھینز نے جاہ طلبی کا ایک اور وسیلۂ انسداد بھی ایجاد کیا تھا۔ اُس زمانے میں یونانی ریاستوں کے پاس نہ فوجیں تھیں نہ اور کوئی قوت جس سے وہ اپنے آئین و قوانین کی مدافعت کر سکتیں۔ پس جب کبھی کوئی مکار اندرونی یا بیرونی امداد حاصل کر کے حکومت وقت سے بغاوت کرتا، تو اسّی فیصدی وہی کامیاب ہوتا اور خود بادشاہ بن بیٹھتا تھا۔ کلیس تھینز کو اندیشہ تھا کہ مبادا ایتھنز میں ہی آسمانی عذاب نازل ہو اور اس لیے اُس نے فتوی عام (اوس ٹرے کزم) کا عجیب طریقہ نکالا تھا جس کے ذریعے "ہر اُس شخص کا، جسے قوم سلطنت کے حق میں خطرناک سمجھے یا شخصی حکومت کا سامان کرتے دیکھے"، دس برس کے واسطے اخراج کیا جا سکتا تھا۔ اس امر کا فیصلہ کہ واقعی سلطنت خطرے میں ہے پہلے کونسل اور مجلس عوام میں ہوتا تھا اور اس کے بعد ایک مقررہ دن تمام شہری طلب کیے جاتے کہ ایک ٹھیکرے (اوس ٹریکو) یا کسی ٹھیکرے پر ہر شخص اُس آدمی کا نام تحریر کرے جسے "وہ سلطنت کے حق میں خطرناک" جانتا ہو۔ اب اگر ایک ہی شخص کا نام چھ ہزار ٹھیکروں پر لکھا ہوا نکلے تو اُس کو دس دن کے اندر وطن چھوڑنا پڑتا تھا۔ مگر یہ جلاوطنی اُس کی املاک یا حقوق شہریت پر کوئی اثر نہ رکھتی تھی اور جب وہ دس برس کی میعاد پوری کر کے گھر آتا تو اپنے تمام حقوق بجنسہ محفوظ پاتا تھا۔

نامی محقق گروٹ اس انوکھے قانون کی مدلل حمایت میں تحریر کرتا ہے کہ گو جمہور سے

غلطیاں ہونی ممکن ہیں لیکن اہل ایتھنز کی شریعت میں اُن غلطیوں سے بچنے کی خاطر خود جمہوریت کو جوکھوں میں پڑنے دینا کسی طرح جائز نہ تھا۔ اس کے علاوہ اگر اجماع جمہوری پر اعتماد نہ کیا جائے تو دنیا میں آزاد اور مساوی مرتبہ انسانوں کا ملکر رہنا قطعی غیر ممکن ہے پس اہل ایتھنز کا عقیدہ یہ تھا کہ جمہور کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہے جس کا کوئی اپیل نہیں! اسی لیے اُن کی ساری کوششیں یہ تھیں کہ جہاں تک ہو سکے ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں کہ جمہور کا یہ "آخری فیصلہ" جذبات طیش و اشتعال، ناانصافی اور عاجلانہ رائے سے غیر ملوث و غیر متاثر رہے۔ اس کے بعد بھی اگر حکومت میں خرابیاں رہیں تو اُن کے نزدیک پھر وہ لاعلاج اور انسان کی دسترس سے باہر تھیں۔ ہم آگے چلکر دیکھیں گے کہ اسی اصول کو وہ کس طرح نباہتے رہے۔ لیکن بالفعل ہمیں فتوی عام کے متعلق جو اُن کی کمسن جمہوریت کی سب سے مضبوط ڈھال تھا، یہ بتانا ہے کہ کلیس تھینز نے جو شرائط مقرر کی تھیں (کہ اُس کی زد صرف ایسے اشخاص پر پڑ سکے جو حقیقت میں خطرناک ہوں) اُن سے نہ صرف اُس کی دوراندیشی اور اصابت رائے بلکہ سچی وطن پرستی ثابت ہے۔ ان تدبیروں کا پہلا مقصود تو یہ تھا کہ یہ فتوی عام جمہور کی حقیقی رائے کا آئینہ ہو نہ کہ فرقہ بندی اور مخالفت کا۔ پس یہ شرط کہ چھ ہزار (یا کم سے کم ایک چوتھائی[1]) آبادی متفق اللسان ہو تب اُس کا فیصلہ قابل تسلیم شمار ہوگا، اس مقصود کے حصول کی بہترین تدبیر تھی خاص کر اس وجہ سے کہ رائیں مخفی اور رائے دہندہ کا نام ظاہر ہوئے بغیر لی جاتی تھیں جس سے طمع یا خوف دلانے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ دوسری بات یہ کہ کلیس تھینز نے اس کو بھی جائز نہ رکھا تھا کہ کسی شخص خاص کا نام لیکر اس کی نسبت رائیں لی جاتیں۔ اسکی بجائے وہ ایک عام سوال ہوتا تھا جس کے جواب کی زد بلا استثنیٰ ہر شخص پر پڑ سکتی تھی۔

---

[1] اندازہ کیا گیا ہے کہ اُس وقت ایتھنز کے آزاد و بالغ ذکور کی کل تعداد پچیس ہزار سے سوا نہ تھی اور تیس تیس ہزار سے کبھی بھی زیادہ نہ ہوئی ۱۲

چنانچہ ثمس طاکلیس کے دوست اُس کے حریف ارس تدیز کے خلاف یا ارس تدیز کے احباب ثمس طاکلیس کے خلاف بغیر اس اندیشہ کے فتوئی عام طلب نہ کر سکتے تھے کہ ممکن ہے خود ہمارا سرگروہ مستوجب اخراج قرار پا جائے! اس وجہ سے قرینہ نہ تھا کہ ایک فریق دوسرے کے خلاف اس ہتیار کو استعمال کریگا جب تک کہ یہ نوبت نہ پہنچ جائے کہ دونوں فریق خود جوکھوں میں پڑنے پر تیار ہو جائیں۔ اور باہمی عداوت کا یہی وہ درجہ ہے جسے فتوی عام آگے بڑھنے سے روک دیتا تھا اور زیادہ خوفناک اظہار دشمنی کا موقع نہ آنے دیتا تھا۔ اس کے علاوہ فتوی عام لیے جانے سے قبل دو ابتدائی مرحلے پیش آتے تھے یعنی جب تک کونسل اور پھر مجلس عوام کو اس بات کا پورا یقین نہ دلایا جائے کہ اُس کی درحقیقت ضرورت ہے، فتوئی عام طلب نہ کیا جا سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سزا صرف اُس وقت اور اُن ہی کے لیے کارگر نہ تھی کہ جس وقت اور جن کو دی جائے۔ بلکہ خود ایسی سزا دیئے جا سکنے کا علم اور خوف ایسا کارگر ہوتا تھا کہ مفسدوں کو بہ مشکل فساد اُٹھانے کی جسارت ہو سکتی تھی۔

سب سے آخری دلیل اُس کی موافقت میں یہ ہے کہ اگرچہ وہ ایک انتہائی قسم کی سزا تھی تاہم ملکی آئین کی حدود سے باہر نہ تھی اور اس لیے جمہور ایسا فیصلہ کرتے وقت جانتے تھے کہ وہ کوئی خلاف قانون کارروائی یا زبردستی نہیں کر رہے ہیں۔ پس جب اُن کے سامنے یہ سوال پیش ہوتا کہ آیا کوئی ایسا شخص ہے جسے تم سلطنت کے لیے سخت خطرناک سمجھتے ہو؟ ہے۔ تو کون؟ تو اگرچہ اس میں کسی خاص آدمی کا نام نہ ہوتا تھا پھر بھی وہ براہ راست اور قانونی سوال کے طور پر اُٹھایا جاتا تھا۔ حالانکہ اگر فتوی عام نہ ہوتا تو بالکل ممکن تھا کہ کسی مشتبہ سیاسی ملزم کی تحقیقات کے وقت یہی سوال زیادہ ناگوار اور خلاف قانون نوعیت اختیار کر لیتا۔"

آخر میں گروٹ لکھتا ہے کہ کلیس تھنیز کے اس یادگار آئین پر ہمیں اتنا کچھ تحریر کرنے کی

ضرورت نہ ہوتی اگر قدما اور اُن کی بلا تامل تقلید کے جوش میں بعض جدید اہل تحقیق جمہوریہ ایتھنز کو یہ کہہ کر بدنام نہ کرتے کہ اُس میں اپنے بڑے آدمیوں کے ساتھ ناانصافی اور حسد کا برتاؤ کیا جاتا تھا جس کا ثبوت فتویٰ عام کا نرالا قانون ہے۔ اس کا سیدھا مگر مسکت جواب یہ ہے کہ ایک بادشاہی حکومت میں اگر کوئی شخص تخت کا بلا حق دعویٰ کرے تو وہ یا قتل کر دیا جائیگا یا کم از کم مُلک سے ضرور نکال دیا جائے گا اور اس فعل کو کوئی بھی ناانصافی یا ظلم نہ کہے گا۔ اب فتویٰ عام پر نگاہ کیجیے تو غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ مذکورہ بالا سزائیں اور فتویٰ عام میں نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ انصاف سے دیکھا جائے تو جس جگہ بادشاہت کا رواج ہے وہاں کسی دوسرے شخص کا دعویٰ بادشاہت کرنا نظام حکومت میں کوئی انقلاب نہیں ڈالتا حالانکہ اس کے مقابل جمہوریت میں کسی بندۂ ہوس کا بادشاہت چاہنا درحقیقت سارے آئین کو درہم برہم کر دینے کا سامان کرنا ہے اور اس جرم کی سنگینی بجائے خود آشکار ہے۔

اسپارٹہ کی مداخلت

اس طرح ناظرین نے دیکھ لیا ہوگا کہ کلیس تھینز کی تمام اصلاح کا اصلی مقصود جمہور کی قوت بڑھانا تھا چنانچہ اُس نے جو بنیادی تبدیلیاں نظام سلطنت میں پیدا کر دی تھیں اُن کی وجہ سے اب ایتھنز کی حکومت ٹموک ریسی یعنی ارباب متاع کی حکومت نہ رہی تھی بلکہ اصولاً جمہوری بن گئی تھی۔ یہ اصلاح قدرتی طور پر امرا کے خلاف منشا تھی اور اُنھوں نے ایساگورس کی سرگروہی میں جس قدر شدت سے ممکن تھا قوانین کلیس تھینز کی مخالفت کی اور جب کثرت کے سامنے کچھ پیش نہ چل سکی تو کلیومینز شاہ اسپارٹہ سے امداد کی التجا کی اور کہلا بھیجا کہ اب انسداد نہ ہوا تو عنقریب کلیس تھینز خود مختار بادشاہ بن بیٹھے گا۔ اور اپنے نانا شاہ سکیان کی مثل ڈورین امرا کو ہر طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا،،

مگر کلیومینز پر ان باتوں کا اتنا اثر نہ تھا جتنا اس آرزو کا کہ اگر بن پڑے تو ایتھنز

کو تسخیر کرنا یا (پیلوپنی سسی ریاستوں کی شل) اسپارٹہ کے زیر اقتدار لانا چاہیے۔ اسی طمع ملک گیری کے باعث وہ اِیساگورس کی صدائے استمداد پر فوراً دست اندازی کے لیے کمربستہ ہوگیا اور اہل ایتھنز کو پیام بھیجا کہ کلیس تھینز اور اُس کے خاندان کو جلاوطن کردیا جائے۔ کیونکہ یہ لوگ اُسی مگا کلیس کی اولاد ہیں جس نے کیلن کے ساتھیوں کو مندر میں قتل کر دیا تھا۔ اور یہ گناہ ایسا سخت تھا کہ اسپارٹہ والوں نے نہ صرف اب بلکہ اسّی برس بعد پیری کلیس کے بارے میں بھی اسی کو چھیڑ نکالنے کا حیلہ بنایا تھا۔ بایں ہمہ اس خیال سے کہ دروغگو را تا بہ خانہ باید رسانید، کلیس تھینز خود ایتھنز سے نکل گیا اور کلیومینز کی کسی اور نے بھی مزاحمت نہ کی۔ وہ تھوڑی سی فوج لیکر شہر میں داخل ہوا اور جن خاندانوں کو ایساگورس نے "جمہوریت پسند" بتایا اُن سب کو نکلوادیا۔ لیکن جس وقت اُس نے کلیس تھینز کے نئے آئین پر دست تخریب دراز کیا اور مجلس شوریٰ یعنی کونسل کو منتشر ہونے کا حکم دیا تو اُس وقت تحفّظ حقوق کا ایسا جوش اُن میں پھیلا کہ سارا شہر مقابلے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ شاہ کلیومن کو ڈر کر قلعہ شہر میں پناہ لینی پڑی اور وہاں بھی جب رسد ہو چکی تو وہ امان طلب کرنے پر مجبور ہوا۔ تب اہل ایتھنز نے اسپارٹی فوج سمیت اُسے واپس جانے کی اجازت دیدی مگر اُن کے جو ہم وطن اس کے ساتھ مل گئے تھے اُن سب کو (ایساگورس کے سوا) اُنھوں نے گرفتار کرکے بغاوت کے جرم میں سزائے موت دی۔ یہ نئی جمہوریت کا پہلا امتحان تھا جس میں وہ پوری اُتری اور ثابت ہوگیا کہ آئین کلیس تھینز نے اُن کے دلوں میں وہ جذبہ وطنیت پیدا کر دیا تھا جو کسی خطرے سے دبنے والا نہ تھا۔ حالانکہ پی سس ٹراٹس کے زمانے میں خود سولن کی مقرر کردہ کونسل کے بعض ارکان جابر مذکور کی غاصبانہ کوششوں میں شریک ہو گئے تھے۔

کلیومن کے دفع ہونے اور جلاوطنوں کے ایتھنز واپس آنے کے بعد بھی اسپارٹہ والوں کے دوسرے حملے کا اندیشہ رفع نہ ہوا تھا اور حقیقت میں کلیومن بھی تیاریاں کر رہا تھا کہ

اس مرتبہ ایتھنز کو تسخیر کرکے ایساگورس کو وہاں کا حاکم جابر اور بالواسطہ اسپارٹہ کا مطیع بنائے۔ لیکن ایسے اسباب پیش آئے کہ اُس کی یہ مہم سرسبز نہ ہوسکی اور اُس کے حلیفوں نے جنھیں پہلے اُس کے ارادوں کی اطلاع نہ تھی۔ سرحد تک پہنچکر اس کا مطلب پالیا اور ایٹی کا پر حلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ ریاست تھیبز اور (جزیرہ یوبیہ کے) شہر چال کیس کے لوگ اسپارٹہ سے قرارداد کے مطابق ایٹی کا پر شمال سے بڑھے۔ اہل ایتھنز کو اب اسپارٹہ کا خطرہ نہ رہا تھا۔ پس پہلے اُنھوں نے تھیبز والوں کو شکست دی اور اس کے بعد چال کیس کی فوجوں پر ٹوٹ کر گرے اور ایسی کامل فتح حاصل کی کہ یہ ریاست (چال کیس) ہی اُن کی حلقہ بگوش ہوگئی اور وہاں کی بہترین زمینوں میں چار ہزار ایٹی کا کے کسان بسا دیئے گئے۔

اہل اسپارٹہ کا جذبہ حسد اب چہار چند بڑھ گیا تھا اور جب انھیں معلوم ہوا کہ ہپیاس (پیسریسٹراٹس) کو خود اُن کے ہاتھوں نکلوانے کی غرض سے یہ سازش کی گئی تھی کہ ڈیلفی والے کلیس تھینز سے مل گئے تھے اور ہر موقع پر اسپارٹہ کو یہی جواب کہلا بھیجتے تھے کہ ایتھنز کو آزادی دلانا فرض ہے! ۔ تو اُنھیں اور بھی غصہ آیا اور اپنے بیوقوف بننے کا بدلہ لینے کے واسطے اُنھوں نے ایتھنز کی تذلیل اور ہپیاس کو دوبارہ تخت نشین کرانے کا تہیہ کیا۔ اور اس دفعہ اپنا مقصد بھی حلیفوں سے مخفی نہ رکھا بلکہ تمام پیلوپنی سس کی ریاستوں کے وکلار کو جمع کیا اور اُنھیں ترغیب دی کہ ہپیاس کو دوبارہ برسر اقتدار لانے میں شریک جنگ ہوں۔ اس تحریک پر شہر کورنتھ کے وکیل نے اُن کی مخالفت کی اور شرمایا کہ وہ جو کل تک جابروں کے دشمن تھے آج کیا ہوا کہ اُن کے پشت پناہ بننا چاہتے ہیں؟ پھر اُس نے انھیں وہ مظالم یاد دلائے جو شاہ پیری انڈر نے کورنتھ پر کیے تھے۔

غرض جلسے میں اسپارٹہ والوں کو شرمندہ ہونا پڑا۔ انھیں اپنے ارادے میں پھر ناکامی ہوتی نظر آئی اور آخر ایتھنز پر حلے کے خیال کو اُنھوں نے چھوڑ دیا۔

اس طرح اہل ایتھنز نے انسان کے ورثۂ فطری یعنی قومی آزادی کو قائم رکھا اور یہ تھیمزادر چال کیس کے مقابلے میں بھی غالب و سرخرو رہے۔ اس سے ان کی ہمتیں بڑھ گئیں اور ان کے ولولۂ وطنیت میں تازہ قوت پیدا ہوئی۔ اور ان مخالفتوں سے اُن کی جمہوریت کو اور فروغ حاصل ہوا۔ اِدھر کلیس تھینز کی بے بہا اصلاحوں نے اُن کے امرا کی رقابتیں گھٹادی تھیں اور عوام الناس کو بھی اس طرح شریک حکومت بنالیا تھا کہ اب انھیں خود مختار بادشاہت یا حکومت جابریہ کے محض نام سے نفرت ہوتی تھی۔ یہی مقنّن کا اصلی مقصود تھا اور یہی حرّیت کا سچا عشق تھا جس نے آنے والی آزمایشوں کے وقت اہل ایتھنز کو ثابت قدم رکھا اور وہ اپنی محبوب آزادی کی خاطر ایران کے خونخوار عفریت سے بھی لڑنے پر کمربستہ ہوگئے جو ہمارے اگلے باب کا موضوع ہے۔

باب پنجم

یونان کی جدوجہد دولت ایران سے

چھٹی صدی قبل مسیح کے اواخر میں ایران کی سلطنت نے وہ عظمت و وسعت حاصل کی تھی کہ سارا ہیلاس (قدیم یونان) اُس کے پچاسویں حصّے کے برابر بھی نہ تھا۔ پھر جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ خاص مقابلے کے وقت یہ چھوٹا سا ملک بھی غیر متحد اور منقسم تھا۔ اُس کی بعض ریاستیں حملہ آوروں سے مل گئی تھیں۔ اور اُس کے صرف چند علاقے تھے جنھوں نے اپنے دیو ہیکل حریف کی پوری ضرب برداشت کی تو اُس وقت ہمیں بے اختیار ہاتھی اور خرگوش کی کشتی کا قصہ یاد آجاتا ہے۔ ادھر اس واقعہ پر جو بجائے خود کچھ کم حیرت انگیز نہیں، یونانی مؤرخوں نے طرح طرح کے حاشیے چڑھا کر اُسے اور بھی داستان شجاعت بنا دیا ہے۔ اور روایت کا جہاں تک تعلق ہے اُن کے بیان کو لامحالہ اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ فریق ثانی یعنی ایرانیوں نے کوئی قابل اعتبار تاریخ نہیں چھوڑی جس کو یونانیوں کے خلاف پیش کیا جا سکے۔ ایسی حالت میں اگر آج بھی اہل یورپ یہ غرور کرتے ہیں کہ ساری ایشیا یورپ کے ذرا سے گوشے پر فتح نہ حاصل کر سکی تو کچھ بیجا نہیں۔ اور اگر اس کو یوں کہا جائے کہ یہ کشمکش درحقیقت آزادی اور غلامی، جمہوریت اور شخصی بادشاہت کے دو متضاد اصولوں کا تصادم تھی جس میں ہزار کم سامانی اور تہی دستی کے باوجود وہی اصول سلامت و سربلند رہا جسے رہنا چاہیے تھا، تو یونان کی فتحمندی اور ایران کی سرنگونی پر شادماں ہونے والے فقط وہی نہ ہونگے جو یورپ میں پیدا ہوئے، بلکہ ہر شخص جو حق پسند ہے!

لیکن ان لڑائیوں کے اسباب ڈھونڈنے میں اگر ہم ہیروڈوٹس کی تقلید کریں تو صدیوں پیچھے جانا پڑیگا۔ اور گو اس بیکار طوالت کی یہاں گنجایش نہیں تو بھی ضروری

ہو کہ سلطنت ایران کی اُس وسعت و عالمگیری کا بالاختصار کچھ حال لکھدیا جائے جس نے
اُس کی حدود اور تعلقات کو نسلِ یونانی کی آبادیوں سے لا ملایا تھا۔

آی اونی مستعمرات اور سلطنت لِڈیہ (لود) ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یونانیوں کے بڑے بڑے
گروہ ہجرت کرکے ایشیائے کوچک میں جا بسے تھے مگر ان کی بستیاں بلا استثنیٰ ساحلی علاقوں
تک محدود تھیں۔ اندرونِ ملک میں بڑھنے کی اُنھوں نے کوشش نہ کی اور خود وہاں کے
بادشاہ بھی اس حد تک اُن سے متعرض نہ ہوئے۔ اسی طرح صدیاں گزر گئیں اور یونانی
آباد کار اس امن و فراغت کی دُنیا میں خوب پھلے پھولے اور اپنے یورپی ہم نسلوں سے
کہیں پہلے اور کہیں زیادہ دولت مند ہو گئے۔ ان مستعمرات میں بھی جیسا کہ پہلے بیان
ہو چکا ہے ہیلنیز نسل کے (ڈوریئین اور آی اونین) گروہوں میں تفریق موجود تھی اور
زیادہ فروغ آی اونی گروہ کو تھا جس کے بارہ (۱۲) شہر تھے۔ ان شہروں میں عادات و عقائد
کی باہمی یکسانیت اور نیز دوسرے یونانیوں سے ایک قسم کا امتیاز ضرور موجود تھا۔ مگر
ملکی اعتبار سے یہ اسی طرح خود مختار اور علیحدہ علیحدہ شہری ریاستیں تھیں جیسی کہ ہیلاس
خاص کی۔ بلکہ اسپارٹہ کی مانند یہاں کوئی ایسا شہر بھی نہ تھا جس کے زیرِ اقتدار وہ سب
متفق ہو جاتے۔ اور گو اُن کا بہت دنوں سے ایک مشترک مذہبی میلہ ہوتا تھا لیکن سیاسی
طور پر مل کر کام کرنے کی اُن میں کوئی استعداد پیدا نہ ہوئی تھی۔ اور اس نقص کی عرصہ دراز
تک مضرتیں بھی انھیں محسوس نہ ہوئیں۔ یعنی اُس وقت تک کہ کسی بیرونی دشمن نے اُن پر حملہ
نہ کیا وہ اپنی محدود شہری ریاستوں میں آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے مگر جب
سنہ ۷۰۰ ق م میں لڈیہ (یا لود۔ وسط ایشیائے کوچک) میں ایک نیا خاندان سریر آرائے
سلطنت ہوا تو صورت حالات بدل گئی۔ کیونکہ اس نئے خاندان شاہی نے لڈیہ کو ایک
بڑی طاقت بنانے کا عزم کر لیا تھا اور اُس زمانہ میں جب کہ نینوا کی کہن سال بادشاہت
پارہ پارہ کی جا رہی تھی اُن کے دل میں ایسی ہوس کا پیدا ہونا اُس عہدِ انقلابات کا قدرتی

اقتضا بھی تھا۔

بایں ہمہ یہ یونانی شہر سو برس تک غالباً شاہ کریسس (کرزوس) کے عہد سے پہلے تابع نہ ہوسکے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ الگ الگ اُن میں سے کوئی شہر ایک بڑی سلطنت کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ اور سنہ ۵۵۰ ق م میں ہم سنتے ہیں کہ رفتہ رفتہ وہ سب لڈیہ کے باج گزار بن گئے۔ لڈیہ میں اُن دنوں شاہ کریسس حکمراں تھا۔ اور گو وہ ایک مطلق العنان حاکم اور آیونی نوآبادیوں کا فاتح تھا پھر بھی کسی قسم کی زیادتی اُس نے ان مفتوحہ شہروں پر جائز نہ رکھی تھی اور کریسس کو شہنشاہ تسلیم کرلینے یا ایک معمولی خراج دینے کے سوائے وہ اندرونی معاملات میں قریب قریب ویسے ہی خودمختار رہے جیسے کہ مفتوح ہونے سے پیشتر تھے۔ کریسس کو بھی اُنھیں زیادہ دبانے کی خواہش نہ تھی۔ وہ یونانی اخلاق و آداب کا گرویدہ ہوگیا تھا اور اُس کے دربار میں اکثر یونانی سیاح اور صاحبان علم و فن کا مجمع رہتا تھا۔ چنانچہ اُس کے انھی یونانی مصاحبوں میں ایک ایسپ تھا جس کی پرلطف حکایتوں کا مجموعہ اب تک یورپ میں مقبول ہے اور اُسی شوق کے ساتھ بچوں کو پڑھایا جاتا ہے جیسے ہمارے ہاں گلستاں۔

مگر سب سے بڑی وجہ جس نے یونانیوں کو اپنے زبردست ہمسایوں سے خوش رکھا یہ تھی کہ لڈیہ کے بادشاہ اُن کے معابد کا پورا احترام کرتے، اُن کے مندروں میں بعض اوقات خود نیازیں چڑھاتے اور سفیر بھیج بھیجکر مہمات امور میں اُن کے کاہنوں سے فالیں نکلواتے تھے۔ اُن کا یہی میلانِ خاطر اور عقیدتمندی ہے جس کی بنا پر بعض اہل تحقیق قیاس دوڑاتے ہیں کہ اگر سلطنت لڈیہ اور کچھ عرصہ تک قائم رہتی تو غالباً یونانی عادات و اخلاق بہت جلد ساری ایشیائے کوچک میں پھیل جاتے۔

لیکن جیسا کہ آگے آتا ہے لڈیہ کی حکومت کا دفتر عنقریب اُلٹنے والا تھا اور اس کی جگہ ایک "حقیقی ایشیائی سلطنت" لینے والی تھی جو یونانیوں سے بیزار اور اُن کے طور طریق سے متنفر تھی۔

اشور میڈیہ (مادہ) اور ایران

قبل مسیح پہلے ہزارے کے آغاز میں مشرقی ایشیا کی سب سے قوی سلطنت اشوریہ میں قائم ہوئی تھی جس کا مرکز حکومت نینوا تھا اور جو اپنے عروج کے زمانے میں سندھ اور سیستان سے شام و لڈیہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ مگر بقیاس غالب ۶۰۰ء ق م میں اُس کے دو مفتوحہ علاقوں نے علم بغاوت بلند کیا اور بابل و مادہ یا میڈیہ (مد) کی بادشاہتیں اُس سے علحدہ ہو گئیں۔[۱] شہر بابل جس کے کھنڈرات تک موجود ہیں، دریائے فرات کے دائیں کنارے پر نینوا کے جنوب میں واقع تھا اور میڈیہ اُس علاقہ کو کہتے تھے جو اب ایران کا شمالی صوبہ آذربایجان ہے۔ یہاں کے لوگ قدیم سے جنگجو اور جفاکش تھے اور جب اُن کی علحدہ حکومت قائم ہو گئی تو بہت جلد وہ جنوب میں ایران و مکران تک پھیل گئے اور ان کے چوتھے بادشاہ سیاوش[۲] نے بنو لفر شاہ بابل کے ساتھ اپنے پرانے آقا کو گھیر لیا اور ۶۰۶ء قبل مسیح میں اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

اس فتح سے اہل میڈیہ کی حرص ملک گیری بڑھی اور اب وہ خود بابل پر للچائی ہوئی نظریں ڈالنے لگے۔ لیکن ابھی تک بابل کی قوت ایسی بنی ہوئی تھی کہ اُس پر حملہ کرنے کی اُنھیں جسارت نہ ہو سکی اور جنوب کی بجائے اُنھوں نے مغرب کا رُخ کیا۔ لڈیہ کی فوجوں سے ان کا پہلا مقابلہ غالباً ۵۸۵ء ق م میں ہوا مگر عین لڑائی کے وقت سورج گہن پڑ گیا اور فریقین اس واقعہ سے ایسے متوہم ہوئے کہ مصالحانہ طریق سے دریائے ہیلس (قزل ارماق) کو اپنی حد فاصل قرار دیکر گھروں کو لوٹ گئے۔

میڈی فتوحات کا سیلاب رُکنے نہ پایا تھا کہ ایرانی قوم نے سیروس یا کیخسرو کے

[۱] بابل کے جداگانہ سلطنت بننے کے بعد ہی یہودیوں کی گرفتاری کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ یعنی اسرائیل بنی کو اہل بابل اور یہودا بنی کو اہل اشور پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے

[۲] سیاوش یعنی سیاکزار (Cyxares) دیکھو ضمیمہ کتاب ۱۲

زیر علم خروج کیا اور تمام میڈیہ کے علاقوں پر قابض ہو گئے (۵۵۹ ق م) یہ آندھی ایسی تیزی سے اُٹھی تھی کہ ایران کے سب ہمسایے اُس سے خوف زدہ ہو گئے۔ خصوصاً کریسس کو قرائن سے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ایرانیوں کا پہلا ہدف لڈیہ ہے۔ پس ادھر بھی جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں اور ۵۴۷ ق م میں غالباً بابل اور مصر کی مدد کے بھروسے پر خود کریسس نے پیش قدمی کی اور ایران کے مغربی علاقے کپے ڈوسیہ میں ایک برابر کی لڑائی لڑا۔ پھر یہ سمجھ کر اپنے پایہ تخت سارڈس[۱] کو لوٹ آیا کہ پانچ چھ مہینے تک ایرانی کسی فوج کشی کے قابل نہ ہونگے۔ مگر اس اطمینان نے اُس کی بادشاہت کھوئی اور اُس کے حلیف بھی کوئی امداد وقت پر نہ پہنچا سکے۔ کیونکہ تھوڑے ہی دن میں کیخسرو کی فوجیں خاص سارڈس کے سامنے نمودار ہوئیں کریسس شکست کھا کے پکڑا گیا اور اُس کا پایہ تخت، اور ساتھ ہی ایشیائی دستور کے موافق سارا ملک تسخیر ہو گیا۔

آی اونی مستعمرات | اہل آی اونیہ نے بھی نئے فاتح کے حضور میں اس شرط پر اطاعت کرنی چاہی کہ اُن کی پچھلی مراعات برقرار رہیں گی اور وہ اپنے اندرونی معاملات میں آزاد چھوڑ دیئے جائیں گے۔ کیخسرو نے اس کو نامنظور کیا اور اپنی جرنیل ہرپاگس (ہارپاگس) کو حکم دیا کہ ایشیائے کوچک کے تمام ساحلی علاقوں کا بہ جبر سلطنت ایران میں الحاق کرے۔ "یونانی آبادکاروں نے ایرانیوں جیسا خوفناک دشمن جس نے اب اُن پر حملہ کیا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لڈیہ کے ساتھ لڑائیوں میں اُنھیں ایک اعلیٰ درجے کی سوار فوج سے مقابلہ پڑا تھا لیکن ایرانی سپاہ اور اس کے جنگی ساز و سامان اور طرح کے تھے۔ اُن کے تیرانداز شہرپناہ کے مدافعین کو نشانہ بناتے تھے۔ باقاعدہ محاصرہ کے لیے اُن کے پاس کلیں تھیں محصور شہروں کے گرد وہ خندقیں کھود لیتے کہ اندر کا کوئی شخص باہر اور باہر کا اندر نہ جا سکے۔

---

[۱] سارڈس (Sardis) یا سارد۔ موجودہ شہر سمرنا سے تقریباً ستر میل مشرق میں واقع تھا۔ اس کے کھنڈر اور ایک چھوٹی سی آبادی اب تک موجود ہے جسے آجکل سرت کہتے ہیں ۱۲

فصیلوں کے مقابلہ میں وہ بڑے بڑے دمدمے تیار کرتے اور یا سرنگیں لگا کر اُنہیں گرا دیتے تھے۔ اس کے علاوہ لڈیہ کے حملہ آوروں نے مذہبی عمارتوں کو کبھی ضرر نہ پہنچایا تھا مگر ایرانی، زمانہ مابعد کی اسلامی فوجوں کی طرح ایک خدا کے ماننے والے تھے اور بت پرستوں کے ہر کام سے انہیں نفرت تھی۔ چنانچہ ان لڑائیوں میں مندر توڑ توڑ کر اُنھوں نے یونانیوں کے دل کو سخت آزار پہنچایا ۔ ۔ ۔ ۔ " (فایف)

اس طرح ہرپاگس نے ایک ایک کر کے تمام ساحلی شہروں کو تسخیر کر لیا اور گو اُن کے سب سے دانشمند شہری بیاس کی صلاح یہی تھی کہ اُنھیں غلامی پر جلاوطنی کو ترجیح دینی چاہیئے نیز دو آی اونی شہروں نے اس حریت پسندی کا عملی ثبوت بھی دیا۔ تاہم وہ سب ایسے ترک وطن پر آمادہ نہ ہو سکے اور دارائے ایران کی غیر مشروط اطاعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ (۵۴۱ ق م)

اس زمانے میں جب ہرپاگس ان شہروں کی تسخیر میں مصروف تھا خود کیخسرو نے بابل پر فوج کشی کی اور ایک عرصے کے محاصرے کے بعد اس جلیل القدر پایہ تخت کو فتح کر لیا (۵۳۸ ق م) اس یادگار فتح نے ایران کی کشور کشائیوں میں بڑی آسانی پیدا کر دی۔ اور سلطنت بابل کے مٹتے ہی عجمی تلواریں بے روک مصر و شام کے میدانوں میں چمکنے لگیں اور کیخسرو کے بیٹے کیکاؤس[۱] کے عہد میں یہ دونوں زرخیز علاقے ایرانیوں کے قبضے میں آگئے۔ (۵۲۵ تا ۵۲۲ ق م)۔

دارائے اعظم

یونانی روایت کے بموجب کیکاؤس نے تین سال بادشاہت کر کے لاولد وفات پائی اور اس کا ایک عزیز (ڈیریئس یا داریوش) دارا وارث تاج بنا (۵۲۱ ق م) یہ بڑا ہوشمند اور لائق بادشاہ گزرا ہے جس نے توسیع سلطنت کے ساتھ اُس کا نظم و نسق درست کیا اور سارے ملک کی پیمائش کرا کے اُسے بیس اس بڑے بڑے یعنی صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ وسائل آمد و رفت میں ایسی سہولتیں نکالیں کہ دریائے سندھ سے بحر ایجین تک اُس کی وسیع

۱؎ (Cambyses) کمبائی سس یا کامبیز دیکھو ضمیمہ نمبرا ۱۲

مملکت میں جو کچھ ہوتا اُسے بہ سہولت اطلاع مل جاتی بسرکاری محاصل کے عمدہ ضابطے بنائے اور دارک[1] نام سکہ بھی رائج کیا جو سلطنت ایران کے ہر گوشے میں چل سکتا تھا۔

آی آونیہ کے متعلق دارا نے سمجھ لیا تھا کہ وہاں حکومت جابریہ کار واج اُس کے عین مفید مطلب ہوگا۔ پس ہر یونانی شہر میں ایک مطلق العنان حاکم (جابر) مقرر کر دیا جو نیم آزاد رئیسوں کی طرح ایران کا حلقہ بگوش غلام اور اپنی اپنی ریاست کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ یہ طرز حکومت یونانیوں میں پہلے سے متعارف تھا اور ایک آزادی پسند قوم پر حکمرانی کا یہ بہت عمدہ طریقہ بھی تھا کہ خود انہیں کے ایک ہم قوم کو اُن پر مسلط کر دیا جائے جس کی ذاتی اغراض اور اقتدار دارائے عجم کی مہربانیوں پر منحصر ہوں۔

داریوش کی چڑھائی یورپ پر

سلطنت کے انتظام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد دارا ملک گیری کی طرف متوجہ ہوا کہ اُس کے جنگجو اہل وطن نئی کشورستانیوں کے لیے بیتاب تھے مشرق میں غالباً زیادہ فائدے کی امید نہ تھی اور مغرب کی جانب سمندر حایل تھا لیکن فینقیہ اور آی آونیہ پر قبضہ ہو جانے سے ایرانیوں کو بیڑا تیار کرنے میں کوئی دشواری نہ رہی تھی اور اگرچہ وہ سمندر سے بالطبع خوف کھاتے تھے پھر بھی اہل سستھیہ[2] کو سزا دینی ضروری تھی جو کئی مرتبہ ایشیائے کوچک میں لوٹ مار مچا گئے تھے اور آبنائے باسفورس کے پار برفانی علاقوں میں اپنے تئیں محفوظ و مامون سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ باسفورس پر کشتیوں کا پل بھی باندھ لیا گیا تھا جس کی وجہ سے ایرانیوں کو سمندری سفر پیش نہ آیا اور دارا اپنی فوج سمیت یورپ میں اُتر گیا۔ اِدھر چھ سو جہازوں کا ایک آی آونی بیڑا بحر اسود کے راستے دریائے ڈینیوب کے دہانے پر آپہنچا تھا جس نے ایک اور کشتیوں کا پل اس دریا پر تیار کر دیا کہ دارا کی فوجیں اپنی

---

[1] مشرقی ایشیا کا یہ قدیم ترین سکہ ہے جو ۱۳۰ گرین یعنی تقریباً تین چھٹانک طلائے خالص کا ہوتا تھا ۱۲

[2] سستھیہ زمانۂ قدیم میں یورپ وایشیا کے شمالی حصوں کا ایک مبہم نام تھا جہاں ترکمان، قزاق اور اسی قسم کی جنگجو بدوی قومیں رہتی تھیں ۱۲

شمالی یلغار میں وقت نہ اٹھائیں۔ یہاں پہنچکر دارا نے آئی اونی جابروں کو حکم دیا کہ وہ دو مہینے تک اُس کا انتظار اور پل کی حفاظت کریں۔ اور خود ڈینیوب پار شمال میں بڑھ گیا۔ لیکن اس کے بعد ایرانی فوج پر جو کچھ گزری اس کا حال بہت ناقابل یقین روایتوں کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے اور ان افسانوں سے کوئی کارآمد بات نہیں معلوم ہوتی بجز اس کے کہ اُن دنوں یونانیوں کا جغرافیائی علم نہایت ناقص تھا۔ اور وہ یورپ کے ان علاقوں سے تقریباً بالکل ناواقف تھے۔

بہرکیف اس میں شک نہیں کہ خانہ بدوش اہل سیتھیہ کے تعاقب میں دارا کو بڑی زحمت اُٹھانی پڑی۔ سردی کی شدت، خوراک کی نامیسری اور بے پایاں جنگلوں میں راستہ نہ ملنے کی وجہ سے ایرانی فوجیں سخت مصیبت میں مبتلا ہوگئیں اور اس پر اُن کے خونخوار دشمنوں نے اپنے قزاقانہ طریق جنگ سے پریشان کرنا شروع کیا کہ جب کبھی موقع ملتا بادشاہی فوج پر چھاپہ مار کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپتے تھے۔ دو مہینے اسی طرح گزر گئے اور اب یونانی حکام کو جو ڈینیوب پر محافظ مقرر کیے گئے تھے دارا کے مظفر و منصور لوٹنے کا یقین نہ رہا بلکہ خبر ملی کہ وہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہے اور سیتھیہ کے رہزن تیراندازوں کے ہاتھ سے نقصان اُٹھاتا ہوا بہ ہزار خرابی پسپا ہو رہا ہے۔ اُس وقت جنوبی تھریس کے حاکم جابر ملٹیاڈس (مل طیادس) نے جو مولد کے لحاظ سے ایتھنزی تھا اپنے ساتھیوں کو صلاح دی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں اور دریا کا پل توڑ کر "ایشیا کو یورپ میں گھونٹ دیں" جس کا مطلب یہ تھا کہ دارا اگر ڈینیوب کو پار نہ کرسکا تو اس کی فوجیں وہیں سیتھیہ کے جنگلوں میں خوراک نہ ملنے کی وجہ سے ہلاک ہوجائیں گی۔ مگر ملی ٹس (شہر ملیطہ) کے حاکم ہسٹائیس نے اس تجویز کی مخالفت کی اور انہیں یاد دلایا کہ "اگر دارائے عجم ان کی پشتیبانی نہ کرتا تو آج انہیں اپنے علاقوں میں یہ مطلق العنانی حاصل نہ ہوتی۔ اور اب بھی اگر ایرانی حکومت کا سہارا نہ ملے تو اُن کے ہم وطن انہیں خود مختار نہ رہنے دیں گے۔"

اس طرح یونانی کہتے ہیں کہ ہسٹائیس نے مل ٹیاڈس کی بات نہ چلنے دی اور دارا کی فوجیں بلا دقت دریا کو عبور کر آئیں۔

اس کے بعد خود دارا تو سارڈس ہو کر اپنے پایہ تخت کو لوٹ گیا مگر اپنے ایک سپہ سالار میگا بازو کو اسی ہزار فوج کے ساتھ اس نے تھریس میں چھوڑا کہ مقدونیہ تک علاقہ فتح کرکے ایرانی سلطنت میں شامل کرلے۔ چنانچہ اس زمانے میں مقدونیہ کے بادشاہ آمن تاس نے دارائے ایران کی اطاعت قبول کی اور اب اس ایشیائی سلطنت کا دائرہ حکومت مشرقی یورپ میں کوہ اولمپس تک پھیل گیا جو تھسلی اور مقدونیہ کی حد فاصل بناتا ہے۔ ادھر ہسٹائیس کی خیر خواہی بھی بے صلہ نہ رہی اور اسے دریائے سٹرے من پر (جو اب اسٹروما کہلاتا ہے) ایک سرسبز اور وسیع علاقہ عطا ہوا جس میں کوہ پنجیس کی طلائی کانیں بھی شامل تھیں۔ اسی پہاڑ کے قریب ہسٹائیس نے بندرگاہ مرکی نوس[1] کی بنیاد ڈالی اور شاید ایک بڑی سلطنت قائم کرنے کے منصوبے باندھ رہا تھا کہ میگا بازو نے دارا کو اس سے بدظن کر دیا اور وہ ایرانی پایہ تخت سوس میں طلب کر لیا گیا جہاں بادشاہ کی نظر عنایت ہونے کے باوجود اس کی حالت ایک نظربند سردار کی سی ہو گئی کہ ہر چند چاہتا تھا وطن آنے کی اجازت نہ ملتی تھی۔

۲- آی اونی بغاوت

ارس ٹاگورس | مگر ہسٹائیس کا داماد ارس ٹاگورس جو شہر ملی ٹس میں اپنے خسر کا جانشین ہوا، جاہ طلبی میں ہسٹائیس سے دو قدم آگے تھا۔ اسے ہر وقت اپنی قوت اور حکومت بڑھانے کی فکر رہتی اور جب جزیرۂ نک سوس کے امرا اور عوام میں تنازعہ ہوا تو ارس ٹاگورس کو ملک گیری کی حسرت نکالنے کا موقع مل گیا اور دوسرے آی اونی رئیسوں کے علاوہ اس نے ایرانی صوبے دار آرتا فرنس (ارتافرن) کو بھی سبز باغ دکھا کر اپنی شرکت

---

[1] تاریخ المورخین جلد سوم ۲۶۴ لیکن گروٹ اور بری کی تاریخوں میں بنیاد ڈالنے کی بجائے ترقی دینا تحریر ہے ۱۲

پر رضامند کر لیا اور نکسوس پر بحری فوج کشی کی۔ لیکن اُس بحری سردار کو جو ارس ٹاگورس کی مدد پر مقرر کیا گیا تھا، ایک یونانی کی ماتحتی گوارا نہ ہوئی اور کسی معمولی نزاع پر اُس نے اہل نکسوس کو ارس ٹاگورس کے جنگی ارادوں سے مطلع کر دیا۔ حالانکہ مہم کی کامیابی کا بڑا دار ومدار اُس کے مخفی رہنے پر تھا۔ اور جب یہ بات نہ رہی تو چار مہینے کی مسلسل کوشش بھی نکسوس کی تسخیر میں کارگر نہ ہو سکیں اور اب ارس ٹاگورس کو جس نے بہت سا ایرانی روپیہ خرچ کر ڈالا تھا ارتافرنس کی ناراضی کا خوف دامنگیر ہوا۔ اس وقت مدرسہ کے لڑکوں کی طرح جو تھوڑی سی دیر ہو جائے تو سارے دن غیر حاضر رہ کر اپنی ندامت چھپاتے ہیں! ارس ٹاگورس کو بھی جواب دہی سے بچنے کی یہی تدبیر نظر آئی کہ ایرانیوں سے علانیہ سرکشی کی جائے! اور نفس انسانی کے اسی عجیب خواص کی بدولت ہوا کہ بالآخر آئی اونیہ اور ہیلاس میں سالہاسال کے لیے لڑائی کی آگ بھڑک اُٹھی اور ہزارہا انسانوں کا خون پانی ہو کے بہ گیا۔

کہتے ہیں کہ اس فتنہ جوئی پر سب سے زیادہ ارس ٹاگورس کو اُس کے خسر (ہسٹائیس) کے خفیہ پیاموں نے اُبھارا جو ایرانی پایۂ تخت میں رہتے رہتے گھبرا گیا تھا اور جانتا تھا کہ اگر آئی اونیہ میں کوئی شورش ہوئی تو دارا مجھی کو اس کے فرو کرنے کی غرض سے بھیجے گا۔ اور گویا اس بہانے میں اس درباری نظربندی سے نجات پا جاؤں گا۔

بہر حال ارس ٹاگورس بغاوت پر کمربستہ تھا اور اپنے ہموطنوں میں جوش پھیلا رہا تھا کہ ایک غیر قوم کی محکومی کا طوق مذلت گردنوں سے اُتار پھینکیں۔ سب سے اول اُس نے آئی اونی شہروں کے تمام جابر حاکموں کو (جو اُس کے ساتھ نکسوس میں اپنی اپنی فوجیں لیکر آئے تھے) گرفتار کر لیا اور سب شہروں میں جمہوری حکومتیں قائم کر کے اہل شہر کو اجازت دی کہ وہ اپنے پہلے حاکموں کو جو چاہیں سزا دیں۔ چنانچہ ان میں سے اکثر جلاوطن اور بعض قتل کیے گئے (سنہ ۴۹۸ ق م)

اس کے بعد ارس ٹاگورس اسپارٹہ پہنچا اور وہاں کے بادشاہ کلیومینز سے مدد کی درخواست کی۔ مگر جب کلیومینز کو سلطنت ایران کی وسعت کا حال معلوم ہوا کہ اُس کا "پایۂ تخت سمندر سے تین ماہ کے راستے پر واقع ہے" تو اُس نے ایسی "حماقت میں پڑنے سے" انکار کر دیا۔ اور یہاں سے مایوس ہو کر ارس ٹاگورس ایتھنز چلا آیا جہاں مجلس عام میں اُسے تقریر کی اجازت دی گئی۔ اپنی پُر جوش تقریر میں اُس نے ایرانیوں کی دولتمندی کا بڑے مبالغے کے ساتھ ذکر کیا اور مال غنیمت کا لالچ دلا کر بڑا زور اس بات پر دیا کہ ایرانیوں کو ڈھال اور برچھی کا استعمال نہیں آتا اور اس لیے وہ لڑائی میں یونانی سپاہیوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ آخر میں ارس ٹاگورس نے (ملیطہ) ملی ٹس کو ایتھنز کی قدیم نو آبادی اور ایسے نازک وقت میں دستگیری کا مستحق ثابت کیا جس سے اہل ایتھنز بہت متاثر ہوئے اور بیس جہاز اہل آئی اونیہ کی مدد کے لیے بھیجنے کی منظوری دیدی۔

اصل یہ ہے کہ آرتا فرنس کے ساتھ انہیں پہلے سے خصومت تھی کیونکہ اسی ایرانی صوبے دار نے اُن کے مغرور بادشاہ ہپیاس کو پناہ دے رکھی تھی اور جب اُنھوں نے اُسے مانگا، تو بڑی حقارت سے اُن کی درخواست رد کر دی تھی۔ اس کے علاوہ ایتھنز کے اہل الرائے اس بات سے بھی مطمئن تھے کہ اس لڑائی کا بُرے سے بُرا نتیجہ آئی اونیوں کی شکست ہو سکتا ہے جس کا خود اُن کے دور دست ملک پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ ایتھنز کی مثل جزیرہ یوبیہ کی ریاست ارٹیریا نے بھی (جو اپنی پچھلی لڑائیوں میں شہر ملی ٹس کی ممنون اعانت تھی) پانچ جہازوں سے آئی اونی بغاوت میں حصہ لیا اور ۴۹۸ ق م میں یہ سب اتحادی ایفی سس پہنچے جو شہر سارڈس (پایۂ تخت لڈیہ) اور ملی ٹس کے تقریباً وسط میں ایک یونانی نو آبادی تھی۔ پھر اُنھوں نے سارڈس کو اچانک جا گھیرا اور شہر میں گھُس کے آگ لگادی۔ اسی آتش زنی میں سبیلی دیوی کا مندر جل کر خاک ہوا جس کی ایرانی لوگ بھی پرستش اور خاص احترام کرتے تھے۔ لیکن اتحادیوں کی یہ کامیابی بہت عارضی تھی۔

اُنھیں آرتا فرنس کی فوجوں کے آتے ہی پسپا ہونا پڑا اور ایفی سس کے قریب شکست کھائی جس نے اہل ایتھنز کے جوش جنگ پر پانی ڈال دیا اور وہ اپنے آئی اونی دوستوں کو اُن کے حال پر چھوڑ کر بہت جلد گھروں کو لوٹ آئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد اور کئی شہر اس "آزادی کی جنگ" میں شریک ہوگئے اور تقریباً تین سال تک مختلف اقطاع میں لڑائی جاری رہی۔ بایں ہمہ سلطنت ایران کی عظیم فوجی قوت کے سامنے اہل شورش کی کچھ پیش نہ جاسکی۔ ایک ایک کر کے تمام باغی شہر تسخیر ہوتے گئے۔ اور آخر ۴۹۵ ق م میں آئی اونیہ کا سب سے قوی اور مرکزی شہر ملی ٹس بھی محصور ہوگیا۔ ارس ٹاگورس اُس وقت وہاں موجود نہ تھا بلکہ دغابازی سے اپنی جان بچا کر مسر کی نوس بھاگ گیا تھا اور کچھ دن بعد وہیں کی ایک لڑائی میں کام آیا۔ اُس کے خسر ہسٹائیں کا حشر بھی کچھ بہتر نہ ہوا اور ہر چند دارا سے اس نے بڑے بڑے وعدے کیے تھے مگر جب شہر ملی ٹس پہنچا تو اہل شہر نے جو کہ جابروں سے نہایت متنفر ہوگئے تھے اُسے اندر نہ گھسنے دیا اور اس طرح راندہ و درماندہ ہو کر اُس نے سمندری قزاقی کا پیشہ اختیار کیا اور اسی کام میں ایشیائے کوچک کے کسی ساحلی مقام پر مارا گیا۔

ملی ٹس کو محصور ہوتے دیکھ کر اہل آئی اونیہ نے ایک بحری لڑائی لڑنے کا فیصلہ کیا کہ جہاں تک بن پڑے شہر کے سمندری راستے کو بند نہ ہونے دیں۔ لیکن دشمن کی کثرت نے اس کوشش میں بھی اُنہیں ناکام رکھا اور لیڈ کے مقام پر سخت شکست کھائی جس کے بعد ہی ملی ٹس بزور تسخیر کر لیا گیا اور اُس کے تمام باشندے جلاوطن کر دیے گئے۔ اسی قسم کا سخت انتقام دوسرے شہروں سے بھی ایرانیوں نے لیا اور ان کی بہت سی بستیاں تاراج کر ڈالیں۔ مگر جب چند ہی سال بعد اُن میں سے اکثر شہروں کو ہم آباد اور مرفہ الحال پاتے ہیں تو وہ یونانی روایتیں درایتاً صحیح نہیں معلوم ہوتیں جن میں ایرانیوں کے مظالم کا بڑے مبالغے کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آئی اونیہ کی شکست نے تمام یونانیوں کو

غمزدہ کر دیا تھا، خصوصاً اہلِ ایتھنز کو۔ چنانچہ جس وقت فری نی کس نے اپنا ڈراما "تسخیر ملیطہ" (ملی ٹس) وہاں دکھایا تو سارے تماشائی زار و قطار رونے لگے اور آیندہ اس تماشے کی ممانعت کر دی گئی۔ نیز شاعر پر ایک ہزار درہم جرمانہ ہوا کہ اُس نے ایک "وطنی مصیبت کی یاد کیوں تازہ کی"!

ایرانیوں کی فوج کشی یونان پر

پہلی مہم | لیکن اہلِ آئی اونیہ کی سرکشی کے ساتھ ہی دارائے عجم کو ایتھنز اور اِرٹ ریا کی گستاخی بھی یاد تھی جنھوں نے شہر سارڈس کی آتش زنی میں شرکت کی اور گویا سلطنت ایران کے ساتھ چھیڑ نکالی تھی۔ پس اُس کی تنبیہ کے لیے ۴۹۳ء ق م میں دارا نے اپنے داماد مارڈونیس[۲] (ماردونوش) کو ایک بحری مہم دیکر ہیلاس روانہ کیا اور وہ ساحل ساحل چالکی ڈیس کے سہ شاخہ جزیرہ نما تک آیا۔ لیکن یہاں کوہ آتھوس کے گرد گزرتے وقت ایک سمندری طوفان نے اُس کے تین سو جہاز اور بیس ہزار سپاہی تلف کر دیئے جس کے بعد مارڈونیس تھوڑی سی دور بڑھکر واپس ایشیا کو چلا گیا۔ اور یہ مہم یہیں پر ختم ہو گئی۔

دوسری مہم | دوسری مرتبہ دارا نے اور بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاریاں کیں اور پہلے تمام یونانی ریاستوں کو اطاعت قبول کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ بہت سے شہر اور جزیروں نے اُسے اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیا اور اپنے ہاں سے پانی اور مٹی بھیجدی جو کہ اہلِ ایران کے ہاں قبولِ اطاعت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ مگر اسپارٹہ اور ایتھنز میں ایرانی سفیروں کے ساتھ بڑی بدسلوکی کی گئی اور پانی اور مٹی کا مطالبہ سُنکر اسپارٹہ والے ایسے برافروختہ ہوئے کہ اُنھوں نے

---

[۱] فری نی کس ہیلاس نے سب سے قدیم اور بہت مشہور ڈراما نویسوں میں داخل ہے۔ "فنیسی" اس کا سب سے آخری ڈراما ہے جس میں ایرانیوں کے سلامیس پر شکست کھانے کا ذکر ہے اور جو ۴۷۶ء ق م میں دکھایا گیا تھا ۱۲

[۲] Hardonius غالباً مہر نوش پسر اسفندیار ہے جس کا شاہنامہ میں ذکر آیا ہے۔ دیکھو ضمیمہ نمبر ۱ ۱۲

ایرانی ایلچیوں کو کچے کنویں میں لٹکا دیا کہ یہاں پانی بھی موجود ہے اور مٹی بھی"

اس اثنا میں دارا کی فوجی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اب کے مارڈونیس کی بجائے داتیس (ڈے ٹس) اور آرتافرنس ایرانی فوج کے سردار مقرر کیے گئے تھے اور وہ اپنی سوار و پیادہ فوج کو لیکر سلیشیہ کی بندرگاہ ایلیوم سے جہازوں میں روانہ ہوئے جن کی تعداد یونانی مورخ چھ سو بتاتے ہیں۔ اس مرتبہ ایرانیوں نے راستہ بھی وہ اختیار نہ کیا جس میں پچھلی مرتبہ مارڈونیس ایسا نقصان اٹھا چکا تھا۔ بلکہ جزیرہ ساموس تک آکر وہ سیدھے مغرب کی طرف چلے اور جزائر نکسوس و ڈیلوس کو فتح کرتے ہوئے یوبیہ آئے جہاں اوّل انہیں شہر ارٹریا کو سزا دینی منظور تھی۔

اہل ارٹریا نے پہلے اُن سے میدان میں نکل کر لڑنے کا ارادہ کیا تھا اور چار ہزار ایتھنزی بھی مدد کو پہنچ گئے تھے لیکن پھر یہ رائے بدل گئی۔ اہل ایتھنز واپس چلے گئے اور تھوڑے ہی دن میں ایرانیوں نے آکر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ چھ روز تک محصورین حملہ آوروں کے سب حملوں کو روکتے رہے مگر ساتویں دن اُن کے دو معزز شہریوں نے غداری کی اور شہر مسخر ہو گیا۔ ایرانیوں نے اندر داخل ہوتے ہی وہاں کے سارے مندروں کو آگ لگا کر اپنے معبدوں کی بے حرمتی کا انتقام لیا اور شہر کے اکثر باشندے بھی دارا کے حسب الحکم غلام بنا لیے گئے۔ اس فتح کے بعد ایرانیوں نے چند روز دم لیکر اٹیکا کا رُخ کیا اور راستے کی تمام مزاحمتوں کو ہٹاتے ہوئے تے رے تھاں (ماراتن) کے مقام پر پہنچے جو ایتھنز سے تقریباً پچیس میل شمال میں ایک کھلی ہوئی جگہ ہے۔ اس میدان کا انتخاب ہپیاس کی رائے سے کیا گیا تھا اور یہ ہپیاس ابن پی سس ٹراٹس وہی شخص ہے جس کو اہل ایتھنز کا نے بہ مشکل اپنے ملک سے نکال کر جمہوریت قائم کی تھی۔ جیسا کہ اشارۃً اوپر آچکا ہے ہپیاس کو ابھی تک اپنے باپ کے تخت کا دعویٰ تھا اور اپنی پناہ گزینی کے زمانے میں بھی وہ برابر ایرانیوں کو اشتعال دلاتا رہا تھا کہ ایتھنز پر فوج کشی کی جائے۔

[جنگ میرے تھاں] الغرض اسی میدان میں ایرانیوں نے خیمے ڈالے اور شاید اس انتظار میں تھے کہ ہپیاس کے طرفدار خود شہر میں شورش برپا کردیں گے کہ ایتھنز کی فوج اُن سے لڑنے نکلی۔ اس فوج کا شمار ہیروڈوٹس نے نو ہزار بتایا ہے۔ اُس میں ایک ہزار پلاٹیہ کے آدمی بعد میں آملے تھے۔ اور اُن دس سپہ سالاروں (اس ٹرے ٹجی) کے علاوہ جو حسب قاعدہ باری باری ایک ایک دن فوج کی کمان کرتے تھے، ان کا جنگی حاکم (پول مارک) کالی میکس تھا۔ لیکن لڑائی میں سب سے نمایاں حصہ ملٹیاڈیس نے لیا۔ یہ جنوبی تھریس کا وہی سابق حاکم جابر ہے جس نے ڈینیوب کا پل توڑ کر دارا کو سیتھیہ میں پھنسانے کی صلاح دی تھی۔ آیونی بغاوت کے زمانے میں وہ ایرانیوں کے خوف سے اپنے مولد ایتھنز کو بھاگ آیا تھا اور میرے تھاں کی جنگ میں ایک سپہ سالار کی حیثیت سے شریک تھا۔ اور یہ اُسی کی کوشش تھی کہ یونانی فوج نے ایرانیوں پر حملہ کیا ورنہ قلت تعداد کے علاوہ ہر ایرانی جنگ آزما کا ایسا رعب اہل یونان کے دلوں میں سمایا ہوا تھا کہ صورت دیکھکر ڈر جاتے تھے۔

ایرانی سپاہیوں کی تعداد یونانی مورخ ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ بتلاتے ہیں مگر یہ روایت مبالغہ آمیز ہے اور اگر یونانی قول کے بموجب ہم چھ سو جہازوں میں ایرانی فوج کا لایا جانا تسلیم کریں تو زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار آدمیوں کا تخمینہ ہوتا ہے اور جب ایرانیوں کے کثیر سامان جنگ خصوصاً گھوڑوں کے لانے کا لحاظ رکھا جائے تو تعداد اس سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اُن کا شمار جنگ میرے تھاں میں یونانیوں سے بہت زیادہ (غالباً سہ گنا) تھا۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ جگہ کی تنگی نے انھیں اپنی پوری طاقت سے کام نہیں لینے دیا۔ نیز آخر تک دشمن کو ذلیل سمجھنا بھی ان کی ہزیمت کا باعث ہوا جس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ یونانی اپنے پڑاؤ سے دوڑتے ہوئے چلے اور ایرانیوں پر بلائے مبرم کی طرح آن پڑے۔ اوّل اوّل ایرانیوں نے اُن کی قلیل تعداد کو

بہت حقیر سمجھا تھا لیکن صفیں ملتے ہی یہ خیال باطل ہو گیا اور یونانی بازوؤں نے صفوف مقابل کو دھکیل کر منتشر کر دیا جس کے بعد ایرانی قلب جو یونانیوں کو پسپا کرتا ہوا دور تک بڑھ آیا تھا تینوں سمت سے گھر گیا اور پریشان ہو کر اپنے جہازوں کی طرف بھاگا۔ اس کے قدم اُکھڑتے دیکھکر باقی سپاہ کی ہمتیں بھی ٹوٹ گئیں اور وہ بہ عجلت جہازوں میں سوار ہو کر اجی لیہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ (اجی لیہ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جس میں ایرانیوں نے اپنا مال غنیمت اور ارٹ ریا کے قیدی چھوڑ دیئے تھے)

جہازوں میں چڑھتے وقت ایتھنزیوں نے اُن کے بیڑے میں آگ لگانی چاہی تھی مگر عین ساحل پر جو لڑائی ہوئی اُس میں انھیں چنداں کامیابی نہیں ہوئی۔ اُن کا جنگی حاکم کالی مکیس اور بعض دیگر نامی اشخاص بھی یہیں کام آئے اور سات جہازوں کو چھین لینے کے سوائے وہ ایرانیوں کو بھاگنے سے نہ روک سکے۔ بایں ہمہ بغیر اس کے بھی اُنھیں کامل فتح نصیب ہوئی تھی اور لڑائی میں ایرانیوں کے چھ ہزار آدمی مارے گئے تھے حالانکہ یونانی نقصان صرف ایک سو بانوے ۱۹۲ نفوس تھا۔ جانبین کے ان نقصانات کے متعلق پروفیسر جہانی نے اپنے دلچسپ رسالے میں بعض شبہات ظاہر کئے ہیں اور لکھا ہے کہ "ہر چند مفرور فوج کے آدمیوں کا گرفتار ہو ہو کر زیادہ تعداد میں مارا جانا بالکل قرین قیاس ہے، تاہم یونانی روائتیں اس معاملہ میں اکثر مبالغہ آمیز ہوتی ہیں اور اس لیے مقتولین کی جو تعداد اُن میں بتائی گئی ہے اُس پر اعتبار آنا دشوار ہے"۔ اسی ضمن میں پروفیسر جہانی نے اہل ایتھنز کی شجاعت پر بھی کچھ شکوک ظاہر کیے ہیں اور مجموعی طور پر پلاٹیہ اور سلامیس کے آیندہ معرکوں سے معرکہ میرے تھان کو کم درجہ ثابت کیا ہے اگرچہ محقق موصوف کو اقرار ہے کہ شہرت میں کوئی لڑائی بھی میرے تھان سے نہیں بڑھ سکیگی (اپنے کارناموں کی وجہ سے نہیں، بلکہ اُن یادگار تحریروں کی وجہ سے جن میں یہ کارنامے مرقوم ہیں!) گویا قدیم اہل ایتھنز کی بہادری کا سکّہ جو ہزاروں برس سے دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے وہ اُن کی واقعی دلیری کے سبب نہیں بلکہ بیشتر ان کی ادبی

فوقیت اور زور انشا پردازی کی بدولت ہے۔

مل ٹیاڈس | جو کچھ بھی ہو وقت کے وقت تو اس فتح کے کامل اور غیر معمولی ہونے میں کچھ شبہہ نہ تھا۔ کامل ہونے کی دلیل تو یہ کہ حملہ آور واپس لوٹا دیئے گئے۔ غیر معمولی وہ اس وجہ سے بھی کہ ایرانی فتحمندوں کا جو دنیا کی کئی زبردست سلطنتوں کے تختے اُلٹ چکے تھے، حقیر ایتھنز یوں سے شکست پانا گویا چوہے کے ہاتھوں بلی کا مار کھانا تھا۔ اور ایسی حالت میں اگر اہل ایتھنز خوشی سے پھولے نہ سمائے ہوں اور اپنے سپہ سالار مل ٹیاڈس کو قابل پرستش سورما سمجھے ہوں تو تعجب کیا ہے؟ مگر مل ٹیاڈس وہ شخص تھا جس نے سالہا سال تک شخصی بادشاہت کی تھی اور جب اہل وطن میں بھی اُس کی ہر دل عزیزی اور قوت بڑھی تو اس کی خود پسندی، کو بھی آئین جمہوریت کی حدود سے باہر نکل جانے موقع مل گیا۔ اُس نے لوگوں سے ستر جہازوں کا بیڑا اور ایک معقول فوج مہیا کرنے کی استدعا کی اور ان تیاریوں کی غایت بتائے بغیر جزیرۂ پاروس پر حملہ کر دیا حالانکہ شہر ایتھنز کی اُس ریاست سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ اور ہیروڈوٹس کے بقول صرف ذاتی کاوش کی بنا پر مل ٹیاڈس اس جزیرے کو تاراج کرنا چاہتا تھا۔ مگر اہل جزیرہ نے چند روز چالاکی سے اُسے مصالحت آمیز باتوں میں لگا کر اپنی فصیلیں درست کر لیں اور پھر قلعہ بند ہو کر ایسے لڑے کہ مل ٹیاڈس تقریباً ایک مہینے کی جدوجہد کے باوجود اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور خود زخمی ہو کر ناکام و نامراد واپس ایتھنز چلا آیا۔

اہل شہر پہلے ہی اُس کی مہم سے بددل ہو رہے تھے اس ناکام واپسی پر سخت ناراض ہوئے اور مل ٹیاڈس پر لوگوں کو فریب دینے کا مقدمہ قائم کیا۔ عدالت عام کے روبرو وہ اپنی صفائی میں بھی کچھ نہ کہہ سکا اور اس لیے اُس پر پچاس ٹیلنٹ (یعنی پونے دو لاکھ روپیہ) جرمانہ کیا گیا۔ ادھر اُس کی ران پک کر گھاؤ ہو گیا تھا اور اسی زخم سے وہ چند روز بعد رسوائی اور کس مپرسی کی حالت میں مر گیا۔

فاتح میرے تھاں کا یہ انجام ایسا رنج دہ ہے کہ بعض قدیم اور جدید مورخوں نے ایتھنز کی جمہوری حکومت کو محسن کُشی اور ناروا تلون کا مجرم ٹھہرایا ہے اور لکھا ہے کہ وہاں کے لوگ ہمیشہ اپنے مقتدر اشخاص کے دشمن ہو جاتے اور از رہ حسد اُنھیں پست و سرنگوں کر دیا کرتے تھے۔ مگر یونانی جمہوریت کا مدّاح، گروٹ ان الزاموں کو بالکل بے اصل ثابت کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ درحقیقت "اُن مقتدر افراد ہی میں یہ جبلّی نقص ہوتا تھا کہ ہر دل عزیزی اور اختیارات پا کر خود پرستی کا شکار بن جاتے اور قوم کو اپنی شخصی اغراض کے ماتحت لانا اور چلانا چاہتے تھے۔ پس ایسی صورت میں جمہور کا اُن سے اپنی دی ہوئی عزت چھین لینا بالکل جائز اور قابل تعریف استعمال قوت تھا نہ کہ لایق مذمت تلوّن"!

اسی قسم کی ایک اور مثال ہمیں مل ٹیاڈس کے بعد تمس طاکلیس کی سرگزشت میں ملتی ہے جو اپنی بیش بہا خدمات کی وجہ سے اوّل قوم کا مخدوم اور پھر اپنی شخصیت پسندی کی بنا پر معتوب و منکوب ہوا اور جس کا ذکر سلسلے کے اعتبار سے بھی اسی مقام پر تاریخوں میں آتا ہے۔

تمس طاکلیس | جنگ میرے تھاں کے بعد ایتھنز میں اَرِس تدیز (ارس طیدِس) اور اُس کے حریف تمس طاکلیس کو بڑا فروغ ہوا۔ ارس تدیز ایک منکسر مزاج خادم وطن تھا اور اُس کی مفلسی اس کی امانت اور بے لوثی کو اور زیادہ نمایاں کرتی تھی۔ مگر تمس طاکلیس زیادہ چالاک، جاہ طلب اور تیز فہم شہری تھا اور بہت پہلے سے یقین رکھتا تھا کہ ایرانی پھر یونان پر فوج کشی کریں گے۔ حالانکہ اُس کے اور ہم وطن اس اندیشے کو وہم سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے اور میرے تھاں کی فتح کے بعد سے بالکل مطمئن ہو گئے تھے۔ البتہ جزیرہ اے جی نا سے اُن کی مسلسل لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور اسی لیے تمس طاکلیس نے اپنی بحری قوت بڑھانے کی جو تجویزیں پیش کیں انھیں ایجی نا کے برسرِ جنگ ہونے سے بڑی تقویت پہنچی اور اُس نے اسی بہانے اپنے اہل وطن کو ایک زبردست بیڑا بنانے پر

آمادہ کر لیا کہ بغیر بحری قوت کے ایتھنز کا کسی جزیرے پر فتح پانا دشوار تھا۔

جب اہل شہر اس کی تدبیر و صلاح سے ایک معقول رقم بیڑے کی تیاری پر صرف کرنے لگے تو تمس طاکلیس نے پیرؔوز (یا پائیریئس) کے باموقع ساحل پر نہایت عمدہ بندرگاہ اور جہاز سازی کے کارخانے بنوائے اور چند سال میں دو سو جہازوں کا بیڑا تیار کر لیا جو اُس زمانے میں بہت بڑی چیز تھا۔ ساتھ ہی بحری تجارت کو اُس نے فروغ دیا اور اپنے ہم وطنوں کو رفتہ رفتہ اُس رستے پر ڈالا جس پر چل کر وہ ایک دن یونان کی سب سے زبردست "قوم" بن گئے اور ایتھنز کو "ملکۂ بحر" کا شاندار خطاب حاصل ہوا۔

ارِس تدیز تمس طاکلیس کی ان تجویزوں کا ارؔس تدیز (ارس طیدش) نہایت مخالف تھا۔ اُس کے خیال میں برّی فوج ایتھنز کی مدافعت اور حیات، یعنی آزاد حکومت قومی کے تحفظ کے لیے کافی تھی۔ اور چونکہ یہ فوج زمینداروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ جس کے زرعی پیشے کو بحری خدمت سے مطلق مناسبت نہ تھی، پس ارؔس تدیز کہتا تھا کہ "اگر بیڑا بنایا گیا تو اُس کی بحری فوج میں زیادہ تر مزدوری پیشہ لوگ بھرتی ہوں گے اور انہی کا رسوخ معاملات ملکی میں بھی بڑھ جائے گا۔ اور یہ انقلاب پیدا کرنا انصاف اور دانش مندی دونوں کے خلاف ہوگا۔ نیز بحری تجارت کی ترقی سے بیرونی تعلقات بڑھیں گے اور ممالک غیر کے نئے نئے خیالات آ کر قوم کی متین اور خاموش زندگی میں ہمیشہ ہل چل مچاتے رہیں گے۔"

اسی قسم کی دلیلیں تھیں جو ارؔس تدیز اپنے جدت پسند حریف کے خلاف پیش کرتا تھا اور گو ان میں قدامت پرستی کا رنگ جھلکے اس میں شبہہ نہ تھا کہ وہ خلوص اور سچی خیر خواہی سے انھیں پیش کرتا تھا۔ یہی پاک باطنی اور صداقت اُس کی بڑی قوت تھی۔ بایں ہمہ جب ان سیاسی کشمکشوں نے فتویٰ عام طلب کرنے کی نوبت پہنچائی تو ارؔس تدیز ناکامیاب ہوا اور جمہور کی رائے نے حسب قانون اُس کا دس سال کے لیے اخراج کر دیا۔ اس واقعہ کو بھی اکثر اہل تحقیق یونانی جمہور کی احسان فراموشی اور حسد کی مثال بتاتے ہیں۔ لیکن

گروٹ کہتا ہی کہ "جب اختلاف کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایتھنزی آئین کے مطابق قوم کا آخری فیصلہ لینا ضروری ہوا (اور یہ ہم لکھ چکے ہیں کہ اُس زمانے میں ایسا فیصلہ اور سزائے اخراج خانہ جنگیاں روکنے کی بہترین تدبیر تھی) تو حق یہ ہی کہ اخلاقی اوصاف میں کم درجہ ہونے کے باوجود تھمس طاکلیس اس زمانے میں سلطنت کے لیے زیادہ کارآمد اور ضروری رکن تھا اور اُس کے حریف اَرِس تدیز کا ہٹا دیا جانا قوم کے واسطے یقیناً آیۂ رحمت ہوا کہ تھمس طاکلیس کو اپنی اعلیٰ تجاویز بہ آسانی عمل میں لانے کا موقع مل گیا جو نہ صرف ایتھنز کی نجات بلکہ آخر میں اُس کے عروج کا قوی ترین سبب ثابت ہوئیں۔"

۴۔ ایران کی تیسری یورش

لیکن اب ہم تاریخ یونان کے اُس زمانے تک آ گئے ہیں جسے قدیم ہیلاس اور موجودہ یورپ یونانیوں کا سب سے زیادہ قابل فخر زمانہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ہیلاس قومی حیات اور آزادی کے لیے اپنی یادگار ترین لڑائیاں لڑا۔ اور ایک جوشیلے مصنف کے الفاظ میں "اسی جدوجہد میں اُس نے یورپ کی روح کو ایشیا کا غلام بن جانے سے بچایا اور گویا انسانی مساوات اور آئینی آزادی کے اُس تخم کو پامال نہ ہونے دیا جس کا ایرانی استبداد کے ہاتھوں فنا ہو جانا یقینی نظر آتا تھا۔"

اس کے علاوہ یونانیوں کے فخر کو چند در چند بڑھا دینے والی وہ حیرت انگیز شجاعت ہی جو ایران کی عظیم الشان فوجوں کے سامنے اُن سے ظہور میں آئی، کیونکہ دارَیوش کی وفات (۴۸۵ ق م) کے بعد جب اُس کے جانشین زرکسیز[1] (یا زرزیر) نے حملے کی تیاریاں ایک بے مثال پیمانے پر مکمل کیں تو ہیروڈوٹس کی روایت کے بموجب اُس کے انبوہ عظیم کی تعداد باون لاکھ تراسی ہزار سے بھی کچھ زیادہ تھی! اس ناقابل قیاس تعداد کے متعلق یورپ کے

---

[1] Xerxes کر بسس یا "خشیار شا"۔ ان ایرانی بادشاہوں کے ناموں کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمۂ اول ۱۲

محققوں کو سخت تردد پیش آئے ہیں اور چونکہ ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ اُن راویوں کی سند پر تیار کی ہے جو بذات خود ایرانی محاربات میں شریک تھے۔ پس اہل الرائے کا ایک معقول گروہ اُس کے بیان کو مستند جانتا ہے اور اس خلاف عقل تعداد فوج کی تاویل یوں کرتا ہے کہ اس شمار میں تمام لشکری اور بھیر شامل تھی ورنہ خاص سپاہی "غالباً دس لاکھ کے قریب تھے" مزید براں ہیروڈوٹس کے مستند ہونے کی ایک یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اُس نے اپنی تاریخ اولمپیہ کے عام میلے میں سنائی تھی جہاں ہزاروں وہ لوگ موجود تھے جو ایرانی لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے اور مورخ ایسے مجمع میں غلط روائتیں بیان کرنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا اور کرتا تو اُس پر ضرور گرفت کی جاتی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا اور اس واسطے کہنا چاہیے کہ یونانیوں نے بہ اجماع ہیروڈوٹس کی تاریخ پر اپنی مُہر تصدیق ثبت کردی۔

مگر ایک گروہ جس کی تحقیق اور اعتدال پسندی کا سب کو اقرار ہے ان روایتوں کو مبالغہ آمیز بتاتا ہے اور اُس کے نزدیک غالباً زرکسیز کے پاس باقاعدہ سپاہ کی تعداد یونانیوں سے کچھ بہت زیادہ نہ تھی۔ باقی حصہ کثیر اُس کے لشکر میں بھیر کا تھا جس میں زیادہ تر آدمی سامان ضروریات کی فراہمی کے واسطے تھے اور ایک بڑی تعداد لوٹ کے لالچ میں ساتھ ہوگئی تھی جیسا کہ تمام ایشیائی ملکوں میں دستور ہے[۱۵]۔

لیکن شاہنشاہ ایران کے بیڑے کی نسبت بالعموم سب مورخ متفق ہیں کہ اُس میں بارہ سو جنگی اور تین ہزار باربردار چھوٹے جہاز شامل تھے جنھوں نے اُس کا آبنائے دردانیال پر خیر مقدم کیا اور پھر بڑی فوج کے ساتھ ایتھنز تک آئے۔ یہ بیڑا بھی (بری افواج کی شکل جو ڈینیوب سے اٹک اور نیل سے لگ کے سیحوں تک چھیالیس مختلف اقوام کے سپاہیوں سے مرکب تھیں) ایرانیوں کے مختلف بحری مقبوضات نے فراہم کیا تھا اور جس وقت دارائے عجم نے اپنی ٹروز کی پہاڑی سے (جو موجودہ ترکی قلعہ سلطانیہ کے پاس واقع ہے) جہاں اُس کے

---

۱۵ رنیل۔ تاریخ المورخین جلد سوم صفحہ ۳۰۲

واسطے سنگ مرمر کا تخت بچھایا گیا تھا اس بری اور بحری فوج کا جایزہ لیا اور خیال کیا ہوگا کہ وہ سب اُس کے بندۂ حکم اور اشارے کے منتظر وہاں جمع ہوئے ہیں تو کیا عجب ہے کہ اُس کا یہ متکبرانہ یقین کہ "تمام دنیا ایرانی بادشاہوں کی غلامی کے واسطے خلق ہوئی ہے" زیادہ راسخ واستوار ہو گیا ہو۔ اسی قسم کے منظر شخصی بادشاہوں کے غرور و خود پرستی کو بڑھا کر اُنھیں نمرود و فرعون بناتے ہیں۔

یونانیوں کی مدافعانہ تیاریاں ابھی زرکسیز اپنے ہیبت انگیز لشکر کو لے کر آبنائے دردانیال سے پار نہ ہوا تھا اور صرف اُس کی تیاریوں کی وحشت ناک خبریں آئی تھیں کہ ایتھنز اور اسپارٹہ کی طرف سے تمام یونانی ریاستوں کے وکیل مدعو کیے گئے اور خاک نائے کورنتھ پر ایک یادگار جلسہ منعقد ہوا جس میں حاسد آرگس اور اکایئہ کے سوا جزیرہ نمائے پیلوپنی سس کی سب ریاستیں شریک تھیں۔ ایٹی کا اور بھی تھی اور بیوشیہ سے شہر پلاٹیہ اور تھس پیہ کے وکلا آئے تھے اگرچہ وہاں کی مقتدر حکومت تھبز نے ایتھنز کی عداوت میں اب بھی کینہ نکالا اور دشمنان وطن کا پہلو لے رکھا تھا۔ یونانی نو آبادیوں نے امداد کی درخواست پر کوئی توجہ نہ کی تھی اور یوں حقیر ہیلاس کا اور بھی حقیر حصہ تھا جو مادر وطن کی حفاظت کے لیے اس موقع پر متحد ہوا تھا۔ اگرچہ یہ اتحاد اپنی ندرت اور اہمیت کے اعتبار سے تاریخ یونان کا نہایت غیر معمولی واقعہ ہے کہ وہاں کی شہری ریاستیں ہم قومی کے باوجود اتنی متمدن نہ ہوئی تھیں کہ سارے ملک کے واسطے مل کر کام کریں۔ اُن کی حب وطن محض اپنے چھوٹے چھوٹے علاقوں تک محدود تھی اور یہ بھی اسپارٹہ کے اقتدار اور ایتھنز کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ایک عام خطرے نے اُنھیں اپنی مدافعت پر آمادہ کیا۔ نیز اُنھوں نے باتفاق طے کیا کہ ایرانی خطرے سے نجات ملتے ہی اُن ریاستوں کو سزا دیں گے جو اس موقع پر کمال غداری سے دشمنان وطن کے ساتھ جا ملی ہیں۔

ٹیمپی اور تھرموپلی اس عرصے میں زرکسیز اپنے لاؤ لشکر سمیت کشتیوں کا پُل باندھ کر

آبنائے دردانیال کو عبور کر آیا تھا اور یونانی اتحادیوں کی فوج اُسے درۂ ٹیم پی (ٹائمپ) پر روکنے کی غرض سے تھسلی بھیج دی گئی تھی، مگر یہ مقام بھی مخدوش نظر آیا تو وہ تھسلی کو چھوڑ کر تھرموپلی کے مشہور درے پر ہٹ آئے جو نہایت تنگ اور دشوار گزار پہاڑی راستہ ہے اور جہاں قدرتی موقعوں سے فائدہ اُٹھا کر تھوڑی سی فوج بڑے سے بڑے لشکر کا راستہ روک سکتی تھی۔ اس جگہ یونانی مدافعین کا شمار ہیروڈوٹس نے پانچ ہزار دو سو اور دیوڈورس نے تیرہ ہزار آٹھ سو بتایا ہے جس میں تین سو اسپارٹی اور سات سو تھسپی سپاہی خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ آخری دم تک نہ ہٹے اور اپنے سپہ سالار لیونی ڈس شاہ اسپارٹہ سمیت سب کے سب یہیں مارے گئے۔

یونانی بیڑا آرٹمی زیم پر متعین کیا گیا تھا جو یوبیہ کے شمال مغربی گوشے پر واقع ہے۔ اور اس کا مدعا یہ تھا کہ ایرانی جہازوں کو آبنائے یوبیہ میں نہ داخل ہونے دے مبادا وہ سمندر سمندر جا کر تھرموپلی کے عقب میں اپنی فوج اتار دیں۔ اس بیڑے میں اگرچہ ایتھنز کے آدھے سے زیادہ جہاز تھے پھر بھی اُس کی کمان ایک اسپارٹی امیر البحر کے ہاتھ میں تھی اور یہ واقعہ اہل ایتھنز کی عاقلانہ بے نفسی تصور کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے جھگڑا کیے بغیر اپنے تئیں اسپارٹہ کی قیادت میں دے دیا تھا۔

اور اب "خداوند ایرانیاں"، بھی منزل منزل کوچ کرتا اور یونانیوں پر اپنا دبدبہ بٹھاتا ہوا علاقہ لوکرس کی سرحد پر آ پہنچا جس کے راستے کو لیونی ڈس کی قلیل فوج روکے پڑی تھی اور جس کی جمعیت اتنی کم تھی کہ زرکسیز کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ ایرانیوں سے فی الواقع لڑنے آئے ہیں۔ اور شاید اسی باعث چار دن ٹھیر کر پانچویں دن اُس نے ہلّے کا حکم دیا۔ دو دن تک درے پر سخت لڑائی ہوتی رہی لیکن بدنصیبی سے اُسی شام دشمن کو ایک اور راستے کا پتہ مل گیا اور ان کی معقول جمعیت راتوں رات لیونی ڈس کے عقب میں آ پہنچی۔ یہ دیکھکر مدافعین کی امیدیں ٹوٹ گئیں اور سرداران فوج نے مشورہ

کیا کہ جس طرح ممکن ہو اپنی ہراولی سپاہ کو بچا کر ہٹا لے جائیں۔ اُس وقت مایوس لیونی ڈس نے سب کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن چونکہ اسپارٹہ کے قانون میں سپاہی کا جنگ چھڑنے کے بعد اپنی جگہ سے ہٹنا ممنوع تھا، اور خود اُسے موت کی پروا نہ تھی، لہٰذا وہ تین سو سپاہیوں سمیت وہیں قائم رہا اور تھس پیہ کے سات سو جوان مردوں نے بھی نام نیک اور خدمت وطن کے لیے مرنے کو ترجیح دی۔

جب سورج طلوع ہوا تو ایک ہزار فدائیوں کا یہ سر بکف گروہ اپنی چھوٹی چھوٹی تلواریں اور برچھیاں لیے ہوئے نکلا اور شیروں کی طرح زرکسیز کی لاتعداد فوج پر آ پڑا جو دوسرے راستے سے چکر کھا کے آتی اور پہاڑی میدانوں میں ساحل سمندر تک پھیلتی جاتی تھی لیونی ڈس کا ارمان تو اسی حملے میں پورا ہو گیا کہ وہ موت کے شوق میں سب سے آگے بڑھا ہوا تھا اور پہلی ہی آویزش میں کاری زخم کھا کے گر گیا۔ لیکن اُس کے ساتھیوں نے بعد میں اپنی خندقوں کے پیچھے ایک بلند مقام پر قدم جمائے اور جب تک ایک متنفس بھی زندہ رہا نیزہ و تلوار اور آخر میں ہاتھوں اور دانتوں سے لڑتے رہے یہاں تک کہ سب اسی جگہ کام آئے۔

تھرموپلی کا یادگار معرکہ اس طرح آٹھ دن کے اندر ختم ہو گیا۔ یہ حقیقت کہ وہ یونانی شکست تھی، ہزار تاویلوں کے باوجود بھی نہیں بدل سکتی۔ مگر اس میں ذرا شک نہیں کہ لیونی ڈس کی بے مثال قربانی بیکار نہ گئی اور اُس کے ہم وطنوں میں اس فداکاری نے وہ جوش حمیت پیدا کر دیا جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ یعنی یا تو اُن میں بہت سے لوگ مذبذب اور خائف تھے کہ دارائے عجم سے مقابلہ کرنا محض مجنونانہ خودکشی ہو گا۔ اور یا تھرموپلی کے بعد ہر دل میں غیرت و آزادی ایثار و جانبازی کے شریف جذبات مشتعل ہو گئے۔ اُنھیں یاد آ گیا کہ خدمت وطن نہ سہی، خود ایسی موت جو اختیاری ہو غلامانہ زندگی سے ہزار درجے بہتر ہے اور افراد یا جماعتوں کی ہستی اسی وقت

تک دلکش اور قابل قدر چیز ہے جب تک کہ وہ اپنی قسمتوں کے مالک آپ ہوں۔

ارتمی زیئیم

لیکن ہمیں پھر میدان قتال کی طرف لوٹنا چاہیے کہ جس وقت تھرموپلی پر یونان کا سب سے بیش قیمت خون برس رہا تھا اسی روز یونانی جہازوں کی بھی ایرانی بیڑے سے پہلی ٹکر ہوئی۔ ایرانی امیر البحر نے اول اول اس کم تعداد دشمن کو گھیر لینے کا ارادہ کیا تھا اور دو سو جہاز اس غرض سے بھیجے تھے کہ جزیرہ یوبیہ کے گرد ہوتے ہوئے، یونانی بیڑے کی پشت پر آ جائیں۔ اور یونانیوں کو واپس ہونے کا موقع نہ دیں۔ کیونکہ یہ ایرانیوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ (یونانی) دارا کے زبردست بیڑے سے مرعوب ہو چکے ہیں اور اتنی بڑی تعداد کے سامنے پڑنے سے ڈرتے ہیں۔ اور اس میں شبہہ نہیں کہ اگر اہل یوبیہ تمس طاکلیس کو ایک کثیر رقم نذرانے میں نہ دیتے تو یونانی افسران بحری اپنے ارادے کے مطابق وہاں سے ہٹ جاتے۔ لیکن جب تمس طاکلیس نے بہت اصرار کیا اور دوسرے دن پچاس اور جہاز بھی ان کی مدد کو پہنچ گئے تو اُنھوں نے ڈرتے ڈرتے ایرانی بیڑے پر حملہ کیا اور دو دن تک بڑی ہوشیاری اور کامیابی سے دشمن کو نقصان پہنچاتے رہے۔ تیسرے دن خبر آئی کہ وہ دو سو ایرانی جہاز جنھیں یوبیہ کے گرد بھیجا گیا تھا ایک سمندری طوفان میں پھنسکر برباد ہو گئے اور شاید اسی رنج و غصہ میں اس روز دشمن نے پوری قوت سے حملہ کیا اور گو فیصلہ کن فتح نہ پائی تاہم یونانیوں کے دل چھوٹ گئے۔ اور دوسری صبح کو لیونی ڈوس کی سرفروش فوج کے کٹ جانے کا حال سُنکر اُنھوں نے وہاں ٹھیرنا بھی بےسود سمجھا اور بہ عجلت رودبار یوبیہ کو طے کر کے جنوب اٹی کا اور پھر آہنائے سلامیس تک چلے آئے جو اٹی کا اور جزیرۂ اجی نا کے درمیان ایک تنگ اور محفوظ قطعۂ سمندر ہے۔

ایتھنز کی تسخیر اور بربادی

اس عرصہ میں زرکسیز کا جم غفیر بھی اپنی آخری منزل انتقام یعنی ایتھنز کے ارادے سے روانہ ہو چکا تھا۔ اُس کے بعض دستے بیوشیہ اور لوکرس کے علاقوں

میں پھیل گئے تھے اور جو آبادی ایرانی اطاعت قبول کرنے میں تامل کرتی اُسے تاراج و پامال کر دیتے تھے۔ اُس وقت اہل ایتھنز یہ امید کر رہے تھے کہ اسپارٹہ اور اُس کے حلیف حسب وعدہ ایٹی کا کو بچانے کی کوشش کریں گے اور سخت مزاحمت بغیر حملہ آور ایتھنز تک نہ بڑھ سکیں گے۔ مگر اُن کی یہ امید پوری نہ ہوئی اور تھرموپلی کے بعد پیلوپنیسس والوں کو صرف اپنا جنوبی علاقہ بچانے کی فکر پڑ گئی اور وہ بڑی عجلت کے ساتھ خاکنائے کورنتھ پر مدافعانہ استحکامات تیار کرنے لگے۔ اس طرح عین وقت کے وقت ایتھنز اکیلا اور زرکسیز کی بے شمار فوجوں کے سامنے بے دست و پا رہ گیا اور اُس کے باشندے جنھیں غیروں کے آگے کسی حال میں سر جھکانا قبول نہ تھا مجبور ہو گئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنے گھر چھوڑ کر نکل جائیں۔ چنانچہ چھ دن کی تنگ مہلت میں اُنھوں نے سارے علاقے کی آبادی کو ایتھنز میں جمع کر کے سلامیس، ایجی نا اور ٹریزن کے قصبوں میں پہنچا دیا اور چند آدمیوں کے سوائے جو ایتھنز کے قلعے اکروپولس میں اپنی خوشی سے رہ گئے تھے، سارا ملک خالی ہو گیا۔

ایٹی کا سے وہاں کے غیور باشندوں کی اس مجبورانہ روانگی کا حال ہیروڈوٹس نے تفصیل کے ساتھ اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ اور ان کے بوڑھے، بچے، عورت، مرد تمام آبادی کا اپنے گھروں سے روتے ہوئے نکلنا اور وطن کا ماتم کرتے ہوئے ساحل فلیرم سے لنگر اُٹھانا دیکھکر کونسا دل ہوگا جو متاثر نہ ہو۔ لیکن ان کے حکام نے جس طرح ممکن ہوا اس رنج و مایوسی کے عالم میں سارا انتظام سفر مکمل کر لیا اور زرکسیز کے پہنچنے سے پہلے وہاں کے لوگ اُس کی دسترس کے باہر پہنچ چکے تھے۔ پھر بھی سارڈس کی آتش زنی کا انتقام لینے کے لیے ایتھنز کے در و دیوار، معابد و عمارات موجود تھے اور دارائے عجم نے انھی کو جلا کر اپنا دل ٹھنڈا کر لیا۔

جنگ سلامیس | خانہ برباد اہل ایتھنز کے پاس اب اپنے جہازوں کے سوائے کوئی چیز

باقی نہ تھی۔ اور جب یہ جہاز آبنائے سلامیس میں ایرانی بیڑے کے مقابل آئے تو اُن کی ساری امیدیں اسی بحری معرکہ پر منحصر ہوگئیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو پھر وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ اس وقت اُن کی متحدہ قوت ایرانیوں کی نسبت ایک تہائی[1] تھی اور لڑائی شروع ہوئی تو یونانی جہاز راں خوف کھا کر ساحل سلامیس کی طرف ہٹ آئے تھے۔ لیکن ایرانی بیڑا آگے بڑھتے ہی آبنائے کی تنگ کھاڑیوں میں اُلجھ گیا اور جہازوں کی کثرت خود اُس کی تباہی کا باعث بن گئی۔ کیونکہ اس حالت میں کہ ایرانی جہاز تنگی مقامات کی وجہ سے آزادانہ حرکت نہ کر سکتے تھے۔ یونانیوں نے اُن پر حملہ کیا اور بڑی ہوشیاری سے شام تک اس طرح لڑتے رہے کہ ہر مقابلہ برابر کی تعداد سے ہوا جس کا اُنھیں خداداد موقع مل گیا تھا۔

جب رات کے اندھیرے نے فریقین کو جدا کیا تو ڈیوڈورس کی روایت کے بموجب ایرانیوں کے دو سو جہاز ضائع اور بیکار ہو چکے تھے، حالانکہ یونانی نقصان صرف چالیس جہاز تھا۔ لیکن سب سے بڑی چیز وہ اثر تھا جو اس لڑائی نے جانبین کے دلوں پر ڈالا۔ یونانیوں کی ہمت بندھ گئی تھی اور وہ زیادہ جوش کے ساتھ دوسرے دن لڑائی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ برخلاف اس کے زرکسیز جس کی آنکھوں کے سامنے یہ لڑائی ہوئی تھی، ہراساں تھا۔ اُس کے بیڑے میں مختلف قوموں کے جہاز شامل تھے اور اُن میں آیونیہ والوں کی نسبت وہ جانتا تھا کہ دل میں ضرور یونانیوں کے طرفدار ہوں گے۔ غالباً اس لڑائی نے اس کے وہم و بدظنی کو بڑھا دیا اور یہ سمجھکر کہ ایرانی مہم کا مقصد پورا ہو گیا ہے اُس نے بیڑے کی واپسی کا حکم دیا کہ وہ جا کر آبنائے دردانیال کے پل کی حفاظت کرے جسے ڈر تھا کہ کہیں یونانی توڑ نہ ڈالیں۔ ساتھ ہی پانچ مہینے کے پُر صعوبت سفر اور

---

[1] یونانی اتحادیوں کے کل جہاز تین سو چھیاسٹھ تھے اور ایرانی بیڑا تقریباً ایک ہزار جہاز پر مشتمل تھا ۱۲

لڑائیوں سے خستہ ہو کر خود بھی اُس نے مُراجعت کی اور تھوڑی سی فوج اپنے پیچھے یونان میں چھوڑ کر ایشیا کو پھر گیا۔

جنگ پلاٹیہ لیکن یونانی روایتوں سے یہ باقی ماندہ فوج بھی تعداد میں تین لاکھ تھی اور اس کا سپہ سالار مارڈونیس تھا جسے ہیروڈوٹس اس آخری ایرانی مہم کا بانی مبانی اور یونانی آزادی کا سخت دشمن قرار دیتا ہے۔ ۴۷۹ ق م کے شروع تک سارے جاڑے وہ تھسلی میں خاموش پڑا رہا۔ لیکن گرمی آتے ہی اُس نے دوبارہ ایٹی کا پر یورش کی اور اہل ایتھنز کو پھر اپنے گھر چھوڑ کر نکلنا پڑا۔ اس مرتبہ بھی اسپارٹہ مدد دینے میں لیت ولعل کرتا رہا۔ مگر ایتھنز کی دوسری دفعہ بربادی کے بعد آخر کار وہاں کے اہل لڑائے مارڈونیس کے مقابلے پر آمادہ ہوگئے اور یونانی اتحادیوں کی پوری فوج مجتمع کی گئی جس کا شمار ایک لاکھ دس ہزار بتایا گیا ہے۔ یہ پوسے نیاس کے زیر کمان تھی۔ جو شہید قوم لیونی ڈس کے کم سن بیٹے کا اتالیق تھا۔ پلاٹیہ کے مشہور میدان میں دونوں لشکروں کا سامنا ہوا اور وہ دس دن تک ایک دوسرے سے چند فرلانگ کے فاصل پر پڑے رہے۔ گیارہویں دن پوسے نیاس نے جو اس مقام کو حملے کے لیے نامناسب سمجھتا تھا اپنی فوج کو ہٹنے کا حکم دیا مگر رات کے وقت اس حکم کی تعمیل نے سپاہیوں کو ایسا بے ترتیب کر دیا کہ جب صبح ہوئی تو اُن کے بعض حصے جمعیت اصلیہ سے دور اور بعض بالکل جُدا ہوگئے اسی حال میں ایرانیوں نے اُن پر حملہ کیا اور تیروں سے دیر تک اسپارٹہ والوں کو نقصان پہنچاتے رہے۔ لیکن جب دونوں فوجیں مل گئیں اور دست بدست لڑائی کی نوبت پہنچی تو ایرانی سپاہی مقابلے میں نہ ٹھہر سکے اور اپنی لشکر گاہ کی طرف بھاگے جو چند ناکام حملوں کے بعد تسخیر کر لی گئی۔ اس موقع پر ہزاروں ایرانی کام آئے اور انھیں ایسی سخت ہزیمت ہوئی کہ پھر ہیلاس میں حملہ آور فوج کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ مارڈونیس مارا گیا، اُس کے تمام ساتھی تتر بتر ہوگئے اور ایرانی مہم کا اسی عبرت ناک

انجام پر خاتمہ ہو گیا۔
پلاٹیہ (پلاتہ) کی مشہور لڑائی کا مختصر حال یہ تھا۔ جسے یونانی مصنفوں نے بڑی رنگینی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور چونکہ خاص اسی دن اُن کی بحری سپاہ نے بھی ایشیائے کوچک کے ساحل پر ایک زبردست فتح حاصل کی تھی جس نے آئی اونیہ کو ایران کے پنجہ ستم سے نجات دلادی۔ پس "یوم پلاٹیہ" ہیلاس کی تاریخ میں اور بھی زیادہ یادگار دن سمجھا جانے لگا۔ اور اب تک یورپ کے بعض مورخ اور شعرا اس کا نام آتے ہی جوش مسرت سے بے اختیار ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یونان و فارس کا نہیں، بلکہ پلاٹیہ کے میدان میں مشرق و مغرب کی شجاعت کا امتحان تھا جس کا نتیجہ اقبال مند یورپ کی فتح اور ایشیا کی ذلت و ہزیمت ہوا۔ مگر یورپ میں بعض اوقات دروغگوئی شرط وطن پرستی بن جاتی ہے اور اس عام خصوصیت سے قدیم یونانی مستثنیٰ نہ تھے۔ چنانچہ جنگ پلاٹیہ کے متعلق بھی اُن کے بیانات درایتاً ایسے مبالغہ آمیز اور ناقابل یقین معلوم ہوتے ہیں کہ بعض اہل تحقیق اس تمام افسانے کو ایک خفیف الاصل واقعہ پر مبنی سمجھتے ہیں اور کسی طرح اس بات کے ماننے پر رضامند نہیں کہ تین لاکھ ایرانیوں کی فوج ایک تہائی جمعیت کے ہاتھوں اس طرح برباد اور بے نشان ہو جائے بحالیکہ یونانیوں کے صرف تیرہ سو آدمی ضائع ہوں! عقل میں نہیں آتا۔

چھٹا باب

اتھنز کا عروج

(۱)

ایرانیوں کا زبردست حملہ ایک برساتی سیلاب تھا کہ خوفناک شور و تندی کے ساتھ اُٹھا، تھریس اور تمام شمال مشرقی یونان میں پھیلا اور پھیلتے پھیلتے بہ تدریج غائب ہو گیا۔ یونانی مورخوں کو اصرار ہے کہ جس زور کے ساتھ یہ ملچھ ایشیائی چڑھ کر آئے تھے، اُسی زور سے مُنہ کے بل گرے اور شکست و بربادی کے سوا کوئی مستقل کامیابی انھیں حاصل نہ ہوئی۔ اس قول کو جس کے خلاف ایک بھی ہمعصر منقول شہادت میسر نہیں آتی، اگر ہم تسلیم نہ کریں اور کہیں کہ ایرانی مہم کا مقصد اہل اتھنز کو سزا دینا تھا جو اس شہر کے دو مرتبہ تاراج و برباد کرنے سے پورا ہو گیا، تو پھر بھی اتھنزیوں کا یہ فخر کسی طرح کم نہ ہوگا کہ زرکسیز نے علاقوں اور خالی مکانوں کو مفتوح کیا تھا نہ کہ مکینوں کو، جن پر اُس کا کچھ زور نہ چل سکا اور جن کی سرکشی اُسی آزادی کے ساتھ دور کھڑی ایران کو چڑاتی رہی اور اس مہیب عفریت کی ہزار جدوجہد کے باوجود اُس کے قابو میں نہ آئی تھی۔

دُنیا کا یہ جلیل الشان واقعہ گویا ثبوت فیصل ہے کہ جذبۂ حرّیت میں جو خداداد قوّت مخفی ہے، وہ کسی زبردستی سے مغلوب و کمزور نہیں ہو سکتی اور بڑی سے بڑی کثرت و قہاری بھی اُس قلت کو محکوم نہیں بنا سکتی جو محکومی پر موت کو ترجیح دینے کے واسطے تیار ہو۔ چھوٹی قوموں کے زندہ رہنے کا یہی امکان ہے۔ اور حق بھی اُسی وقت تک فتحمند اور سرسبز ہے کہ اُس کے لیے مرنے والے موجود ہوں۔

اتھنز کی دوبارہ تعمیر و استحکام اس بات کا دوسرا ثبوت کہ ایرانی، بایں ہمہ زور و قوّت،

اہل ایتھنز کے دلوں کو پست و مضمحل نہ کرسکے تھے، وہ حیرت انگیز مستعدی ہے جو اپنے منہدم شہر کی دوبارہ تعمیر و مستحکم کرنے میں اُنھوں نے دکھلائی۔ حملہ آوروں کے ملک سے دفع ہوتے ہی وہ اپنے برباد و شکستہ وطن میں آئے اور ایسی محبت و گرم جوشی کے ساتھ جو ایک ماں اپنے بچے کے نئے کپڑے بنانے میں صرف کرتی ہے، اُنھوں نے شہر کو از سر نو بنانا شروع کیا اور ایتھنز کے گرد وہ زبردست فصیل تیار کی جو پہلی سے کہیں زیادہ وسیع و مضبوط تھی۔ اسی طرح تھمس طاکلیس کی تحریک سے اُنھوں نے اپنے بندرگاہ کے گرد بھی بہت بڑا حصار تیار کیا کہ اگر اُن کے ملک پر پھر حملہ ہو تو اس حصار کی پناہ لے سکیں اور اپنے بیڑے کی مدد سے "تمام دنیا کا حملہ روک لیں"۔

مگر ان تیاریوں نے (جو اُس زمانے میں اُسی خوف کی نظر سے دیکھی جاتی ہوں گی جیسی کہ آج کل کسی سلطنت کا بہت سے ڈریڈ ناٹ بنالینا) ایتھنز کے ہمسایوں کو نہایت متوہم کر دیا خصوصاً اسپارٹہ والوں کو بڑا حسد ہوا۔ کیونکہ وہ ہر یونانی ریاست کی ترقی کو اپنے اقتدار کے منافی سمجھتے تھے اور ایتھنز کے بحری تفوق کا انھیں پہلے سے رشک پیدا ہوگیا تھا۔ اس موقع پر اُنھوں نے دوستانہ پیرائے میں اہل ایتھنز کو فصیل بنانے سے روکنا چاہا اور یہ حجت پیش کی کہ تھیبز نے محض اپنی شہر پناہ کے زعم میں متحدہ یونانیوں کی بات نہ مانی تھی اور علانیہ ایرانیوں کے ساتھ مل گیا تھا۔ لہٰذا اتحادیوں کا فرض تو یہ ہے کہ اور کسی شہر کو بھی فصیلیں یا اس قسم کے استحکامات تیار نہ کرنے دیں اور سارے ملک کو اپنا گھر سمجھیں اور اُس کے قدرتی مواقع اور پہاڑی سرحدوں کو اپنے بہترین مورچے تصور کریں، نہ یہ کہ اتحاد یونانی کا رکن رکین ہو کر خود ایتھنز گمراہ تھیبز کی تقلید کرے اور اپنی جدید تیاریوں سے بدگمانی کا موقعہ دے۔

اس اعتراض کا جواب دینے تھمس طاکلیس خود اسپارٹہ گیا اور عرصے تک اُنھیں یہی دُھوکا دیتا رہا کہ یہ اطلاع صحیح نہیں ہے اور ایتھنز میں کوئی فصیل نہیں بن رہی ہے۔ یہاں تک

کہ دیوار مدافعت کے لایق بلند ہوگئی اور اُس وقت اہل اسپارٹہ سوائے اس کے کچھ نہ کر سکے کہ اپنے غصے کو ضبط کر کے خاموش ہو رہے۔

ان جنگی تیاریوں کے باوجود، جن میں اُن کی آبادی کا بڑا حصہ معروف رہا ہوگا، اہل ایتھنز بیرونی لڑائیوں میں بھی شریک رہے اور جب اتحادی بیڑے نے جزیرہ قبرس کو ایرانی اثر سے آزاد کیا تو بچاس میں سے تیس جہاز خاص ایتھنز کے تھے، جن کی کمان ارس تدیز اور کائمن (یا سایمن) کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ ارس تدیز وہی وطن پرست مدبر ہے جسے فتوی عام کی رو سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایرانی حملے کے وقت جہاں اور جلاوطن اشخاص کو معافیاں ملی تھیں ارس تدیز کو بھی دس سال کی میعاد گزرنے سے پہلے واپس بلا لیا گیا تھا کہ ایسے نازک وقت میں مادر وطن اپنے کسی لایق فرزند کی اعانت سے محروم نہ رہے۔ بلکہ اُس کے معاملہ میں یہ تحریک بازطلبی خود تھمس طاکلیس نے کی تھی جو اُس کا پرانا حریف اور اخراج کا باعث ہوا تھا۔ غرض ارس تدیز جنگ سلامیس کے زمانے میں اپنے اہل وطن سے آملا تھا اور اب اُس بحری دستے کی سرداری پر مامور ہوا تھا جو سپہ سالار پوسے نیاس کے ماتحت اتحادیوں نے ۴۷۸ ق م میں روانہ کیا تھا کہ ایرانیوں کو تمام یونانی سمندروں سے بے دخل کر دے۔

قبرس میں خاطر خواہ کامیابی کے بعد یہ سمندری فوج ساحل باسفورس پر پہنچی اور شہر بای زنطیم یا بای زنطہ، موجودہ استنبول کا محاصرہ کر لیا جو اُس عہد میں بھی جنگی لحاظ سے نہایت مضبوط اور کارآمد مقام تھا اور جس میں محاصرے کے وقت بھی بعض معزز ایرانی اُمرا موجود تھے۔

ایک مدت کے محاصرے کے بعد آخر قلعہ کی فوج نے اطاعت قبول کر لی۔ شہر یونانیوں کے قبضے میں آگیا اور آیندہ بحیرہ ایجین سے افشین تک ان کا بحری راستہ صاف اور اغیار سے پاک ہو گیا۔

پوسے نیاس کی نالائقی اور سازش لیکن بای زنطہ کی تسخیر جن آیندہ واقعات کا سرآغاز تھی وہ اُس کی فتح سے کہیں زیادہ اہم اور دور اثر ثابت ہوئے۔ کیونکہ اُسی زمانے میں یونانی ریاستوں کو اسپارٹہ کے اقتدار سے بیزاری اور ایتھنز کی جانب میلان پیدا ہوا، جس کا قریبی اور ظاہری سبب پوسے نیاس کی نالائقی تھی، اگرچہ بعض دیگر اثرات بھی اُس کی تہ میں کام کر رہے تھے۔

مل تیاڈس کے معاملے میں ہم یونانی عماید کا وہ جبلّی نقصان معاینہ کر چکے ہیں کہ کس طرح اُن کی کامیابی اُنھیں مغرور و خودسر بنا دیتی تھی۔ اب ہم پوسے نیاس کو بھی اسی مرض میں مبتلا ہوتا دیکھتے ہیں۔ پلاٹیہ کا فاتح اور اسپارٹہ کے شاہی خاندان میں ہونے کے باعث جو شہرت و عزت اُسے حاصل ہوئی وہ یونانی تاریخ میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھی اور بے شبہہ ایک تنک ظرف کا دماغ بگاڑ دینے کے لیے کافی تھی، جس کا پہلا ظہور پوسے نیاس کے اس فعل سے ہو گیا تھا کہ اُس نے پلاٹیہ کی لڑائی کے بعد ہی ایک تپائی ڈیلفی کے مندر میں چڑھائی اور اس پر صرف اپنا نام "فاتح سپہ سالار اور ایرانیوں کا تباہ کنندہ"، تحریر کرایا۔ یہ ایسی بیہودہ شیخی اور ناجائز خودستائی تھی کہ خود اہل اسپارٹہ نے اس کتبے کو مٹا کر اُن تمام ریاستوں کے نام جن کی فوج شریک جنگ تھی، تپائی پر کندہ کرا دیئے تھے۔ بایں ہمہ پوسے نیاس کے اعزاز میں زیادہ فرق نہ آیا تھا اور جب مذکورۂ بالا بحری مہم روانہ ہوئی تو اُس کا افسر اعلیٰ وہی مقرر ہوا۔ مگر بای زنطہ کی تسخیر کے بعد پوسے نیاس کی نخوت و خود پرستی نے دوسری شکل اختیار کی اور اُس کی طلبِ جاہ تحریک ملتے ہی اُس مجرمانہ راستے پر پڑ لی جو انسان کا سب سے بد تر گناہ اور حقوق عباد کی سب سے شرمناک خلاف ورزی ہے۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ بای زنطہ کے قیدیوں میں چند معزز ایرانی بھی تھے جنھیں پوسے نیاس نے خفیہ طور سے رہا کر دیا اور شاہ زرکسیز کے نام یہ تحریر بھیجی کہ اگر خاطر خواہ مدد مل جائے تو پلاٹیہ کا فاتح

دارائے ایران کے، یونانی دشمنوں سے لڑنے پر آمادہ ہے اور اُنھیں مغلوب و محکوم کر دینے کا پورا یقین رکھتا ہے۔ وہ اس پر بھی خوشی سے تیار ہے کہ دارا اُسے اپنی فرزندی میں قبول کرلے۔

یونانی روایت کے مطابق جب یہ پیغام ازرکسیز کو پہنچا تو وہ بہت خوش ہوا اور اپنے ایک ایرانی صوبیدار کی معرفت پوسے نیاس سے خط و کتابت شروع کی، لیکن جاہ طلب غدار ہمیشہ کم ظرف ہوتے ہیں۔ پوسے نیاس بھی اپنے ناپاک ارادے میں کامیابی کی اُمید بندھتے دیکھکر آپے میں نہ رہ سکا۔ اُس نے لباس و طعام، اوضاع و اطوار میں ابھی سے ایرانی امیروں کی تقلید اختیار کی اور اپنے یونانی حلیفوں پر نہایت ناگوار تحکم جتانے لگا۔ اُس کی مجرمانہ سازش کا حال اُس وقت تک ظاہر نہیں ہوا تھا، مگر اس کا طرز عمل بجائے خود اس قدر قابل اعتراض تھا کہ اہل اسپارٹہ نے اُسے بلا کر باز پرس کی اور ایک دوسرے سردار ڈورکیس کو اس کی جگہ اتحادیوں کی بحری قیادت کے واسطے بائی زنطہ بھیج دیا۔

اتحاد ڈیلوس ۴۷۷ ق م

لیکن ڈورکیس کے پہنچتے پہنچتے اتحادیوں کے خیالات میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہو چکا تھا اور اب اُن کی سرداری مستقل طور پر ایتھنز کی طرف منتقل ہو گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام ایرانی لڑائیوں میں جو ایثار و شجاعت اہل ایتھنز کا سے ظہور میں آئی تھی، اُس نے پہلے ہی سے اُن کی عظمت تمام یونانیوں کے دل میں استوار کر دی تھی اور جب پیلوپینی سس کی ریاستوں کے علاوہ بہت سے جزیرے اور آئی اونی شہر بھی یونانی اتحاد میں شریک ہو گئے تو انھیں بالطبع ایتھنز کی طرف میلان ہوا جو سب سے بڑا بیڑا رکھتا تھا اور اس وجہ سے اُن کی ہر موقع پر حفاظت کر سکتا تھا؛ ادھر مغرور پوسے نیاس کے مقابلے میں اُنھیں ایتھنز کے جن شریف مزاج افسروں کا تجربہ ہوا وہ ارس تدیز اور کائمن جیسے اعلیٰ اخلاق کے لوگ تھے۔

غرض ان تمام وجوہ نے مل کر ایک نئے سیاسی اتحاد کی ضرورت پیدا کی جو تاریخ میں

اتحادِ ڈیلوس کے نام سے مشہور ہی کہ اسی متبرک جزیرے میں اتحادیوں کی مجلس شوریٰ منعقد ہوتی تھی اور اوّل اوّل اُن کا مشترکہ سرمایہ اپالو کے مندر میں وہیں رہتا تھا؛ اتحاد میں زیادہ تر ساحلی اور جزائری ریاستیں شریک تھیں اور اُس کا مقصدِ اولیٰ ایرانی اقتدار سے بحرِ ایجین کو محفوظ رکھنا تھا۔ اس غرض کے لیے ہر اتحادی پر چند جنگی جہاز یا زرِ نقد سالانہ دینا فرض تھا اور یہ اہلِ اتحاد کی خوش قسمتی تھی کہ اس چندے کی مقدار پہلی مرتبہ ارس تدیز نے مشخص کی تھی جو انصاف و امانت میں اپنی مثال نہ رکھتا تھا۔

شروع میں ایتھنز اس اتحاد کا صرف صدر نشین یا سربرآوردہ رُکن تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ مساویانہ حیثیت بدلتی گئی اور اُس کی صدارت نے حکومت کی ناگوار شکل اختیار کر لی؛ اگرچہ دوسرے شرکا بھی کچھ کم قصوروار نہ تھے کہ تھوڑے دن بعد جنگی جہازوں کی بجائے عام طور پر اپنا چندہ روپے کی صورت میں ادا کرنے لگے تھے۔ اور اپنی حفاظت کا سارا بار اُنھوں نے ایتھنز کے سپاہیوں پر ڈال دیا تھا۔ ایسی قومیں یا جماعتیں جو لڑنے بھڑنے سے جان چرائیں، اور جان کی قربانی سے پہلو تہی کریں، دنیا میں کبھی زیادہ عرصے تک آزاد و خود مختار نہیں رہ سکتیں، کیونکہ آزادی کی قدر شناسی یا آزادی کی استعداد و قابلیت رکھنے کا دعویٰ، محض علم و دانش یا دولت و خوش حالی سے، سچا ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے لیے پہلی اور ناگزیر شرط جان فروشی ہی!

ایتھنز اور اسپارٹا، اُن کا اصولی اختلاف

لیکن ہم اپنے سلسلۂ بیان سے دور ہوئے جاتے ہیں۔ نئے اتحادیوں کے تعلقات میں مذکورۂ بالا تبدیلیاں عرصے کے بعد پیدا ہوئی تھیں ورنہ اوّل اوّل اتحادِ ڈیلوس ایک مفید اور مشترک مقصد کے ساتھ قائم ہوا تھا اور اُس کے ارکان کی بے غرضی، اخوت و مساوات، اتحاد کے نمایاں وصف نظر آتے تھے۔

بایں ہمہ اس اتحاد نے یونانی قومیت کو سخت صدمہ پہنچایا جس کی تصریح یہ ہی کہ وہی حالات جو پہلے ریاست ہائے پیلوپنی سس کی شیرازہ بندی کا سبب ہوئے تھے، اب زیادہ

وسیع حصہ ملک میں پیدا ہوتے جاتے تھے اور اسی لیے یہ امید ہو چلی تھی کہ ایک وقت میں سارا ہیلاس اسپارٹہ کی سرگردہی میں متحدہ ریاستوں کا مجموعہ بن جائے گا۔ سوڈیلوس کا اتحاد اس امید کے لیے موت کا پروانہ تھا۔ نسل یونانی کے درمیان اُسی نے ایک تنگاف کھینچ دیا جس کے ایک جانب ڈوریئن اسپارٹہ تھا اور دوسری طرف آئی اونی ایتھنز اور باقی تقریباً سب ریاستیں انہی دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ (اور دوسرے کے خلاف) تھیں۔ ساحلی اور بحری ریاستوں کا سردار ایتھنز تھا اور اندرونی شہروں اور بری فوجوں کا سپہ سالار، اسپارٹہ۔ مگر ان دونوں میں یاد رکھنے کے قابل جو بنیادی فرق تھا وہ یہ ہے کہ قدامت پسند اسپارٹہ حکومت خواص کا حامی اور ہر شہر میں اُمرا کو مقتدر بنانے میں کوشاں تھا۔ لیکن ایتھنز جمہوریت کا دلدادہ، مساوات کامل کا وکیل تھا اور یہی وہ گہرا اختلاف ہے جس نے آخر تک ان دونوں قوتوں کو دست و گریباں رکھا اور جب تک وہ دونوں کی دونوں ہلاک نہ ہوگئیں برابر آپس میں لڑتی رہیں۔

پوسے نیاس کا حشر اس عرصے میں معزول امیر البحر پوسے نیاس اپنی شیطانی ریشہ دوانیوں میں برابر مصروف تھا اور دوسرے یونانیوں کو ملانے کے علاوہ، خود اسپارٹی ہیلواٹوں کو اندر ہی اندر بغاوت پر آمادہ کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کے شبہات سے بھی بچا ہوا نہ تھا لیکن کچھ تو ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے اور کچھ اس کے وجاہت اور خوف سے کسی کو غداری کا الزام لگانے کی جسارت نہ ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ تقریباً نو برس کی خفیہ کوشش اور ایرانی روپئے کی قوت سے اس کی سازش بخوبی پختہ ہوگئی اور اُس نے ایرانی صوبے دار کو خط لکھ دیا کہ اب میں اپنے وطن کے خلاف علم جنگ بلند کرنے کے لیے تیار ہوں۔

حسن اتفاق سے، اس کا یہی خط پکڑا گیا اور اسپارٹہ کے حکام پر اچھی طرح اس کی غداری ثابت ہوگئی۔ اُس وقت پوسے نیاس گرفتاری سے بچ کر بھاگا اور ایک مندر

میں گھس گیا جہاں سے بجز نکالنا مذہباً جایز نہ تھا۔ اسی مجبوری سے اہل شہر نے مندر کے دروازے پر تیغہ کرادیا اور مشہور ہے کہ سب سے پہلے تیغے کا پتھر چُن کر جس نے اُس وطن فروش سے اپنی دلی نفرت کا اظہار کیا وہ خود پوسے نیاس کی شیر دل ماں تھی!

اس طرح پلاٹیہ کا فاتح سپہ سالار، بھوک پیاس اور انتہائی ذلت کے عالم میں، دم توڑنے لگا تو اُسے مندر سے باہر لائے اور جب وہ مرا تو اس کی لاش پر کوئی رونے والا نہ تھا (۴۶۷ء ق م)

ثمس طاکلیس ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ پوسے نیاس کی سازش میں بعض اور یونانی بھی شریک ہو گئے تھے۔ انھیں میں اسپارٹہ کے حکام کا ثمس طاکلیس پر بھی شبہہ تھا۔ لیکن وہ چار سال پہلے بعض اور شکایتوں کی بنا پر فتویٰ عام سے جلا وطن کیا جا چکا تھا اسی لیے عدالت میں اس پر مقدمہ چلانے کی نوبت نہیں آئی اور جب ایتھنز کے ایلچی اُسے گرفتار کرنے آرگس آئے (جہاں کہ زمانہ اخراج میں وہ قیام پذیر تھا) تو ثمس طاکلیس وہاں سے فرار ہو گیا اور بہ ہزار خرابی جگہ جگہ چھپتا اور جان بچاتا ہوا ایرانی دربار میں جا پہنچا اور زرکسیز کے جانشین بہمن اردشیر (ارتا زرکسیز) کی پناہ لی۔ دارائے عجم نے بھی اُس کی بے بسی پر رحم کھایا اور اس کا بیش قرار وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر دشمنانِ وطن کی اسی خیرات پر چند سال جی کر، وہ غالباً ۴۶۰ء ق م میں ایک جلا وطن مجرم کی موت مر گیا۔

ارس تدیز اور کائمن ثمس طاکلیس کے ملک سے نکلنے کے بعد قومی معاملات کی باگ ارس تدیز کے ہاتھ میں آگئی۔ وہ خود ایک غریب اور نادار شخص تھا لیکن قدامت پسندی کی وجہ سے اول اول قوم کی بہتری اس میں سمجھتا تھا کہ اُمرا اور دولت مندوں کو زیادہ اختیارات حاصل رہیں۔ مگر ایرانی لڑائیوں میں عوام نے جس خوشی سے جانیں دی تھیں وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ جمہور میں بھی وطن کی محبت اور خدمت کا وہی جوش پیدا

ہو گیا ہے جو پہلے صرف اعلیٰ طبقے کی وجہ امتیاز مانا جاتا تھا۔ پس امن ہونے کے بعد خود منصف مزاج ارسس تدبیز نے عوام کے حقوق کو تسلیم کیا اور اُسی کی تحریک پر یہ قانون وضع کیا گیا کہ آیندہ غریب سے غریب شہری بھی آرکنی پر منتخب ہو سکے گا جو کہ سلطنت میں سب سے بڑا عہدہ، اور پہلے صرف اہل دولت کے لیے مخصوص تھا۔

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد آرسس تدبیز نے وفات پائی اور اس کے سیاسی گروہ کا رہنما کائمن ہوا جو فاتح میرے تھاں، مِل ٹیاڈس کا بیٹا تھا اور ایتھنز کا بڑا نامی امیر البحر ہوا ہے۔ حب وطن اور نیک نفسی میں وہ اپنے نامور پیش رو (ارسس تدبیز) سے کم نہ تھا اور اگر ملکی تدبر میں اس کا ہم پایہ نہ ہو تو فوجی قابلیت میں یقیناً اُس پر فوق رکھتا تھا۔ مگر اس دلچسپ مماثلت کے سوا، ان دونوں میں ایک ظاہری فرق یہ ہے کہ ارسس تدبیز غریب گھرانے کا ایک تہی دست قوم پرست تھا اور کائمن ایک مشہور باپ کا عالی نسب امیر زادہ تھا۔ اور اگر آرسس تدبیز کا اپنے تئیں وطن کے لیے وقف کر دینا اور ذاتی آرام و سامان راحت کو بُھلا دینا ایک قابل رشک ''فقر'' تھا تو کائمن کی دولت بھی کچھ کم باعث فخر نہ تھی کہ اُس کا مصرف محض لوگوں کی مدارات اور اہل احتیاج کی حاجت براری تھا۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ اس کا گھر ''ساری قوم کا دیوان خانہ تھا جہاں ہر شخص کی مہمانی کی جاتی تھی'' اور اُس کی زمینوں کی پیداوار اور باغوں کے اچھے سے اچھے میوے '' وقف عام تھے کہ جس کسی کا جی چاہے آن کر بے قیمت، بے معاوضہ کھائے اور لے جائے''۔

۲۔ فارقلیس (یا پیری کلیس)

کائمن کا حریف سیاسی گویا فریق عوام کا سرگروہ فارقلیس (پیری کلیس) تھا۔ وہ رشتے میں (یونانی جمہوریت کے برگزیدہ بانی) کلیس تھنیز کا نواسہ اور ایک مشہور سردار

دن طیفس کا بیٹا تھا۔ اُس زمانے کے یونانی امرا میں وہ غالباً پہلا شخص ہے جس نے
علم و حکمت کو بڑی محنت سے حاصل کیا اور اپنے سیاسی طرزِ عمل میں اُن سے کام لیا تھا
اُس کی نسبت الزام ہے کہ وہ بالطبع حکومتِ خواص کا دلدادہ بلکہ شخصیت پسند اور
بادشاہت کا خواہاں تھا اور عوام کو ملانے کی غرض سے اُس نے اُن کا ساتھ دیا تھا،
نیز یہ کہ اُسے کائمن سے خاص رقابت تھی اور اُسی کی مخالفت کے جوش میں وہ
اپنے میلان کے خلاف، فرقۂ عوام کا ساتھی ہو گیا تھا"، لیکن ایسے الزامات کا ثبوت
ملنا محال ہے اور بظاہر وہ اُس حسد اور بدگمانی پر مبنی تھے جو فارقلیس کی غیر معمولی قوت
کا لازمی نتیجہ ہو گی۔ کیونکہ درحقیقت ایتھنز کے عین زمانہ عروج میں جو اقتدار اُسے نصیب
ہوا وہ کسی جمہوری حکومت میں شخصِ واحد کو مل جانا آسان نہیں ہے خصوصاً جب کہ وہ
جائز طریقوں سے، مُلکی خیر خواہی کے صلے میں، خود جمہور سے ملا ہو۔

اس اقتدار کا ایتھنز پر جو اثر ہوا اور فارقلیس کے عہدِ ملک رانی میں وہاں
جن تبدیلیوں اور ترقیوں کی بنیاد پڑی ان کا ذکر آگے آئے گا۔ اس وقت اپنے سلسلہ
بیان کے موافق ہمیں پہلے اُس کشمکش کے اسباب و نتائج دیکھنے ہیں، جو فارقلیس اور
کائمن میں ہوئی تھی۔

فارقلیس کے مطالبات اور کائمن کی شکست

قدامت پسند فرقۂ اعلیٰ کے خلاف منشا، فارقلیس کا مطالبہ یہ تھا
کہ عوام الناس کو ملکی معاملات میں زیادہ اختیار رہنا چاہیے۔
اُس کے نزدیک ادنیٰ سے ادنیٰ شخص میں حکمرانی کی قابلیت اور استعداد موجود تھی اور
اگر عوام کو سیاسی مشوروں میں حصہ دیا جائے، عدالتی مقدمات میں وہ پنچ یا جوری
بنائے جائیں اور اس طرح اہلِ عقل و تدبیر کی مخلصانہ رہنمائی میں حکومت دے کر اُنھیں
حکومت کرنا سکھایا جائے تو بلاریب یہی عوام کالانعام سلطنت کا انتظام کرنے کی
اُن امرا سے کہیں زیادہ لیاقت رکھتے ہیں جن کی تعداد محدود اور حقوق مخصوص ہوں

ایتھنز کے "بڑے آدمیوں" کو فارقلیس نہ تو اس قابل جانتا تھا کہ وہ اپنے وطن کو زیادہ فروغ و ترقی دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ اُسے اُن کی خیرخواہی پر زیادہ بھروسہ تھا۔ خصوصاً وہ اُن کی قدامت پرستی اور اسپارٹہ کی طرف رجحان کو، ملکی بہتری کے حق میں نہایت مضر سمجھتا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اسپارٹہ ہمیشہ ترقی پذیر ایتھنز کا دشمن حاسد رہے گا اور گو وہ لڑائی سے جہاں تک ہو سکے بچنا چاہتا تھا تاہم اُسے یقین تھا کہ کائمن اسپارٹہ کے ساتھ متحد رہنے کی جو کوششیں کر رہا ہے وہ کامیاب نہ ہوں گی اور اسی لیے ضرور ہے کہ ایتھنز آیندہ کشمکش کے واسطے تیار ہو جائے اور بطور حفظ ما تقدم، جس قدر ممکن ہو، اپنے تئیں مضبوط بنا لے۔ اس مضبوطی کی تدبیر بھی فارقلیس کے نزدیک یہی تھی کہ عوام کا ملکی معاملات میں زور بڑھایا جائے اور پرانے نظام حکومت میں بعض اصلاحیں کی جائیں۔ ایرانی لڑائیوں کے بعد سے اہل ایتھنز کے تمدنی حالات میں جو تغیر پیدا ہوا اس نے بھی ایسی ملکی اصلاح کو مناسب اور ضروری کر دیا تھا، کیونکہ اب اٹیکا ایک زرعی علاقہ رہنے کی بجائے تجارتی ملک ہو گیا تھا۔ کم عقل دہقانیوں کی جگہ اب وہاں ذہین اور معاملہ فہم سوداگروں کی کثرت تھی اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اتحاد ڈیلوس کے وقت سے اہل ایتھنز نہ صرف خود مختار بلکہ ایک فرماں روا (امپیریل) قوم ہوتے جاتے تھے۔

لیکن فارقلیس کی پُر تاثیر فصاحت عرصے تک کائمن کی اُس عظیم قوت پر غلبہ نہ پا سکی جو امیر البحر موصوف کی مسلسل فتوحات کا ثمرہ تھی۔ یہ لڑائیاں بیشتر ایرانی قلعہ داروں کے ساتھ ہوتی تھیں اور یا جب کبھی کوئی حلیف ریاست ایتھنز کے روز افزوں اقتدار سے جل کر یا اتحاد ڈیلوس کو اب بے ضرورت سمجھ کر، علیحدہ ہونا چاہتی تو اُسے جبراً حلقۂ اتحاد میں واپس لایا جاتا تھا۔ اگرچہ ایسی لڑائیوں کے بعد منحرف اور شکست خوردہ حلیف کی حیثیت بدل جاتی تھی، اس کی جنگی قوت برباد

کر دی جاتی اور وہ اتحادی کی بجائے آیندہ ایتھنز کی محض ایک محکوم ریاست رہ جاتا تھا۔

مگر ان مہمات میں پیہم کامیابی اگر کائمن کی معین اقتدار تھی تو دوسری طرف اس کا وطن سے باہر رہنا اور جنگی مصروفیت کے باعث مجلس ملکی سے غیر حاضری، فارقلیس کے حق میں عین مفید ثابت ہوئی۔ یعنی رفتہ رفتہ اس کا گروہ طاقت پکڑتا گیا اور کائمن کے طرفداروں کی تعداد کم ہونے لگی۔

کائمن اور طبقۂ اعلیٰ کے زور ٹوٹنے کی سب سے بڑی وجہ اسی زمانے میں یہ پیدا ہوئی کہ اہل ایتھنز کی اسپارٹہ سے علانیہ کشیدگی ہوگئی، اُس کے ساتھ جو معاہدۂ اتحاد تھا، فسخ کر دیا گیا اور اسپارٹہ کی بجائے وہ ان کے قدیمی دشمن آرگس کے حلیف اور اتحادی بن گئے[۱]۔ ساتھ ہی کائمن اور اسپارٹہ کے طرفداروں سے تمام ملک برگشتہ ہو گیا اور تمام سیاسی اختیارات اُن کے حریف فارقلیس کے ہاتھ میں آگئے۔

فرقۂ عوام کے مطالبات کو مسترد کرنے والا اب کوئی نہ تھا اور تھوڑے ہی دن میں مجلس اے ریو پی گس کی طاقت ٹوٹنے سے آشکار ہو گیا کہ امرا کا رہا سہا اقتدار بھی زوال پذیر ہے۔ یہ ہم پہلے پڑھ آئے ہیں کہ اس مجلس کو نئے قوانین مسترد کر دینے کا حق حاصل تھا اور اہل شہر کے ذاتی افعال میں بھی وہ دخل دے سکتی تھی۔ اور چونکہ اس مجلس میں بالعموم امرا اور دولت مند شامل تھے، پس مجلس عوام ایک طرح اے ریو پی گس (گویا طبقۂ اعلیٰ) کی ماتحت

---

[۱] اس دشمنی کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ سنہ ۴۶۴ ق م میں اسپارٹہ کے ہیلوٹوں نے سرکشی کی اور حکومت اسپارٹہ کو یہ فتنہ فرو کرنے کی غرض سے اپنے حلیفوں کی مدد ڈھونڈنی پڑی۔ اُس وقت کائمن کی صلاح سے اہل ایتھنز نے بھی مدد کے لیے ایک فوج اسپارٹہ بھیجی۔ لیکن غالباً ایتھنزی سپاہیوں کی تعلی اور خود ستائی نے اہل اسپارٹہ کو ناراض کر دیا۔ وہ رفتہ رفتہ اُن سے بدگمان ہو گئے اور اس اندیشے سے کہ مبادا کچھ اور خرابیاں پیدا ہوں اُنھوں نے ایتھنزی سپاہ کو واپس لوٹا دیا۔ اور اسی کو اہل ایتھنز نے اپنی توہین سمجھا اور اسپارٹہ کے مخالف ہو گئے ۱۲

تھی، مگر اب جو آئین فارقلیس نے تیار کیا اس کی رو سے اے ریو پی گس کے یہ دونوں اختیارات سلب ہو گئے اور وہ محض دولت مند بڈھوں کی ایک ایسی "قابل عزت مجلس" رہ گئی جس کا عدالتی اختیارات کے سوا، ملکی معاملات یا وضع قوانین میں کوئی دخل نہ تھا۔

فارقلیس نے دوسرا جمہوریت فروغ قانون یہ وضع کیا کہ آیندہ سے اہل شہر کو مجلس عوام اور پنچایت (یا جوری) میں بیٹھنے کا نقد معاوضہ دیا جائے تاکہ غریب سے غریب آدمی بھی کاروبار سلطنت میں شوق اور آسانی کے ساتھ حصہ لے سکے اور ایتھنز زیادہ وسیع و صحیح معنوں میں حکومت جمہوری بن جائے۔

ان قوانین سے عوام کا زور طبعاً بڑھ گیا اور ان کے دو سال بعد طبقۂ اعلیٰ کے سرگروہ کائمن کا بھی فتویٰ عام نے اخراج کر دیا کہ ایتھنز کی جدید سیاسی شریعت بلا مزاحمت نافذ و رائج ہو سکے۔ (۴۵۹ ق م)

مگارا اور تناگرا کی لڑائیاں

کائمن کے جانے کے بعد ایتھنز کو اسپارٹہ یا اُس کے اتحادیوں سے دو لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اوّل مگارا کے میدان میں جہاں اُسے فتح ہوئی، اور دوسری تناگرا پر جس میں اہل بیوشیہ نے اسپارٹہ کی مدد سے اُس پر فتح پائی۔ تاہم فاتح فریق ایتھنز کو کچھ زیادہ نقصان نہ پہنچا سکا اور جب اسپارٹہ کی فوجیں اپنے گھروں کو لوٹ گئیں تو اہل ایتھنز نے اپنے شمالی ہمسایوں (اہل بیوشیہ) سے پچھلی شکست کا سخت انتقام لیا اور وہاں جو شہر بہ شہر حکومت ہائے خواص قائم تھیں، اُنھیں اُلٹ کر جمہوریتیں قائم کیں اور کچھ عرصے کے واسطے درحقیقت یہ علاقہ ان کے زیر تسلط آگیا۔

کائمن کی بازطلبی اور لمبی فصیلیں

تناگرا کی لڑائی کے وقت کائمن اور اُس کے رفقا کی نسبت شبہہ ہو گیا تھا کہ وہ دشمن کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ اس شبہہ کو مٹانے کی غرض سے بہادر کائمن خود تناگرا کے میدان میں آیا اور جب اس کی درخواست

(کہ مجھے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے لڑنے کی اجازت دی جائے) بڑے قانون اخراج مسترد کر دی گئی تو وہ مایوس ہو کر چلا گیا لیکن اپنے دوستوں سے کہتا گیا کہ اس موقع پر اپنی حب وطن کا ثبوت دینے میں کمی نہ کریں؛ چنانچہ یہ لوگ ایسی جانبازی کے ساتھ لڑے کہ اکثر وہیں کام آئے اور اُن کی نسبت سارے شکوک رفع ہو گئے۔ کائمن کا دہ سالہ اخراج بھی منسوخ کر دیا گیا اور خود فارقلیس کی تحریک پر اس کو وطن واپس آنے کی اجازت مل گئی۔

کائمن کی واپسی کے بعد ہی غالباً اُن لمبی فصیلوں کی بنیاد پڑی جو ایک طرف ایتھنز کو بندرگاہ پائریس (پیروز) سے ملاتی تھیں اور دوسری طرف فیلرم سے۔ لمبائی میں یہ دیواریں پانچ میل سے بھی کم تھیں مگر اُنھوں نے بری محاصرے سے ایتھنز کو بے خوف کر دیا تھا کیونکہ اس کا بحری راستہ اب بالکل محفوظ تھا اور اس طرح اس کی بنیاد سلطنت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔

اس عظیم الشان کام کا بانی امیر البحر کائمن کو سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ تیسری دیوار فارقلیس کی یادگار ہے اور باقی دو کی تکمیل بھی غالباً اسی کے زمانۂ اقتدار میں ہوئی۔

اسپارٹہ سے لڑائی اور سی سالہ مصالحت

کائمن ہی کی کوشش سے ۴۵۲ ق م میں اسپارٹہ سے ایک پنجسالہ صلح نامہ ہوا تھا لیکن ۴۴۷ء میں جب اس کی میعاد ختم ہوئی اور نیز بیوشیہ کے امرا نے اسی سال ایتھنزیوں کو شکست دے کر اپنے علاقے سے نکال دیا ساتھ ہی جزیرہ یوبیہ اور میگارا نے اتحاد توڑ کر ایتھنز کے خلاف عَلَم جنگ بلند کیا تو اہل اسپارٹہ بھی خاموش نہ رہے اور ایک بڑی فوج لے کر اٹیکا پر چڑھائی کی۔ اس نازک موقع پر فارقلیس نے کثیر رشوتیں دے کر اسپارٹی سپہ سالاروں کو ٹالا اور پھر یوبیہ کو اطاعت پر بزور مجبور کیا (۴۴۶ء ق م)

لیکن غیر علاقوں کو محکوم بنائے رکھنے کی ذمہ داریوں نے اہل ایتھنز کو بتا دیا تھا کہ

اس حالت میں اسپارٹہ کی دشمنی ان کے حق میں نہایت مخدوش ہوگی۔ پس ۴۴۵ ق م قبل مسیح میں اُنھوں نے بخوشی اُس سی سالہ معاہدہ کو منظور کر لیا جس میں طے پایا تھا کہ میعاد مذکور تک اسپارٹہ ایتھنز سے جنگ نہ کرے گا اور ایتھنز اپنا اقتدار یونان کی بری ریاستوں سے اُٹھائے گا یعنی بیوشیہ اور مگارا وغیرہ علاقوں میں کوئی عمل دخل نہ رکھے گا بلکہ اپنا "دائرۂ نفوذ" بحری ریاستوں تک محدود کر دے گا۔

۳۔ عہد فارقلیس

لیکن اب ہماری تاریخ ہمیں سلطنت ایتھنز کے عین زمانۂ شباب تک لے آئی ہے اور چونکہ اس پندرہ بیس برس کے عرصے میں، جب تک کہ جنگ پیلوپنی سس چھڑے، عنانِ حکومت فارقلیس کے ہاتھوں میں رہی، یعنی تمام نظم ونسق اور سیاسی ردّوبدل اسی کی رائے سے انجام پاتے رہے، لہٰذا اہل تاریخ اس عہد عروج کو اسی کے نام پر عہد فارقلیس کہتے ہیں جو درحقیقت اس کی عظمت و شہرت کا نہایت نمایاں اعتراف ہے۔

عہدے کے اعتبار سے فارقلیس محض ایک اسٹرےٹے جس (سپہ سالار) تھا لیکن اصلی قوت اُسے مجلس عوام میں جمہوریت پسندوں کی سرگروہی سے حاصل ہوئی تھی اور جب ۴۴۹ ق م میں اس کا سیاسی حریف کائمن فوت ہوا تو یہ قوت اور بھی مضبوط ہوگئی اور فارقلیس کو گویا بلا شرکت غیرے اُس دولت و حکومت کے استعمال کا موقع مل گیا جو زیادہ تر خود کائمن کی فتوحات نے اہل ایتھنز کے لیے مہیا کی تھی۔

اتحاد ڈیلوس کی قلبِ نوعیت

لیکن اس سے پہلے کہ ہم اہل ایتھنز کی معاشرت اور صنعت و فن کا ذکر کریں جو عہد فارقلیس کا سب سے روشن باب ہے، وہ سیاسی انقلاب ذہن میں رکھنا ضروری ہے جو اسی زمانے میں واقع ہوا اور اہل ایتھنز کے

حالات وخیالات پر اثر ڈال رہا تھا۔ اس سے ہماری مراد اتحاد ڈیلوس کی قلب نوعیت ہے۔

اس اتحاد کی وجہ قیام اور بنیاد پڑنے کا حال ہم پہلے لکھ آئے ہیں اور ضمناً یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ابتدا سے بعض اتحادی جہازوں اور سپاہیوں کے بجائے اپنے حصے کا روپیہ دے دینا پسند کرتے تھے، اور اس سے رفتہ رفتہ اُن کی حیثیت بدل جاتی تھی اور ایتھنز کا اقتدار بڑھ جاتا تھا۔ اب تقریباً تیس برس کے عرصے میں ان اسباب نے جو نتیجہ پیدا کیا وہ یہ تھا کہ اکثر اتحادی ریاستیں محض خراج گزار رہ گئی تھیں اور ایتھنز کی صدارتِ اتحاد بتدریج حکومت بن گئی تھی، یہاں تک کہ ۴۵۴ ق م میں ان کا مشترکہ خزانہ بھی ڈیلوس سے منتقل ہو کر ایتھنز میں آگیا تھا۔ پھر جب ہم سنتے ہیں کہ اس روپے کو فارقلیس شہر ایتھنز کی تزئین و آرائش میں صرف کر رہا ہے، تو یہ سمجھنے میں کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ اب ایتھنز اپنے قدیم اتحادیوں کا باضابطہ فرمانروا ہے اور ان کے سالانہ چندے کو خراج کی طرح وصول کرتا اور اپنے کام میں لاتا ہے۔

طوسی دید اور اس کا اخراج

اس میں شک نہیں کہ فرقۂ امرا جس کا سرگروہ کائمن کے بعد (توسی دیدز) طوسی دید ہوا، فارقلیس کی ان کارروائیوں کے خلاف تھا اور انہیں معاہدۂ اتحاد (ڈیلوس) کی ناجائز خلاف ورزی ٹھہراتا تھا لیکن فارقلیس کی حجت یہ تھی کہ یہ روپیہ جن جنگی مقاصد کے لیے جمع کیا جاتا ہے انھیں اہل ایتھنز انجام دیتے ہیں اور اس لیے وہ مجاز ہیں کہ اس روپیے کو جس طرح چاہیں استعمال کریں، اور اتحادیوں کو اُس وقت تک بازپرس کرنے کا کوئی حق نہیں ہے جب تک کہ اتحاد کا اصل مدعا (یعنی بحرایجین کا تحفظ) پورا ہوتا ہے۔

طوسی دید ان دلیلوں کو "عہد شکنی کی تاویلیں" قرار دیتا تھا اور اس نے اکثر ارکان مجلس کو اپنا ہمرائے بھی بنا لیا تھا لیکن جب تنازع نے فتویٔ عام طلب کرنے کی نوبت پہنچائی تو جمہور نے فارقلیس کا ساتھ دیا اور طوسی دید ہی کثرت رائے سے خارج البلد کر دیا گیا (۴۴۳ ق م)

لیکن اب کہ ایتھنز کی سلطنت اپنے شباب پر ہے، بیرونی لڑائیوں سے اُسے فرصت حاصل ہے اور کشتیِ حکومت کا ناخدا بھی فارقلیس جیسا بے غرض خادم وطن ہے، مناسب ہوگا کہ

ہم وہاں کی صنعت و فنون پر ایک سرسری نظر ڈالیں، کہ یہی قوم کی دماغی ترقی کے بہترین مظاہر ہیں۔

عمارات | بلند نظر فارقلیس کے طبعی میلان اور نیز حب وطن کا اقتضا یہ تھا کہ پُر شکوہ عمارتوں سے ایتھنز کی شہرت و منزلت بڑھائے اور شہر میں جو دور دور سے کاریگر اور ضناع آ بسے تھے ان کے لیے بھی سرکاری روپیے سے معاش کی ایک عمدہ صورت نکالے؛ چنانچہ اس کے عہد اقتدار میں بہت سی عمارتیں ایسی بنیں جو وسعت و زیبائش، لاگت اور فن کے اعتبار سے تمام یونانی عمارتوں پر فوق رکھتی تھیں اور جن کی حیرت انگیز پائیداری پر پلوٹارک کی عینی شہادت موجود ہی جس نے پانچ سو برس بعد بھی اُن کی شان و خوبی میں کوئی فرق نہ پایا تھا۔

ان میں سب سے مشہور پارتھی ناں کا دُہرا ایوان تھا جو نہایت خوش منظر بلندی پر کئی سو گز وسیع بنایا گیا تھا۔ محراب و در کی بجائے اس کے عرض و طول میں بے جرم سنگ مرمر کے ستون لگائے تھے اور ان کے اوپر سامنے کے رُخ ایک تیرہ گز بلند حاشیہ چھوڑا تھا جس پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیں ابھری ہوئی (منبت) تھیں۔ یہ ستون اور مورتیں اس عہد میں صناعی کا بے نظیر نمونہ سمجھے جاتے تھے اور اب تک یورپ کے سیاح پارتھی ناں کے کھنڈر اور اس کے چند باقی ماندہ ستون دیکھنے کے لیے زائرانہ شوق و عقیدت سے ایتھنز جاتے ہیں اور اُس کی گزشتہ عظمت کی ولولہ انگیز یاد تازہ کرتے ہیں۔

بُت تراشی | لیکن فن عمارت میں قدیم یونان کو اقوام سلف پر ایسی فضیلت حاصل نہیں ہوئی جیسی کہ فن بُت تراشی میں۔ یہ فن جس معراج پر وہاں پہنچا، کسی ملک کو وہ رتبہ نصیب نہیں۔ بلکہ اُس عہد کے بعض نمونے اب تک بے جواب اور لاثانی سمجھے جاتے ہیں اور جدید اہل فن بھی اس کا مثیل پیدا کرنے سے عاجز ہیں؛ اصل یہ ہی کہ حسن کی قدر قدیم یونان میں پرستش کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔ اپنے ہر دیوتا کو وہ جمیل ترین ہستی جانتے تھے

اور یہی عقیدہ اُن کے تخیل و تصور کو اتنا بلند لے جاتا تھا کہ شاید وہاں تک دورِ جدید کی مادّی اور معقولات پسند طبائع کی رسائی دشوار ہے! علاوہ ازیں، تصویر کشی اُس زمانے میں اتنا مقبول اور ترقی یافتہ فن نہ تھا اور اس کی موجودہ آسانیاں قدیم اہل یونان کو میسر نہ تھیں، پس اُن کی ساری کوششیں بُت تراشی اور اس کی ترقی پر مجتمع ہوتیں اور دو کی بجائے اُنھیں ایک ہی فن میں مقابلہ اور منافسہ کرنا پڑتا تھا۔

موسیقی پہلے ذکر آچکا ہے کہ اہلِ ہیلاس اوّل سے موسیقی کے دلدادہ تھے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں ہم ان کے اس شوق کو اور بھی زیادہ پاتے ہیں۔ تمدن کے ہمقدم فنِ شعر نے جو وسعت و ترقی حاصل کی تھی، موسیقی کا اُس سے متاثر ہونا لازمی تھا! مزید برآں اس فن لطیف کی دلکشی میں اضافہ کرنے کو اب نئی نئی قسم کے باجے اور ناچ رائج ہوتے جاتے تھے اور ان سب نے مل کر عہد فارقلیس کی موسیقی کو ایک بڑا فن بنا دیا تھا۔ اس کے باکمال ہر مجلس کا زیور سمجھے جاتے، میلے اور تہواروں میں اُن کے باہمی مقابلے ہوتے اور فارقلیس نے خاص ان جلسوں کے لیے ایک عالی شان قصر علیحدہ تعمیر کرایا تھا اور اپنی سیاسی مصروفیت کے باوجود اُن میں بذاتِ خود شریک ہوتا تھا۔

فنِ خطابت مگر اتھنی کائی تہذیب کی سب سے ممتاز خصوصیت اہلِ ایتھنز کی خطابت اور مجمع عام میں تقریریں تھیں۔ اپنے آبائی بزرگوں سے خوش بیانی اور پُرگوئی انھیں ورثے میں ملی تھی۔ اور ایسے زمانے میں جب کہ تحریر و کتابت کا رواج نہ ہو، نیز "قومیت" اور سلطنت شہروں کے رقبے میں محدود ہوں، فنِ خطابت کا وجود میں آنا بالکل قدرتی بات تھی؛ البتہ اس فن کی ترقی کلیۃً آزادیٔ تقریر اور جمہوریت پر منحصر ہے اور ہیلاس میں کم سے کم ایتھنز ایسا مقام تھا جہاں یہ دونوں باتیں موجود تھیں۔ پس خطابت نے جیسی قبولیت اور قوت وہاں پائی، اقوامِ سلف میں کہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ہر شخص کا، جو مجلس ملکی میں لوگوں کو اپنا ہمخیال بنانا چاہے، عمدہ مقرر ہونا ضروری تھا۔

اور چونکہ تمام آزاد شہری اس مجلس کے رُکن تھے، لہٰذا جس کسی کو وطن میں رسوخ و اثر حاصل کرنے کی ذرا بھی تمنا، یا اپنی رائیں ظاہر کرنے کا شوق ہوتا تھا، اُس کو خطیبانہ قابلیت پیدا کرنی مقدم تھی اور اس طرح، سیاسی اقتدار، یا حصول عزت و ناموری کا سب سے بڑا آلہ فن خطابت مانا جاتا تھا؛ اس کے علاوہ ایتھنز میں یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ عدالت میں ہر شخص اپنے مقدمے کی خود پیروی کرے تاکہ معزز اشخاص یا نامی خطیب، اپنی وکالت اور وجاہت سے عدالت کو مرعوب کرنے کے لیے پیش نہ کیے جا سکیں؛ اور اسی قانون کا نتیجہ تھا کہ فن تقریر اہل ایتھنز کی ضروریاتِ معاشرت میں داخل ہو گیا تھا؛ ساتھ ہی اُن میں انشا پردازوں کا ایک گروہ پیدا ہوا جو اہل مقدمہ کے لیے استغاثہ، اور برأت یا صفائی کی "تحریری تقریریں" تیار کرنے لگے۔ اور اس پیشے نے ایک طرف تو اُنھیں منطقی استدلال، اینچ پینچ اور تاویل کی نئی نئی راہیں دکھلائیں اور دوسری طرف سوفسطائیت کی بنیاد مضبوط کی جو آخر میں اپنے ظاہر فریب اصول و عقائد کی وجہ سے نہایت بدنام ہوئی اور اب تک مطعون ہے؛ اس گروہ کے مقرر کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ زیر بحث معاملے کے اچھے اچھے پہلو تائید یا تردید کے لیے ڈھونڈے اور حسب ضرورت اُنھیں فصاحت و روانی کے ساتھ پیش کر دے لیکن سوفسطائیوں کی اسی خوش بیانی اور حاضر جوابی نے آخیر میں عامیانہ لسانی اور چرب زبانی کی مکروہ صورت اختیار کر لی تھی۔

ٹریجیڈی[1] | خطابت اور تمدن کی ترقیوں نے آئی اونی زبان کو بڑی وسعت اور تقویت بخشی

---

[1] یونان میں قدیم سے ڈیونی سیس کے نام کے گیت مل کر گانے کا دستور تھا (ڈیونی سیس شراب اور جسمانی خوشیوں کا دیوتا تھا جس کی تمام زندگی تکلیفات اور آلام دنیاوی سے لڑنے میں گزری ہے) اور گیت شروع کرتے وقت بکری کی قربانی کی جاتی تھی۔ اسی سے یہ گانا ٹریجیڈی یعنی "بکری کا گیت"، کہلانے لگا اور گانے والے گروہ نے ایک سانگ کی صورت اختیار کر لی جس میں اوّل اوّل ایک شخص ڈیونی سیس کا بھیس بدل کر اس کے کارنامے اور فتحمندی کے گیت گاتا تھا اور ساتھ والے آوازیں ملا کر کہیں کہیں جواب دیتے جاتے تھے؛ اس کے بعد رفتہ رفتہ ڈیونی سیس کی بجائے ہر ایسے سورما کی نقل کی جانے لگی جس کی زندگی میں دشوار و صعب واقعات پیش آئے ہوں؛ اس نقل یا سانگ کو بھی ٹریجیڈی کہتے تھے اور ڈراما کی پہلی صورت یہی ٹریجیڈی تھی ۱۲

تھی۔ بہت سے جامع الفاظ، نئی اصطلاحات اور ترکیبیں اُن کے روزمرہ میں داخل ہوتی جاتی تھیں اور ادائے مطالب کے ایک سے ایک دلکش پیرائے نکل آئے تھے۔ زبان کے اس طرح سنجھنے اور پھیلنے سے اُن کی شاعری کا متاثر ہونا لازمی تھا اور ہم چھٹی صدی قبل مسیح سے اُس میں نئے نئے انقلاب ہوتے دیکھتے ہیں:۔ چند آسان بحروں کی بجائے جو ہومر کے وقت سے اُن میں متعارف تھیں اب اور اور اوزان شعر ایجاد ہوتے ہیں اور خود اصناف شاعری میں بھی ڈرامے کا اضافہ کیا جاتا ہے؛ ڈراما کو ایک قسم کی مثنوی سمجھنا چاہیے جو اسٹیج پر نقل کر کے دکھائی جاتی تھی۔ اول اول اُس میں ایک ہی شخص کسی قدیم سورما کا بھیس بدل کر آتا اور اُس کی کوئی پر مصائب سرگزشت، نقل کر کے دکھاتا تھا۔ ایسے افسانے کو ٹریجیڈی کہتے ہیں جسے تھس پیس شاعر نے سولن کے زمانے میں شروع کیا اور فری نی کس اور پھر اسکائی لس جیسے نامور شعرا نے فروغ دیا تھا؛ ان میں اسکائی لس جو عہد فارقلیس تک زندہ رہا، یورپ کے ڈراما نویسوں میں بڑا ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اُس کے زندہ جاوید اشعار، خیالات بلند جذبات عالیہ اور الفاظ پر شکوہ کے لحاظ سے کہیں آسمانی الہام اور کہیں غیب کی آوازیں معلوم ہوتے ہیں اور انھی کے ضمن میں وہ عدل و انصاف ایثار و حب وطن اور حمیت و حریت کی پر تاثیر تعلیم کا نقش دلوں میں بٹھاتا ہے۔

سفاکلیس اور یوری پڈیز

اسکائی لس کا جانشین سفاکلیس تھا جو خاص عہد فارقلیس کا شاعر ہے اس کی شہرت و کامیابی نے اپنے پیش رو کا بازار سرد کر دیا اور اُس کا آیندہ وارث سخن یوری پڈیز (یوری بید) بھی اُس پر فوق نہ لے جا سکا؛ سفاکلیس کی نظم میں بعض مقامات ایسے لطیف و دل رُبا ہیں کہ انھیں ملائک بہشتی کے نغمے کہا جائے تو بجا ہے؛ مگر حسن شعر سے بڑھکر ڈراما پر اس کا احسان یہ ہے کہ اس کے قصوں میں کئی کئی اشخاص اسٹیج پر آنے لگے جس سے ڈراما میں ایک نئی وسعت و دلکشی پیدا ہوگئی؛ یہ رسم بھی کہ خود شاعر نقل میں حصہ لے اُس نے ترک کر دی اور اس طرح ڈراما نویسی اور ایکٹری (یا نقالی) کو دو

جداگانہ فن بنا دیا؛ اس کے علاوہ اسکائی لس کے طرزِ کلام کو "جو دیوتاؤں ہی کے لیے زیادہ موزوں تھا" اُس نے بدل دیا اور اُس کے خشک اور متحکمانہ لب و لہجے کو معتدل بنا کے ایک شائستہ اور شگفتہ، مگر فلسفیانہ پیرایہ بیان اختیار کیا۔

کوامیڈی | سفاکلیس کو اس آخری اصلاح کی ضرورت غالباً اس واسطے اور پیش آئی کہ اب ڈرامے کی دوسری قسم یعنی کوامیڈی کا رواج بڑھتا جاتا تھا اور اس کی پُر لطف شوخیوں کے سامنے ٹریجیڈی ایک بے مزہ داستان ہوئی جاتی تھی۔

ظرافت عام طور پر انسان کو محبوب ہے مگر ایتھنز میں ڈرامے کی اس نئی قسم کو فروغ، وہاں کی آزادی اور جمہوریت کے طفیل میں حاصل ہوا کہ ان کے بغیر رسم و رواج اور ملکی آئین و قوانین، اوہام و عقائد کے نقص دکھانا اور اُن پر ہنسی اڑانی محال ہے۔ جب تک شاعر کو اظہارِ خیال میں پوری آزادی نہ ہو اُس کی گول مول باتیں نکیلی ہونگی نہ چبھتی۔ مگر ایتھنز کے یہ مطائب نویس فقط لوگوں کو ہنسا دینا ہی اپنا کمال نہ جانتے تھے بلکہ اپنے متین برادران ٹریجیڈی کی طرح، لوگوں کو غیرت و حمیت، آزادی و وطن پرستی کی تعلیم دینا، اُن کا بھی مقصود اصلی تھا؛ فرق اتنا تھا کہ ٹریجیڈی کا موضوع کسی قدیم سورما یا نیم دیوتا کے قصے ہوتے تھے اور اُن کے بیان میں وقار و سنجیدگی ضروری تھی۔ کوامیڈی میں موجودہ حالات اور روزمرہ کی زندگی کے مناظر پیش کیے جاتے تھے اور اُس کی زبان بے تکلف، رواں اور ظرافت آمیز ہوتی تھی؛ باقی بزرگانِ رفتہ اور فدائیانِ وطن کے کارناموں کی ولولہ انگیز یاد تازہ کرنے میں یا اُن کی ریس پر اُبھارنے میں، کوامیڈی نے جو قومی خدمت انجام دی وہ کچھ کم قابلِ قدر نہ تھی۔ مزید بر آں کوامیڈی انصاف و مساوات کی بے باک وکیل تھی جس سے اہلِ حکومت

---

[1] کوامیڈی کے لفظی معنی "گانوں والوں کا گیت" ہیں اور یہ بھی اوّل اوّل ڈیونی سس کی درگاہ پر مل کر گایا جاتا تھا۔ مگر اس میں ابتدا سے دیہاتی مذاق کی باتیں اور اسی قسم کے تمسخر آمیز افسانے نقل کر کے دکھائے جاتے تھے ۱۲

خوف کھاتے تھے کہ ان کی ذرا سی لغزش یا تحکّم و جبر کی محض شہرت پر، اہلِ کوامیڈی اس طرح اُن کے پیچھے پڑتے تھے کہ ان کی زندگی دشوار ہو جاتی تھی! اس ہجو میں کنایے کو بالعموم صراحت پر ترجیح دی جاتی تھی۔ اگرچہ ایسی مثالیں بھی ملیں گی جن میں شعرائے ایتھنز شائستگی کی حدود سے نکل گئے ہیں۔

باب ہفتم

جنگ پیلوپنی سس۔ سلطنت اتھنز کا زوال

اور اسپارٹہ کا غلبہ

اس باب کو لکھتے وقت یونان کا ہر مورخ ملول و افسردہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے اُن واقعات کا آغاز ہے جنھوں نے بالآخر ہیلاس کا ورقِ عظمت پارہ پارہ کر دیا اور اس کی حکومت و قوت خاک میں ملا دی؛ بے شبہ بنی انسان کی ترقی و سرسبزی پر خوش ہونے والا کوئی دل ایسا نہ ہوگا جو آیندہ خانہ جنگیوں کے مناظرِ خونیں پر نہ کڑھے اور اہلِ یونان کو خود اپنے ہاتھوں سے اپنا جسم فگار کرتے دیکھکر متاثر نہ ہو۔ لیکن کُشت و خُون کی اس رنجدہ داستان کو ہم اس موقع پر زیادہ طول نہ دیں گے کہ وہ نہ حجم کتاب سے آشتی رکھتا ہے نہ زیادہ دلچسپی؛ تاہم اُن اسباب و اہم واقعات کا تحریر کرنا ضرور ہے جن کا عبرت ناک نتیجہ یونان کی موت یعنی محکومی ہوا۔ اس لیے کہ ان سے نہ بھولنے والا سبق ہمیں ملتا ہے کہ قومیں ہمیشہ اپنی بد اعمالی سے بگڑتی ہیں اور اُن کی ہلاکت، رسکن کے الفاظ میں، جب ہوتی ہے خودکشی سے واقع ہوتی ہے۔

جنگ کی اصلی وجہ

یاد ہوگا کہ ۴۴۵ ق م میں اسپارٹہ اور اتھنز میں ایک عہدِ مصالحت کیا گیا تھا کہ تیس برس تک فریقین جنگ و مجادلت سے باز رہیں گے، لیکن ؎

مصرع: صلح ہے اک مہلت سامانِ جنگ

سلطنتوں میں ایسی مصالحت اکثر وقتی مجبوریوں اور مصلحتوں کی بنا پر ہوتی ہے کہ دم لے کر کسی دوسرے موقع کا انتظار کیا جائے ورنہ استحصالِ قوت کا شوق جو حیات کا فطری خاصہ ہے، ہمیشہ دو طاقتوں کو باہم ٹکراتا رہتا ہے؛ اسپارٹہ اور اتھنز میں بھی جب تک ایک دوسرے سے مغلوب نہ ہو جائے مصالحت دشوار تھی اور مذکورہ بالا معاہدے کے باوجود اہلِ اتھنز کا

شہنشاہی اقتدار اور روزافزوں فروغ ایسی چیز نہ تھا کہ اُس کے ہمسایوں کو سخت ناگوار نہ گزرتا۔ اس کے علاوہ فریقین کی اصلی وجہ عداوت میں کوئی فرق نہ آیا تھا: قدامت پرست اسپارٹہ اُسی طرح حکومت خواص کا حامی اور جمہوریت کا مخالف تھا اور جدت پسند ایتھنز، مساوات و آزادی کا سچا وکیل اور خواص کا دل سے دشمن تھا۔ اور ایسے بنیادی اختلاف کی موجودگی میں ان دونوں سلطنتوں کا امن وصلح سے رہنا ممکن نہ تھا۔

بے شبہ ایتھنز میں کائمن کے وقت سے اب تک ایسے اہل الرائے موجود تھے جو اسپارٹہ کے ساتھ دوستانہ اتحاد کے خواہاں تھے لیکن غالباً اُن کی نظر مخالفت کی تہ تک نہ پہنچی تھی اور یا یہ کہ، خواہ وہ خود اس سے بے خبر ہوں، ان کے دل اندر ہی اندر اسپارٹہ کے اصول تمدن اور حکومتِ خواص کو اپنے ملکی نظام سے بہتر سمجھتے تھے! فارقلیس (پیری کلیس) کسی ایسے دھوکے میں نہ تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جب تک جمہور اہل ایتھنز کی طبایع نہ بدل جائیں اور اُن کی آبائی خصوصیات ہی نہ مٹ جائیں اس وقت تک ڈورین پیلوپنیسس انھیں نگاہ رعایت وپسندیدگی سے نہیں دیکھ سکتا؛ اور اسی لیے وہ بہت پہلے سے اپنے اہل وطن کو آنے والی مصیبت سے خبردار کر رہا تھا اور جنگ سے چند روز قبل اُس نے اپنی تقریروں میں اسپارٹہ کے حسد کی وجوہ بالکل صاف صاف بیان کر دی تھیں۔ کیونکہ اُس وقت بھی شہر کے بعض مقتدر اشخاص لڑائی مول لیتے ہچکچاتے تھے۔ اور اگر اُن کے دشمن اہل اسپارٹہ ہی ہٹ دھرمی پر نہ اُتر آئیں تو غالباً فارقلیس کی پُرجوش فصاحت بھی اہل ایتھنز کو جنگ پر آمادہ نہ کر سکتی تھی۔

بہرحال، لڑائی کے اصلی اسباب تو یہی فریقین کے قدیم اور طبعی اختلافات اور نیز اہل پیلوپنیسس کا حسد، سمجھنے چاہئیں لیکن اُس کی جو ظاہری اور قریبی وجوہ پیش آئیں وہ بہ اجمال آگے آتی ہیں:-

جنگ کے ظاہری اسباب | ایتھنز و اسپارٹہ کے تیس سالہ مصالحت نامے کو ۱۳ برس گزرے

تھے کہ شہر کورنتھ اور اُس کی نوآبادی کرکایرا میں لڑائی چھڑ گئی۔ یہ جزیرہ جسے آج کل کارفو کہتے ہیں، بسایا تو اہل کورنتھ نے تھا لیکن دستور کے موافق اس کی حکومت آزاد اور خود مختار تھی اور جب سنہ ۴۳۲ ق م میں کورنتھ نے اُسے بعض امور نزاعی میں دبانا چاہا تو وہ نہ دبی بلکہ لڑائی پر آمادہ ہوگئی اور اس جنگ میں اہل ایتھنز سے طالب امداد ہوئی۔ چنانچہ اس کی مدد کے واسطے چند جنگی جہاز ایٹی کا سے بھیجے گئے۔ یہ کارروائی اگرسی سالہ عہد مصالحت کے خلاف بھی تھی تو مصالحانہ طریق سے اہل ایتھنز کو عہد شکنی پر متنبّہ کیا جا سکتا تھا مگر حکومتِ کورنتھ اسپارٹہ کی حلیف، اور بجائے خود ایتھنز کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھی۔ اس واقعے پر نہایت برافروختہ ہوئی اور اس کے سفیروں نے اہل اسپارٹہ کو لڑائی کا سخت اشتعال دلایا کہ دشمن تمہاری سُستی اور بے پروائی سے فائدہ اُٹھا رہا ہے اور اب اس کی قوت وخود سری کسی عہد وپیماں کی بھی پابند نہیں رہی ہے۔

جنگ کا دوسرا حیلہ اہل مگارا نے پیدا کیا۔ ایتھنز کے یہ ہمسایے پچھلے معاہدے کے بموجب ریاستہائے پیلوپنی سس کے اتحاد میں شریک ہوگئے تھے اور ایٹی کا سے اُن کی اکثر چھیڑ چھاڑ رہتی تھی؛ چنانچہ جنگ سے کچھ مدت پہلے اہل ایتھنز نے بیزار ہوکر اعلان کر دیا تھا کہ ایتھنز اور اس کے محکوم اتحادیوں کی کسی بندرگاہ پر مگارا کے جہاز نہ آنے پائیں اور نہ اُس کے ساتھ کوئی تجارتی تعلق رکھا جائے۔ ان امتناعی احکام نے اہل مگارا کی جہازرانی اور تجارت کو بہت نقصان پہنچایا تھا اور وہ اسپارٹہ کے پاس فریاد لائے تھے کہ یہ کارروائی بھی سی سالہ مصالحت کی نقیض ہے۔

الغرض ان واقعات نے اُس آگ کو جو دلوں کے اندر سُلگ رہی تھی زور سے بھڑکا دیا اور سنہ ۴۳۲ ق م کے اواخر میں اہل اسپارٹہ نے اپنے حلیفوں کا ایک بڑا جلسہ منعقد کیا جس میں بالاتفاق طے پایا کہ ایتھنز کے ساتھ لڑائی ناگزیر ہے۔

اشتہار جنگ اور فریقین کی قوت

مگر فیصلے کے باوجود اشتہار جنگ کئی مہینے کے بعد دیا گیا

اور ۴۳۱ ق م سے پہلے اسپارٹہ کے حلیف اپنی فوجی تیاریاں مکمل نہ کر سکے ان میں آرگس اور اکائیہ کے سوائے تمام پیلوپنی سس کی ریاستیں شریک تھیں اور بیرون پیلوپنی سس سے بھی متعدد شہروں نے ساتھ دیا تھا۔ لیکن بجز کورنتھ کے، بحری قوت ان میں سے کسی کے پاس نہ تھی اور کورنتھی بیڑے کو بھی خلیج کورنتھ کے تنگ دہانے پر اہل ایتھنز مقید کر سکتے تھے۔ البتہ شہر سیراکیوز (صقلیہ) کے مل جانے سے یہ نقص بعد میں رفع ہو گیا تھا اور ہم آگے پڑھیں گے کہ کس طرح ایتھنز کی بہت بڑی فوج اس دور دست شہر کے سامنے لڑ کر تباہ ہوئی۔

اس زبردست اتحاد کے مقابلے میں بحر ایجین کی تقریباً تمام جزائری اور ساحلی ریاستیں اہل ایتھنز کی طرف تھیں۔ اور کرکایرا کے علاوہ خلیج کورنتھ کی کنجی، یعنی ساحلی شہر نوپاکٹس بھی اُن کا حلیف تھا؛ اس طرح ان کی بحری قوت اسپارٹہ سے کہیں زیادہ تھی اگرچہ بری افواج میں وہ اپنے دشمنوں کے مدمقابل نہ تھے۔ مگر ایتھنز کو ایک بڑی آسانی یہ حاصل تھی کہ جنگ کے واسطے اُس کے پاس معقول خزانہ جمع تھا اور سالانہ باجدید روپیہ وصول کرنے کے لیے ایک ضابطہ پہلے سے بندھا ہوا تھا۔ حالانکہ اسپارٹہ کی انجمن اتحاد بے اصول اور خالی ہاتھ تھی۔ البتہ ان کی بڑی جیت یہ تھی کہ اُن کے حلیف آزاد اور مساوی درجے کے شہر تھے اور اسی لیے جنگ میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لے رہے تھے۔ اس کے برعکس ایتھنز کے اتحادیوں کی آزادی برائے نام باقی تھی اور اُن کی شرکت جنگ بھی محکومانہ مجبوری کی وجہ سے تھی اور اسی لیے اہل اسپارٹہ کو یہ کہنے کا موقع مل گیا تھا کہ ہم ایتھنز کی غاصبانہ سلطنت کے خلاف حق اور آزادی کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

جنگی تدابیر اور منصوبے

بہرتقدیر، گویا تمام یونان دو حصوں میں منقسم ہو کر اس وقت کٹ مرنے پر تل گیا تھا۔ لیکن چونکہ اسپارٹہ کی بری قوت زیادہ تھی لہٰذا فارقلیس نے

اپنے اہل وطن کو صلاح دی کہ وہ کبھی بری لڑائی نہ لڑیں بلکہ شہر کی لمبی فصیلوں (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۳) میں قلعہ بند ہو جائیں۔ اس طرح اگرچہ اٹیکا میں دشمن فصلوں اور باغات و دیہات کو برباد کر سکتا تھا لیکن اہل ایتھنز کو بھوکا نہ مار سکتا تھا جن کا سمندری راستہ محفوظ اور آمد و رفت کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس جنگ مدافعانہ کے ساتھ وہ اپنے بیڑے سے جزیرہ نمائے پیلوپنی سس میں جابجا دھاوے کر سکتے تھے اور اگر اندرونی علاقوں میں دور تک نہ بڑھیں، اور نہ فتوحات کے لالچ میں بڑی بڑی فوجیں جوکھوں میں ڈالیں، تو فارقلیس انھیں یقین دلاتا تھا کہ وہ اور اُن کی سلطنت کبھی نقصان نہ اُٹھائے گی بلکہ چند ہی سال میں اپنی مدافعت اور بحری تاختوں سے دشمن کو عاجز و پریشان کر دے گی۔ مورخ طوسی دیدش (توسی ڈ ڈیز) کہتا ہے کہ "درحقیقت یہ طریق حرب ایتھنز کے واسطے سب سے محفوظ و کارگر تھا لیکن اس میں حزم و احتیاط اور ایسے صبر و استقلال کی ضرورت تھی کہ اہل ایتھنز کی بے چین طبیعت کا اس پر قانع اور عمل پیرا ہونا مشکل تھا۔ چنانچہ فارقلیس کی وفات کے بعد ہی، جو بدنصیبی سے جنگ کے تیسرے سال واقع ہوئی، اُس کی دوراندیشانہ تدبیریں خاک میں مل گئیں اور اُنھوں نے وہی کیا جس سے وہ ہمیشہ انھیں شد و مد کے ساتھ روکتا رہا تھا"

اسپارٹہ کے حملہ آور بھی فارقلیس کی تدبیروں سے بے خبر نہ تھے مگر وہ سوائے اس کے کچھ نہ کر سکتے تھے کہ ایک طرف اٹیکا کو ہر سال پامال کرتے رہیں اور ادھر ایتھنز کے محکوم اتحادیوں کو اُس سے منحرف کرائیں۔ اور چونکہ اُن شہروں میں اُمرا اول سے ایتھنز کے خلاف تھے لہٰذا امید تھی کہ اگر انھیں امداد پہنچائی جائے تو وہ ایتھنز سے بگڑ جائیں گے اور اسپارٹہ کو مدد نہ دے سکے تو بھی ایتھنز کے لیے نئی نئی دشواریاں ضرور پیدا کر دیں گے۔ اور آخر میں کچھ فصلوں کی مسلسل تباہی اور کچھ اپنے ماتحتوں کی یہ بغاوتیں اُسے ایسا مفلس اور مجبور کر دیں گی کہ صلح کرنے کے سوائے کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے گا۔

اٹیکا پر حملے اور فارقلیس کی وفات | اسی منصوبے کے مطابق اسپارٹہ اور اُس کے حلیف ۴۳۱ ق م میں

اٹیکا پر حملہ آور ہوئے اور فصلیں تباہ کرکے بغیر مقابلہ لوٹ گئے۔ دوسرے سال اُنھوں نے پھر حملہ کیا اور اس دفعہ شہر میں پناہ گزینوں کی کثرت سے ایک وبا ایسی پھیلی جس میں ہزاروں آدمی مر گئے اور لوگوں میں سخت تشویش پیدا ہوگئی۔ اسی زمانے میں فارقلیس کے بعض مخالفوں نے اُسے طرح طرح سے مورد الزام بنانا چاہا، اور لوگ بھی جنگ میں نقصانات اور اس خوفناک وبا کی وجہ سے ایسے بدمزاج ہو رہے تھے کہ اس سال اُنھوں نے فارقلیس کو عہدۂ سپہ سالاری پر منتخب نہ کیا اور اس پر سرکاری حسابات کے متعلق بھی جرمانہ کردیا؛ لیکن یہ تھوڑے دن کی بات تھی اور جب خود حملہ آور اہل پیلوپنیسس وبا کے خوف سے واپس چلے گئے اور شہر میں بھی اس بلا کا زور کم ہوگیا تو فارقلیس کی خدمات و اوصاف ایسے نہ تھے کہ اُس کے ممنون ہم وطن انھیں بالکل بھلا دیتے یا اُسے ذلیل کرکے خوش ہوتے۔ عام پریشانی کی حالت میں اُنھوں نے اپنا غصہ اُس پر اُتار لیا تھا لیکن جلد ہی پشیمان ہوئے اور جب انھی دنوں میں اس کے بعض احباب و اعزا اور پھر دو جوان بیٹے وبا سے مرے تو اہل شہر کو اس بدقسمت خادم وطن پر بہت ترس آیا اور اپنی ناشکری پر سخت ندامت ہوئی۔
فارقلیس پھر اپنے عہدے پر فایز کیا گیا اور اُسے پھر وہی تمام اختیارات حاصل ہوگئے۔ مگر اب اس کی عمر ساٹھ سال سے گزر چکی تھی اور تازہ غموں نے نڈھال کردیا تھا۔ تھوڑے دن میں ایک مہلک قسم کا بخار آنے لگا اور آخر اسی مرض میں اُس نے جان جان آفریں کو سونپ دی۔ (سنہ ۴۲۹ ق م)

اس کی عظمت و صفات

فارقلیس نے جو مرتبہ اپنے وطن کے زمانۂ عروج میں حاصل کیا وہ نہ اس کے پہلے کسی کو ملا نہ اس کے بعد۔ اسی لیے تاریخ یونان قدیم میں جتنے مشہور نام آتے ہیں اُن سب میں فارقلیس کو جو عظمت و نیکنامی حاصل ہے وہ کسی کو نصیب نہیں۔ یہاں تک کہ سکندر بھی، جو دنیا کا ایسا نامی فاتح گزرا ہے، انسانی شرافتوں میں فارقلیس کا مثیل نہیں مانا جاتا۔ کیونکہ آدمی کی سچی برگزیدگی نہ تو ملکی فتوحات ہیں نہ اور کوئی کام جو

اُس نے اپنی ذاتی شہرت و اقتدار یا آسائش و نمائش کے لیے کیے ہوں۔ بلکہ اس کا حقیقی معیار وہ خدمت ہے جو دوسروں کی، عملاً یا اخلاقاً، اُس نے انجام دی، اور وہ فائدہ جو قوم یا نبی نوع کو اُس سے (بالارادہ) پہنچا۔ اور اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ مطلق العنان سکندر اعظم کا مرتبہ وطن پرست فارقلیس سے بہت پست ہے۔ کیونکہ ہر چند، توسی دیڈیز کے الفاظ میں، وہ "جمہور کارہ نما"، ہو نہ کہ تابع، اُس کی یہ فضیلت کسی طرح نہیں ہٹ سکتی کہ فارقلیس جمہوریت کا سچا نمایندہ یا وکیل اور پہلا عالی ظرف یونانی ہے جس نے اپنی ساری قوت قانون عدل اور حقوق مساوات کے ماتحت رہ کر حاصل کی اور جس کا اقتدار کبھی خود غرضی اور نفس پرستی کی شکل میں مسخ نہ ہوا؛

فارقلیس کے جانشین اور بعض کامیابیاں

فارقلیس کی وفات کے بعد ایتھنز میں اُس جیسا دوراندیش اور تجربہ کار خادم وطن کوئی نہ رہا بلکہ وہ لوگ صاحب اقتدار ہو گئے جو محض اپنی پرجوش تقریروں سے لوگوں کو خوش کر لیتے تھے، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ لوگوں کا اس طرح نالائق مگر چالاک افراد کی تقریر یا تحریر سے متاثر ہو جانا، خاص جمہوری نظام حکومت کا نقص نہیں ہے بلکہ نفس انسانی کا عام خاصہ ہے اور جذبات کا عقول و افعال پر مسلط ہو جانا، افراد ہوں یا قوم، محض اُن کی تعلیم و تربیت اور ظرف پر منحصر ہے۔ اور ان سب پہلوؤں کو مدنظر رکھکر ہی جمہوریت کو ایک ترقی پذیر تمدن اور قومی فلاح کا بہترین طریق حکومت مانا گیا ہے ورنہ نقائص سے دنیا کی کوئی جمہوری حکومت بھی بالکل بری نہیں ہے۔

غرض جمہوریۂ ایتھنز میں اب سب سے زیادہ قوت کلیوں اور پھر آگلی بیادیز کو حاصل ہو گئی تھی مگر ایتھنز کا دولت مند طبقہ کلیوں یا اُس جیسے دوسرے مقررین کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور اُس نے اپنی سیاسی انجمنیں الگ بنالی تھیں؛ بایں ہمہ سلطنت کی عام روش ابھی تک وہی تھی اور جنگ کے متعلق بھی فارقلیس کے دستور العمل سے انحراف نہ کیا گیا تھا؛ چنانچہ دشمن کی ایٹی کا میں غارتگری کا جواب بحری حملوں سے دیا جاتا تھا

اور اس میں دو لڑائیاں جیتنے کے علاوہ اہل ایتھنز پیلوپنی سس کے متعدد ساحلی شہروں کو تباہ و برباد کر چکے تھے اور ادھر اُن کا امیر البحر فورمیو خلیج کورنتھ کا بحری راستہ روکے ہوئے تھا اور ایک سپہ سالار، ڈموس تھنیز، اطولیہ پر فوج کشی کر رہا تھا۔ (۴۲۹ ق م)

شدید خوں ریزی | لڑائی کے تیسرے سال فریقین کی دشمنی اعتدال و انسانیت کی حدود سے بالکل باہر نکل گئی تھی: ایتھنز یا اُس کے کسی اتحادی کا جو باشندہ اہل اسپارٹہ کے ہاتھ پڑ جاتا تھا، خواہ مصافی ہو خواہ غیر مصافی، وہ اُسے بے دریغ قتل کر دیتے تھے حتیٰ کہ بعض موقعوں پر ایلچی اور سفیر تک اُن کے طیش و غضب کا شکار ہوئے۔ اور کچھ یہی حالت فریق ثانی کی تھی۔ مفتوح شہروں میں قتل عام کی پہلی نظیر اسپارٹہ نے قائم کی تھی کہ جب طویل محاصرے کے بعد پلاٹیہ کی بہادر فوج نے ہتیار رکھے تو فتحمندوں نے اپنے تھیبزی دوستوں کو خوش کرنے کی غرض سے تمام اہل شہر کو مروا دیا۔ اسی قسم کی سفاکی اہل ایتھنز نے مطی لینہ میں دکھائی کہ جب اُن کا یہ اتحادی اسپارٹہ کی سازش سے باغی ہو گیا اور پھر محصور ہو کر اُسے اطاعت قبول کرنی پڑی تو کلیوں کے مشورے سے اہل ایتھنز نے حکم دیا کہ شکست خوردہ باغیوں میں کوئی بالغ مرد زندہ نہ چھوڑا جائے؛ لیکن بعد میں اس بے رحمی پر پچھتائے اور دوسرا حکم معافی کا بھیجا۔ پھر بھی اتنے یہ معافی پہنچے، ایک ہزار کے قریب اہل مطی لینہ مارے جا چکے تھے۔

سفاک تیریا | اطولیہ پر سپہ سالار ڈموس تھنیز کی فوج کشی چنداں سودمند نہ ہوئی اور اس دشوار گزار ملک سے اس کو ناکام لوٹنا پڑا تھا لیکن تھوڑے ہی دن بعد اُس نے اکرنانیہ میں دشمن پر ایک نمایاں فتح حاصل کی (۴۲۶ ق م) اور پھر اپنی فوجیں مسینیہ کے غربی ساحل پر اُتاریں اور پیلوس پر قابض ہو گیا جو خاص اسپارٹہ کا علاقہ تھا۔ اور جہاں سے غارت گری کے علاوہ اہل مسینیہ کو اسپارٹہ کے خلاف ابھارنے کا بھی موقع

حاصل تھا؛ لہٰذا اسپارٹہ سے فوراً ایک فوج اُسے نکالنے کے لیے بھیجی گئی اور اُسے ہر طرف سے گھیر لیا۔ اسی کوشش میں ان کا ایک حصۂ فوج سفاک ٹیریا پر بھی متعین کر دیا گیا جو پیلوس کے بالکل متصل ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ اور جہاں سے محصورین پر حملہ بھی کیا جا سکتا تھا؛ لیکن ابھی حملہ نہ ہونے پایا تھا کہ ایٹی کا سے اور جنگی جہاز امداد کو آ پہنچے اور ڈموس تھنیز نے بڑی چالاکی سے سفاک ٹیریا کی آمد رفت کا راستہ منقطع اور خود محاصرہ کرنے والی فوج کو محصور و مقید کر لیا۔ انہی سپاہیوں میں جو اس طرح جال میں پھنس گئے بعض نامور اشخاص بھی تھے اور اُن کے گھرنے کی اطلاع اسپارٹہ میں پہنچی تو شہر میں ایک تہلکہ پڑ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسپارٹہ کی محدود آبادی پے در پے زیادہ نقصانات برداشت نہ کر سکتی تھی اور اس تازہ مصیبت نے اُنھیں سخت پریشان کر دیا تھا۔ ایتھنز کی قوت توڑنے اور اپنے حلیفوں کی شکایات دور کرنے کی بجائے اُسے اب جس طرح بنے اپنے محصوروں کو بچانے کا فکر تھا اور اہل شہر اس قدر دل شکستہ ہو گئے تھے کہ خود اُن کے اعلیٰ حکام ایتھنز گئے اور صلح کی استدعا کی۔ مگر اہل ایتھنز نے جو شرطیں پیش کیں ان میں نہ دوراندیشی تھی نہ انصاف۔ صلح کی تحریک ناکام رہی اور تقریباً دو مہینے کی ناکہ بندی کے بعد سفاک ٹیریا کے محصورین نے ہتھیار رکھ دیئے۔ (۴۲۵ق م)

اس واقعے نے ایک طرف تو اسپارٹہ کو یونانیوں کی نظروں سے گرا دیا اور دوسری طرف اہل ایتھنز فتح و ظفر کے جوش میں حد اعتدال سے تجاوز کرنے لگے۔ یونانی سمندروں میں ہر طرف اُنھوں نے اپنے جہاز پھیلا دیئے اور خشکی پر بھی دور دور تک اُن کی فوجیں گھس گئیں اور اُنھیں بحر و بر پر حکومت کرنے کا وہ شوق چرایا جسے فارقلیس ہمیشہ اپنی قوم کے حق میں فال بد سمجھتا تھا۔

امن نامۂ نکیاس

بایں ہمہ جب دو تین سال میں پھر اسپارٹہ کی فوجوں نے اُنھیں چند شکستیں دیں اور اسپارٹہ کا بہادر سپہ سالار براسی ڈاس شہر امفی پولس پر قابض ہو گیا

نیز ۴۲۲ ق م میں کلیوں بھی، اس شہر کے لیے لڑتا ہوا مارا گیا، تو اہل ایتھنز کا جوش ملک گیری بڑی حد تک کم ہو گیا اور اپنے سپہ سالار نکیاس کی کوشش سے اُنھوں نے ۴۲۱ ق م میں اسپارٹہ کے ساتھ صلح کر لی جو نکیاس ہی کے نام پر امن نامۂ نکیاس کہلاتی ہے۔ اس کی رُو سے فریقین کے اسیران جنگ اور مفتوحہ شہر واپس دیدیئے گئے۔ لیکن جو ریاستیں ایتھنز کے ساتھ آملی تھیں اُن پر اُس کا قبضہ رہا اور شہر امفی پولس کے سوائے اُس کے سابقہ مقبوضات میں سے کوئی علاقہ کم نہ ہوا۔ پس مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس دہ سالہ قتل و خونریزی کا کچھ بھی نتیجہ نہ نکلا۔ البتہ دونوں فریق کچھ نہ کچھ کمزور ہو گئے اور اس میں بھی اسپارٹہ جو ایسے دعوے کے ساتھ ایتھنز کو مغلوب کرنے چلا تھا زیادہ نقصان میں رہا۔ اُس کی وقعت خود اُس کے حلیفوں کی نظر میں کم ہو گئی اور اُس نے دو ایک مرتبہ اپنے قومی دشمن ایران سے بھی مدد مانگنے میں دریغ نہ کیا اور ہر چند صلح نکیاس نے اُس کے علاقے واپس دلا دیئے تھے تاہم حلیفوں کے بعض شہروں پر اُس نے ایتھنز کا تسلط تسلیم کر لیا تھا اور اسی وجہ سے اُس کا بڑا حلیف شہر کورنتھ خود اُس کا مخالف ہو گیا تھا۔ چنانچہ یہ ریاست امن کے بعد بھی ایتھنز سے برسرِ پیکار رہی۔

الکی بیادیز

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایتھنز کی وہ قوت و سلطنت جو اسلاف نے بنائی تھی جنگ کے اس پہلے مرحلے سے صحیح و سلامت گزر گئی۔ لیکن حقیقت میں اُسے زیادہ خطرہ اپنے دوستوں سے تھا نہ کہ بیرونی دشمنوں سے۔ کیونکہ امن ہوتے ہی اُس کی آبادی میں پھر جنگ اور فتوحات کا جوش تازہ ہو گیا تھا اور آتش مزاجوں کا ایک گروہ اُسے پھر جدال و قتال کی طرف کھینچ رہا تھا؛ اس گروہ کا سردار عالی خاندان الکی بیادیز تھا جس کی ذات متضاد صفات کا مجموعہ اور اہل تاریخ کے لیے اب تک سامان تعجب ہے۔ عقل و ذہانت محنت و جفاکشی کے ساتھ اُس میں اس بلا کی خود پسندی اور طفلانہ خوئی تھی کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ کبھی تو وہ ایک جوان مرد وطن کا

فدائی تھا کبھی بزدل غدار، کبھی خوش بیان خطیب اور کبھی نہایت بے شرم کاذب۔ اُس کی عجیب و غریب طبیعت کا دو واقعوں سے کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اُس نے شرط لگا کر ایتھنز کے نہایت ممتاز شہری ہپونیکس کے سر بازار مکّا مارا اور دوسرے دن خود ہی اُس کے گھر جا کر سر سامنے کر دیا کہ جو چاہو سزا اسے لو! اور دوسرا یہ کہ جب اُس کی شریف بی بی اُس کی بدسلوکی سے عاجز آ کر حاکم شہر کے پاس طلاق چاہنے گئی تو الکی بیادیز پہلے سے وہاں جا پہنچا اور اپنی بیوی کو سرِ جلسہ گود میں اُٹھا کر گھر لے آیا اور اس پرلطف زبردستی سے اُس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔

اس قسم کا شہرت طلب سودائی مزاج نوجوان تھا جو اب کلیون کا جانشین ہوا اور جس کی پرشغب کوششوں نے دوبارہ آتش جنگ مشتعل کر دی۔ اس مرتبہ پہل ایتھنز کی طرف سے ہوئی تھی کہ وہی آرگس کے نئے اتحاد میں شامل ہو کر اسپارٹہ کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہا تھا اور پھر آرکیڈیا پر فوج کشی میں بھی اہل آرگس کے ساتھ تھا۔ لیکن یہاں مانٹی نیہ کے مقام پر جو لڑائی ہوئی اُس میں اسپارٹہ نے کامل فتح پائی۔ اور اپنی قدیم شہرت و منزلت حاصل کر لی اور آرگس کی نئی انجمن اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا (۴۱۸ ق م)

صقلیہ کی تباہ کن مہم | لیکن ایتھنز کو ابھی تک کسی میدان داری کی نوبت نہ آئی تھی اور وہاں کے بیچین جنگجو قوت آزمائی کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔ بحیرۂ ایجین میں صرف ایک جزیرہ میلوس جو اُن کے احاطہ اقتدار سے باہر تھا، غاصبانہ بے دردی کے ساتھ فتح کر لیا گیا تھا اور اُس کے مرد ہلاک، عورتیں اور بچے غلام بنا لیے گئے تھے۔ اور اب یہ ہوس پیشہ فاتح مصر و صقلیہ کے فتح کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں یونانی نوآبادیاں پہلے سے قائم تھیں اور جن کے سیاسی معاملات میں کچھ مدت سے اہل ایتھنز کا دخل بڑھتا جاتا تھا۔ جزیرہ صقلیہ کا سب سے طاقتور شہر سیراقیوز تھا اور جنگ پیلوپنیسس

میں وہ اسپارٹہ کے دعاوی کا مؤید رہا تھا۔ سنہ ۴۱۶ ق م میں جب جزیرۂ مذکور کے ایک درشہر نے سیراقیوز کے خلاف ایتھنز سے امداد چاہی تو الکی بیادیز کو لوگوں میں اشتعال جنگ پیدا کرنے کا نہایت عمدہ موقع مل گیا۔ میلوس کی تسخیر نے اُن کی آتش طمع پر تیل کا کام کیا تھا الکی بیادیز کی مجنونانہ پھونکوں نے اس کی لَو آسمان پر پہنچا دی۔ اور پھر ہر چند نکیاس اور اُس کے اعتدال پسند ہم خیالوں نے روکنا چاہا وہ آگ قابو میں نہ آئی۔ بلکہ نکیاس نے جتنا اُنھیں ڈرایا وہ اُسی قدر زیادہ شیر ہوتے گئے اور اگر ضرورت ساٹھ کی تھی تو اُنھوں نے سَو جنگی جہاز مہیا کر دیئے کہ مہم کی کامیابی میں خفیف سے خفیف شبہ باقی نہ رہے۔ اتحادیوں کی شراکت سے یہ زبردست بیڑا ایک سو چونتیس جنگی جہازوں پر مشتمل ہوا جس میں پانچ ہزار زرہ پوش جنگ آزما تھے۔ تیراندازوں اور نیم مسلح سپاہیوں کی جمعیت ان کے علاوہ تھی اور پانچ سو باربردار کشتیاں رسد رسانی کے لئے ساتھ تھیں۔ اس عظیم الشان مہم کی قیادت پر نکیاس، الکی بیادیز اور لاماکوس منتخب کیے گئے تھے۔ نکیاس کے بہادر اور تجربہ کار ہونے میں شبہ نہیں لیکن اُسے الکی بیادیز کے ساتھ جو ہر بات میں اس کی ضد تھا، ایسی مہم پر بھیجنا جسے وہ نہایت خطرناک جانتا تھا سخت نادانی تھی۔ لیکن ایتھنز میں فتح صقلیہ کا جوش بحران کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔ اور اس بیخودی میں اُن سے عاقبت اندیشی یا غور و تامل کی اُمید رکھنی فضول تھی۔

الکی بیادیز پر الزام اور اُس کا فرار ہونا

ایک اور ناساعد واقعہ یہ پیش آیا کہ مہم کی روانگی سے چند روز پہلے ہرمس دیوتا کے متعدد بتوں کی کسی نے راتوں رات صورتیں بگاڑ دیں اس دیوتا کو اہل ایتھنز اپنی جمہوریت کا محافظ و مربی جانتے تھے اور اس کے جابجا بُت شہر میں نصب تھے۔ ان بتوں کا اس طرح بگاڑا جانا ایسا خوف انگیز سانحہ تھا کہ سارے شہر میں تلاطم برپا ہو گیا اور سخت توہین مذہبی کے علاوہ لوگوں نے اسے جمہوریت کی دشمنی پر محمول کیا۔ اس جرم کبیرہ، کا جن اشخاص پر شبہ تھا اُن میں الکی بیادیز کے دشمنوں نے

اُس کا نام بھی شامل کر دیا تھا اور مہم کی روانگی سے پہلے اُس نے ہر چند کوشش کی کہ یہ الزام عدالت میں صاف ہو جائے، مگر اُس وقت کوئی سماعت نہ ہوئی اور اُس کی روانگی کے بعد مخالفوں کو موقع مل گیا کہ اہل شہر کو اُس سے بدظن کر دیں۔ یہ بات کہ الکی بیادیز ایک بے اصول وارفتہ مزاج نوجوان ہے، سب کو معلوم تھی اور اس کے روز افزوں اقتدار نے اس کے دشمنوں کی تعداد بھی بڑھا دی تھی۔ لیکن اس مرتبہ اُس کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی کہ ٹھیک اُس وقت جب کہ وہ صقلیہ کے بعض شہروں میں ایتھنز کی عظمت نمائی کر رہا تھا، اور اُنھیں اپنا حلیف بنا لینے میں کامیاب ہو گیا تھا، اُسے ایک ملزم کی حیثیت سے واپس طلب کیا گیا کہ ایسے شدید الزام سے اپنی صفائی پیش کرے جس کا ثبوت مجرم کو سزائے موت کا مستوجب بنا دیتا تھا۔

آتش مزاج الکی بیادیز اس ذلّت کی تاب نہ لا سکا۔ سخت طیش و غضب کی حالت میں اُس نے ترک وطن پر کمر باندھی اور چھپ کر شہر تری میں بھاگ آیا۔ پھر یہ سُنکر کہ اُس کے اہل وطن نے اس کا سر لانے پر انعام مقرر کر دیا ہے، وہ آرگس ہوتا ہوا اسپارٹہ آگیا جو گویا اس بات کا اعلان تھا کہ اہل ایتھنز اُس کے دشمن ہیں تو وہ بھی اُن سے بیزار اور اُن کی تخریب پر تُلا ہوا ہے۔

سیراقیوز کا محاصرہ ادھر بہت دن تک وقت ضائع کرنے کے بعد نکیاس بالآخر سیراقیوز کی طرف متوجہ ہوا۔ شہر والوں نے اس عرصے میں نئے مورچے تیار کر لیے تھے اور انہیں ہلہ کرکے سر کر لینا محال تھا۔ پس نکیاس کو محاصرے کے سوائے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ اور ایک طرف تو خشکی پر اُس نے شہر کے گرد دو دیواریں بنوانی شروع کیں کہ آمد و رفت بالکل مسدود ہو جائے اور دوسری طرف بیڑے سے اُن کی ناکہ بندی کر دی (۴۱۴ ق م) مگر بدنصیبی سے لاماکوس اسی زمانے میں زخم کھا کے مر گیا اور مہم کا انتظام اکیلے نکیاس کے ذمّے رہ گیا جو اپنی کاہلی اور کچھ علالت کے باعث اتنا دشوار کام بخوبی انجام

نہ دے سکتا تھا۔ تاہم اُس کی آزمودہ کاری اور اُس کے پرجوش سپاہیوں کی دلاوری محصورین کی ہمت پست کیے دیتی تھی۔ اب تک جتنے مقابلے ہوئے اُن میں بھی اکثر حملہ آور محاصرین کا غلبہ رہا تھا اور اہلِ شہر ناامیدی میں اطاعت قبول کر لینے پر آمادہ ہوتے جاتے تھے کہ خلافِ توقع ایک دن اُنھیں یہ مژدۂ ہمت افزا پہنچا کہ پیلوپنی سس کی ایک بڑی فوج اُن کی کمک کے لیے آرہی ہے!

اس اطلاع کے ہوتے ہی شہر میں نئی روح پیدا ہوگئی اور جب اسپارٹی جرنیل گلپس مذکورہ سپاہ کو چکر دے کر سیراقیوز میں براہِ خشکی لایا تو محصورین بھی لڑتے ہوئے باہر نکل آئے اور اپنے محسن مددگاروں کو دور سے استقبال کر کے اندر لے گئے۔ اس واقعہ نے لڑائی کا نقشہ بدل دیا۔ محاصرین کو دیوار بنانا ایک طرف، خود اپنا بچاؤ کرنا مشکل ہو گیا اور بحری اور بری مقابلوں میں وہ روز بروز کمزور ہونے لگے۔ سپہ سالار نکیاس نے ان تمام حالات کی مفصل اطلاع اپنے وطن کو بھیجی۔ دشمن کی روز افزوں قوت، اپنے نقصانات، اتحادی سپاہیوں اور غلاموں کی بد دلی، سب کا بے کم و کاست حال لکھا اور اپنے واپس بلائے جانے کی درخواست کی کہ بہت بڑی مدد کے بغیر یہ مہم اب سر ہونی محال تھی۔

ایتھنز کی مشکلات | اور فقط یہی فوج نہ تھی جسے کمک پہنچانا ضروری تھا۔ بلکہ اسی زمانے میں الکی بیادیز کی مفسدہ پردازی نے ان کے لیے اور بہت سی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ اسی غدار کی صلاح سے اسپارٹہ کی ایک بڑی فوج ڈکے لیہ پر قابض ہوگئی تھی جو سرحدِ ایٹکا پر واقع تھا اور جہاں سے غارتگری کے علاوہ، موقع ملتے ہی خود ایتھنز پر حملہ ہو سکتا تھا۔ پس خوف زدہ اہلِ شہر مجبور تھے کہ ایک بڑی جمعیت ہر وقت فصیلوں پر متعین اور تیار رکھیں اور ادھر تمام اجناس جہازوں میں باہر سے لے کر آئیں کیونکہ خود اُن کا مزروعہ علاقہ اب حملہ آوروں کی بالکل زد میں آگیا تھا۔ دوسری طرف، خود

الکی بیادیز بحیرہ ایجین میں گشت لگاکر جا بہ جا ایتھنز کے اتحادیوں کو بھڑکا رہا تھا اور آخر اُس کی جادو بیانی سے خیوس کی حکومت امرا ایتھنز سے بگڑ بیٹھی تھی، اور اس اعتبار سے کہ یہ ریاست آیَ اونیہ میں سب سے طاقتور تھی یہ کچھ کم پریشان کن واقعہ نہ تھا۔ بایں ہمہ اہل ایتھنز کی جواں مردی پر ہزار تحسین و آفریں کہنے کو جی چاہتا ہے کہ مشکلات کے اس طوفان سے ذرا مایوس نہ ہوئے اور ایک طرف تو اُنھوں نے آیَ اونیہ کو فوج بھیجی اور دوسری طرف ڈموس تھینز کو بہت بڑی جمعیت دے کر صقلیہ روانہ کیا اور تیسرے ایک بحری دستہ پیلوپنی سس پر تاخت و یورش کے واسطے تیار کر لیا کہ اگر اٹیکا پامال اور بے چراغ ہے تو دشمن بھی اپنے گھر میں آرام سے پاؤں پھیلا کے نہ سو سکے۔

مہم صقلیہ کی تباہی

ایسی زبردست کمک آ جانے سے نکیاس کی شکستہ دل سپاہ پھر تازہ دم ہو گئی تھی لیکن اس کے حملے سیراقیوز کے مورچوں پر کچھ کارگر نہ ہو سکے اور رفتہ رفتہ ڈموس تھینز کو بھی تسخیر شہر سے مایوسی ہونے لگی۔ اُس نے نکیاس کو واپسی کی صلاح دی اور جتایا کہ اب جس قدر تاخیر ہو گی اسی قدر ہمارا نقصان اور دشمن کا فائدہ ہے کہ اُس کے پاس برابر تازہ امداد پہنچ رہی تھی۔ اوّل اوّل نکیاس حکومت کی باضابطہ اجازت کے بغیر وہاں سے ہٹنا نہ چاہتا تھا لیکن انجام کار اُسے ڈموس تھینز کا مشورہ ماننا پڑا اور اُس نے دوسرے دن روانگی کا حکم دے دیا۔ لیکن اسی رات چاند گہن پڑ گیا۔ اور نکیاس نے جو نہایت اوہام پرست آدمی تھا، ایک مہینے کے واسطے پھر اپنا کوچ ملتوی کر دیا کیونکہ اُن کے عقیدے اور کاہنوں کی ہدایت کے مطابق گہن کے بعد ستائیس دن تک سفر کرنا منحوس سمجھا جاتا تھا۔

دشمن کو اس عرصے میں اُن کے ارادے کی اطلاع پہنچ گئی اور اب اُس نے اپنے بیڑے سے بندرگاہ کا راستہ روک لیا تھا کہ ایتھنزی سپاہ واپس نہ جا سکے۔

چنانچہ ایتھنزی سپہ سالار جو لڑائی سے بچنا چاہتے تھے اب مجبور تھے کہ لڑکر اپنا راستہ نکالیں۔ یہ بحری معرکہ ماہ ستمبر ۴۱۳ ق م میں واقع ہوا، اور یونانی تاریخ کی یادگار لڑائیوں میں شمار ہوتا ہے۔ شہر سیراقیوز کے لوگ ساحل پر کھڑے لڑائی کا تماشا دیکھ رہے تھے اور اپنی فوج کا نعرے لگا لگا کے دل بڑھاتے جاتے تھے۔ اور اہل ایتھنز بھی مایوسانہ جانبازی کے ساتھ مصروف جنگ تھے لیکن موقع کی خرابی اور دشمن کے بڑھے ہوئے حوصلے نے چند گھنٹے کی خوں ریز جد و جہد کے بعد اُنھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور انھیں پھر اپنے ساحلی پڑاؤ پر ہٹ آنا پڑا۔

سمندر کے راستے واپس جانے کی امیدیں اب منقطع ہو گئی تھیں اور اُن کے لیے صرف یہی چارہ کار رہ گیا تھا کہ ممکن ہو تو صقلیہ کے کسی شہر میں پناہ لیں۔ اسی غرض سے اُنھوں نے براہ خشکی شہر قطانہ کا رُخ کیا تھا لیکن غنیم، سمندر میں اتنا خوف ناک تھا، جتنا خشکی پر۔ خاص کر اُس کے سواروں کے سامنے ایتھنز کے تھکے ہوئے پیادے کوئی کامیابی نہ پا سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے پُر عقوبت سفر اور مسلسل پسپائی نے انھیں نہایت پریشان و مضمحل کر دیا۔ اُن کی فوجی ترتیب بگڑ گئی اور ایک دوسرے سے جدا ہو کر آخر میں بہادر ڈموس تھنیز اور شریف نکیاس کو ہتیار رکھنے پڑے (اگرچہ ایک روایت میں ہے کہ قید کی ذلت پر اُنھوں نے خودکشی کو ترجیح دی اور زہر کھا کر مر گئے) بہر حال وہ سپاہِ عظیم جو اس تزک و احتشام کے ساتھ صقلیہ کی فتح کو چلی تھی، کامل طور پر تباہ و برباد ہو گئی اور تیسرے سال کے خاتمے پر اس کا نام صفحۂ روزگار سے مٹ گیا۔

ایرانی مداخلت | مہم کی اس عبرت ناک تباہی نے سچ یہ ہے کہ خود سلطنت ایتھنز کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور اُس کے محکوم اتحادی رفتہ رفتہ اُس کے تسلط سے آزاد ہوتے جاتے تھے۔ اس موقع کو اُس کے قدیم دشمن ایرانیوں نے بہت غنیمت سمجھا تھا

اور وہ آئی اونیہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے برابر اسپارٹہ کو اُبھار رہے تھے کہ ایتھنز کی طاقت جہاں تک ہو سکے توڑ دی جائے۔ تسافرن (تسافرنیس) اُس وقت وسطی ایشیائے کوچک میں ایرانی صوبہ دار تھا اور اس نے اسپارٹہ کی فوجوں کا، جو آئی اونیہ میں آکر لڑیں، تمام خرچ اپنے ذمے لے لیا تھا اور اس کے معاوضے میں، اسپارٹہ نے بھی یہ باعثِ عار شرط قبول کر لی تھی کہ یہ آئی اونی شہر فتح کے بعد ایرانیوں کے حوالے کر دئے جائیں گے۔ (۴۱۲ ق م)

فتنۂ ساموس۔ اور الکی بیادیز کی اسپارٹہ سے اَن بَن

ایران اور اسپارٹہ کے اس نئے اتحاد کا مقابلہ ایتھنز نے اسی مستعدی کے ساتھ کیا جو اُس کی تعجب انگیز خصوصیت ہے۔ اور ہر چند ملیٹس اور جزیرہ لس بوس اُس سے برگشتہ ہو گئے تھے اور مہم صقلیہ کا زخم ابھی تک تازہ تھا، تاہم اُس نے ایک نیا بیڑا اور نئی بحری فوج تیار کر لی اور دشمن کے متحدہ بیڑے پر شہر ملیطہ یا ملیٹس کے قریب فتح حاصل کی۔ بلکہ سیراقیوز سے اسپارٹہ کو بروقت کمک نہ پہنچ جائے تو ملیٹس کا اُن کے ہاتھ سے نکل جانا یقینی تھا۔

اسی حال میں ایتھنزی بیڑے کو ایک اور شورش رفع کرنے کی غرض سے جزیرہ ساموس لوٹنا پڑا جہاں اُمرا نے ایتھنز کے خلاف علم سرکشی بلند کر دیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اُن کی بغاوت قوت حاصل کر سکے خود جمہور اہل ساموس اُن سے بگڑ گئے اور اُن کی بہت بڑی تعداد قتل یا جلا وطن کر دی گئی۔ اس واقعے نے اہل ایتھنز کو بھی نہایت ممنون کیا اور آیندہ سے محکوم رکھنے کی بجائے اُنھوں نے ساموس کو آزاد اور مساوی مرتبہ حلیف تسلیم کر لیا اور ایتھنز کے بیڑے کا جنگی مستقر بھی یہی باموقع جزیرہ بنا لیا گیا۔

اس تمام عرصے میں غدار الکی بیادیز اسپارٹہ کا طرفدار بن کر ایتھنز کی تخریب میں برابر کوشاں رہا تھا اور گلپس کا صقلیہ بھیجا جانا، ڈِکیلیہ پر اسپارٹہ کا قبضہ اور آئی اونیہ میں شورش، یہ سب واقعات اُسی کے مفسدانہ مشورے سے ظہور میں آئے

تھے۔ لیکن اسپارٹہ میں، ظاہری سادگی اور ریاکاری کے باوجود، اُس کی عیاشیاں طشت از بام ہوتی جاتی تھیں خاص کر شاہ ایجیس کی بیگم سے مشہور تھا کہ اُس کے ناجائز تعلقات ہیں۔ اور اسی بنا پر شاہ موصوف اُس کا جانی دشمن اور قتل کے درپے ہو گیا تھا۔ مگر عیار الکی بیادیز کسی سازش کا بہ آسانی شکار ہو جانے والا شخص نہ تھا اور جب اسپارٹہ کی فوجوں میں اُسے اپنی جان خطرے میں نظر آئی تو اُس نے اسپارٹہ کو خیرباد کہی اور ایرانی صوبے دار تِسا فرن کے پاس چلا آیا اور اہل ایتھنز کو دوبارہ اپنا ممنون و دوست دار بنانے کی غرض سے، اُس نے تِسافرن اور اسپارٹہ میں کشیدگی پیدا کرانی شروع کی۔ پھر ساموس میں جو ایتھنز کی فوجیں مقیم تھیں اُن کے بعض افسروں سے نامہ و پیام کی راہ نکالی کہ اگر اُسے وطن آنے کی اجازت اور معافی مل جائے تو وہ ایرانیوں کو ایتھنز کا معین و مددگار بنا سکتا ہے۔

امرائے ایتھنز کی سازش

الکی بیادیز کے یہ تمام وعدے جُھوٹے تھے۔ تِسا فرن اُس کی عزت و مدارت ضرور کرتا تھا لیکن اتنا اُس کے اثر میں نہ تھا کہ جو الکی بیادیز کہے اُسے مان لیتا؛ پھر بھی ایتھنز کے اُمرا یا دولت مند خواص اوّل اوّل اپنے چالاک ہم وطن کے دھوکے میں آ گئے۔ اور چونکہ وہ خود بہت دن سے جس طرح ممکن ہو صلح کر لیے جانے کے خواہاں تھے، لہٰذا ایرانیوں کی مدد کو اُنھوں نے عین مفید مطلب خیال کیا۔ اس موقع پر یہ صراحت کر دینی ضروری ہے کہ ہر چند ایتھنز میں جمہوری حکومت ایک صدی سے قائم تھی اور اس مدت نے اُس کی بنیادیں مستحکم کر دی تھیں تاہم پیری کلیس کی وفات کے بعد طبقۂ اعلیٰ میں جمہوریت کی پھر کچھ مخالفت پیدا ہو چلی تھی اور دولت مند خواص نے اپنی بعض مجلسیں علیحدہ بنائی تھیں جن میں حکومت خواص قائم کرنے کا جذبہ پرورش پاتا تھا۔ اور گو اُن "جوشیلے تقریریوں"، کے سامنے، جو ہزار عیوب کے باوجود جمہوریت کے سچے دل دادہ تھے، ان دولت مندوں کا کچھ زور نہ چلتا تھا، پھر بھی

وہ دل ہی دل میں اپنے نظام حکومت سے بیزار ہوتے جاتے تھے اور اس بیزاری کو بڑی قوت اس خیال سے پہنچتی تھی کہ مصارف سلطنت کا بار زیادہ تر طبقۂ اعلیٰ پر تھا۔ انھی کی جیب سے مجلس عوام کے افراد کو رکنیت کا معاوضہ دیا جاتا تھا اور اب اس تباہ کن جنگ کا خرچ بھی بیشتر انھی پر پڑ رہا تھا جسے دیتے دیتے وہ تنگ آ گئے تھے خاص کر اس وجہ سے کہ لڑائی کی ابتدا اور پھر یہ طوالت ان کے منشا کے خلاف تھی۔ اور ان تمام مالی نقصانات اور صقلیہ کی فوج کشی کے ذمے دار، بلکہ مجرم ان کی نظر میں صرف عوام الناس تھے جنھوں نے نکیاس اور اس کے ہم خیال امرا کی رائے کو نہ مانا اور بلا سبب سیراقیوز سے دشمنی مول لی تھی۔

الغرض، جس زمانے میں الکی بیادیز وطن میں واپس بلائے جانے کا ساز باز کر رہا تھا، اُس وقت وہاں کے دولت مند کسی اور ہی اُدھیڑ بُن میں لگے ہوئے تھے۔ اور ایک روایت کے مطابق خود الکی بیادیز نے انھیں اُبھارا تھا کہ جمہوری حکومت کو الٹ کر حکومت خواص قائم کی جائے۔ کیونکہ وہ خود بھی عوام الناس یا جمہور سے بہت خائف تھا اور اُن کی ناراضگی کو اپنی مراجعت اور سلامتی کے حق میں مضر سمجھتا تھا۔ لیکن اس سازش انقلاب کے ابتدائی مراحل میں وہ شریک ہو یا نہ ہو اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بعد میں جو کچھ ہوا اُس میں الکی بیادیز کا دخل نہ تھا اور امرائے ایتھنز کو اُس کے وعدوں کی حقیقت بھی اُس وقت بخوبی معلوم ہو گئی تھی جب کہ وہ بے غیرتی سے تسافرن کے پاس گئے اور اس سے اعانت و دستگیری چاہی اور اس میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ پس یہاں سے لوٹنے کے بعد اُنھوں نے جو فساد برپا کیا اس میں الکی بیادیز سے انھیں نہ توقع باقی تھی نہ کوئی مدد ملی۔

چار سو غاصب | بہرحال اس فساد کا عملی آغاز اُن امرا کی طرف سے ہوا جو بحری فوج کے ساتھ ساموس میں مقیم تھے۔ انھی اہل سازش نے پسانڈر کو ایتھنز بھیجا اور اُس نے وہاں جا کر علانیہ کہنا شروع کیا کہ جب تک نظام حکومت میں ردّ و بدل نہ کیا جائے ایتھنز

کی مصیبتیں کم نہ ہونگی؛ اسی کے ساتھ اُس کے شریر شرکا نے خفیہ طور پر اُن وطن پرست خطیبوں کو قتل کرا دیا جن سے اندیشہ تھا کہ ہر غیر جمہوری تحریک کی مخالفت کریں گے۔ پھر پِسانڈر نے مجلس عوام میں یہ تجویز پیش کی کہ پانچ اشخاص کی ایک جماعت بنادی جائے اور وہی ایک اور جماعت کو نامزد کرلیں جس کے ارکان کی تعداد سو ہو پھر ان میں سے ہر شخص اور تین کو خود منتخب کرے اور اس طرح کل چار سو افراد کی جماعت سلطنت کے تمام نظم ونسق کی مختار کردی جائے۔

فریب دینے کے لیے پِسانڈر نے اپنی تجویز میں اتنا اور اضافہ کردیا تھا کہ پانچ ہزار شہریوں کی ایک مجلس علیحدہ بنالی جائے کہ "چار سو حاکم"، وقت ضرورت اسی بڑی مجلس کا انعقاد کریں جو مجلس عوام کی قائم مقام ہوگی۔ اور چونکہ مجلس عوام کے جلسوں میں پہلے بھی حاضرین کی تعداد شاذ ونادر پانچ ہزار سے زیادہ ہوتی تھی لہٰذا یہ تعین چنداں ناگوار نہ تھا اور اس تدبیر سے پِسانڈر کا فریب بھی چل گیا اور کچھ اُمرا کی قوّت سے مرعوب ہوکر اور کچھ اس لیے کہ اُن کے مشہور وکیل یا مقرر قتل کرا دیئے گئے تھے، اہل ایتھنز نے پِسانڈر کی تجویزیں طوعاً یا کرہاً منظور کرلیں اور، تھوڑے ہی عرصے کے واسطے سہی، وہاں جمہوریت کی بجائے حکومتِ خواص قائم ہوگئی (سنہ ۱۱ہ ق م)۔

غاصبوں کی حکومت کا خاتمہ نئے نظام سلطنت کی رُو سے جو لوگ برسر اقتدار ہوئے وہ اہل تاریخ میں "چار سو غاصب" (یا جابر) کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ سب طبقۂ اعلیٰ کے افراد تھے اور اُنھوں نے پہلا کام جو کیا وہ اسپارٹہ سے مصالحت کی سلسلہ جنبانی تھی کہ جنگ سے بیزار ہونے کے علاوہ، انھیں حکومت خواص کے واسطے بھی اسپارٹہ سے بہتر کوئی معاون نہ مل سکتا تھا؛ ساتھ ہی جن وطن پرست شہریوں سے مخالفت کا اندیشہ تھا انھیں قتل کرانا شروع کیا اور اپنے مظالم سے بہت جلد یہ بات ثابت کردی کہ جمہور کیسی ہی غلطی اور کج رائی کیوں نہ کریں، جمہوریت بہرحال مطلق العنانی یا حکومت خواص

سے بہتر ہی، اور حقوق انسانی کو کبھی اس بے دردی سے پامال نہیں کرتی جو کہ بادشاہوں یا خواص و اُمرا کی عام خصوصیت ہی۔

ایک مرتبہ اختیار ہیں دے دینے کے بعد کسی ظالم کے پنجے سے پھر نکلنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہی اور ایتھنز کے ان چار سو غاصبوں کا تسلط ہٹنا بھی اب کچھ آسان بات نہ تھی۔ لیکن جزیرہ ساموس میں فوجوں نے جب وطن کے اس انقلاب کا حال سنا تو نہایت برافروختہ ہوئیں اور اُمرا کی کارستانیوں کو خلافِ آئین اور باطل قرار دیا اور الکی بیادیز کے پچھلے تمام قصور بھلا کر دعوت دی کہ آئے اور وہی اس نازک موقع پر اُن کی رہ نمائی کرے۔ اس میں شک نہیں کہ اب الکی بیادیز سازشی امرا کا طرفدار نہ تھا لیکن اس خوش قسمتی کا اُسے خیال تک نہ آیا تھا کہ وہ جو اب تک اپنے وطن کی تخریب میں کوشاں رہا یکایک ایسا ہر دل عزیز ہو جائے گا کہ بلا درخواست سرداری پر طلب کیا جائے! بہرحال خود اُسے اپنے اصول فوراً بدلنے میں نہ پہلے کوئی دقت پیش آئی تھی نہ اب کچھ دیر لگی اور بڑی شان و شوکت کے ساتھ جمہوریہ ایتھنز کے سرپرست کا بھیس بدل کر وہ ساموس جا پہنچا اور فوراً چار سو غاصبوں کو یہ پیام تہدید آمیز بھیجا کہ اگر وہ اپنے غصب کردہ اختیارات سے بلا تامل دستکش نہ ہو گئے تو ہمیں ایتھنز میں پہنچا ہوا سمجھیں اور پھر اپنی سلامتی سے بھی ہاتھ دھولیں۔

اس پیغام نے جو حقیقت میں محض دھمکی تھی، بڑا کام کیا کہ ایک تو اہل شہر کی ہمت بڑھ گئی اور وہ چار سو کی علانیہ مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ اور ادھر خود ان امرا میں انتشار اور باہمی نفاق پیدا ہو گیا۔ یعنی بعض تو کہتے تھے کہ مصالحانہ طریق پر، حسب وعدہ پانچ ہزار شہریوں کی مجلس منعقد کی جائے کہ جمہور کو فی الجملہ اطمینان ہو۔ اور بعض مصر تھے کہ جو قوت ہاتھ میں آگئی ہی اسے بلا جد و جہد نہ چھوڑا جائے اور اسپارٹہ کی مدد سے جمہوریت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے۔ اور عجب نہ تھا کہ یہ غدار اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جائیں۔

مگر اہل اسپارٹہ کے جبلّی تساہل نے اس موقع سے بھی انھیں فائدہ نہ اُٹھانے دیا اور معاملہ طول کھینچنے نہ پایا تھا کہ یہ سازشی امرا اہل شہر کے قابو میں آگئے۔ یعنی کچھ تو روپوش و فرار ہوگئے اور کچھ گرفتار کر لیے گئے۔ ان کی جماعت کا شیرازہ بکھر گیا اور پھر اُسی جمہوری آئین کا دور دورہ ہوا جسے یہ چار سو غاصب اپنے نزدیک قصہ ماضی کر چکے تھے۔

ان غداروں کے خاص خاص سرگروہ بغاوت کے مجرم ثابت ہوئے اور انھیں قتل کر دیا گیا۔ لیکن یہ کارروائی ایسے عدل و اعتدال کے ساتھ کی گئی تھی کہ کوئی تازہ فتنہ پیدا ہونے نہ پایا اور چار مہینے کے تعطّل کے بعد جمہوریۂ ایتھنز چند خفیف آئینی ترمیموں کے ساتھ بحال ہوگئی۔ (۴۱۱ ق م)۔

بعض فتوحات اور شکست اگاسس پیتی

ان خانہ جنگیوں سے اہل شہر کو پوری فرصت نہ ملی تھی کہ جزیرۂ یوبیہ نے بغاوت کی اور اسپارٹہ سے مل گیا۔ سلطنت کا وسیع مقبوضہ ہونے کے علاوہ یہ جزیرہ اس زمانے میں ایتھنز کے لیے سب سے کارآمد تھا کیونکہ خود ایٹی کا میں جب سے زراعت موقوف ہوئی تھی، شہر کی ساری آبادی کا گزارہ ان اجناس پر رہ گیا تھا جو یوبیہ سے براہ سمندر لائی جاتی تھیں۔ اب یہ ذریعہ رسد رسانی مسدود ہوگیا اور دشمن کے جہازوں کو بھی موقع مل گیا کہ وہ یوبیہ کی قریبی بندرگاہوں سے جب چاہیں نکل نکل کر چھاپہ ماریں اور ایتھنز آنے والی کشتیوں کو لوٹ لیں۔ اس مقام پر یہ وضاحت بھی کر دینی چاہیے کہ لڑائی کے ان تیئیس [۲۳] برسوں نے اسپارٹہ کو بحری قوت کی خوبیاں اچھی طرح دکھا دی تھیں اور اب وہ بھی کچھ اپنی کوشش اور کچھ ایرانی مدد سے بیڑے بنا بنا کے بحری لڑائیاں لڑنے لگا تھا۔ اس طرح ایتھنز کو جو فوقیت سمندر میں حاصل تھی وہ رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی بحالیکہ خشکی پر اُس کے دشمن پہلے ہی غالب تھے۔

باایں ہمہ جمہوریت کے دوبارہ بحال ہونے کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں ان میں ایتھنز کو غلبہ رہا اور الکی بیادیز کی مستعدی اور کاردانی کے سامنے دشمن کی کچھ پیش نہ گئی۔

یہاں تک کہ فروری سنہ ۴۱۰ ق م میں کیزی کوس (بحیرہ مارمورا) پر جو لڑائی ہوئی اُس میں اسپارٹہ کا سارا بیڑا غرق ہوگیا اور جب اس کی فوج ساحل پر اُتری تو وہاں بھی الکی بیادیز نے مہلت نہ دی اور ایک یادگار معرکے میں قریب قریب تمام فوج کو تباہ کر دیا۔ اس واقعے سے، سفاک ٹیریا کی طرح، اسپارٹہ میں پھر سخت انتشار پیدا ہوگیا اور وہاں کے لوگ پھر مصالحت پر آمادہ تھے لیکن اہل ایتھنز کے حوصلے الکی بیادیز کی سپہ سالاری نے ایسے بڑھا دئیے تھے کہ وہ صلح پر رضامند نہ ہوئے اور اس میں شک نہیں کہ دو تین سال تک وہ فتح کیزی کوس سے فائدہ اُٹھاتے رہے اور دردانیال اور بحیرہ مارمورا کے اکثر شہران کے قبضے میں آگئے:

مگر اب اُن کی لڑائی صرف اسپارٹہ یا پیلوپنی سس ہی کے ساتھ نہ تھی بلکہ اس میں ایرانی بھی برابر کے حصے دار ہوتے جاتے تھے اور انہی کے روپے سے اسپارٹہ کے نئے امیر البحر لائی سنڈر نے ایک اور بیڑا تیار کر لیا تھا جو پھر ایشیائے کوچک اور آس پاس کے سمندروں میں ایتھنز کے اتحادیوں کو ستا رہا تھا! اسی کے ساتھ سنہ ۴۰۶ ق م میں ایک مقابلہ الکی بیادیز کی عدم موجودگی میں ہوا اور اس کی ہدایت کے خلاف اس کے نالائق نائب نے لڑ کر شکست کھائی۔ اس واقعے نے الکی بیادیز کو اپنے ہم وطنوں کی نگاہ میں بے وجہ مشتبہ بنا دیا اور وہ اپنی سپہ سالاری سے دستکش ہو کر تھریس چلا آیا[1]۔ الکی بیادیز کی جگہ اہل ایتھنز نے قدیم قاعدے کے بموجب دس سپہ سالار منتخب کیے جو اوّل اوّل کامیابی کے ساتھ جنگ کرتے رہے لیکن سنہ ۴۰۵ ق م میں جو فیصلہ کُن لڑائی

---

[1] الکی بیادیز پہلے اپنی جاگیر واقع تھریس میں چلا آیا تھا لیکن اہل اسپارٹہ کی فتحمندیوں سے خوف زدہ ہو کر پھر فرغیہ کے ایرانی صوبے دار کے پاس چلا گیا کہ اُس کی سفارش سے شاہ ایران کے دربار تک پہنچ جائے۔ مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی اور فتح ایتھنز کے بعد اس کے دشمنوں نے اُسے فرغیہ ہی کے ایک گانوں میں ہلاک کرا دیا۔ اور اس طرح یہ نامور سازشی جس کی عجیب قابلیتوں نے زیادہ تر اپنے وطن کو نقصان ہی پہنچایا تھا سنہ ۴۰۴ ق م میں بڑی بیکسی کے ساتھ اسی قسم کی ایک خوفناک سازش کا شکار ہوا جو شاید اس کے لیے نہ غیر موزوں تھی نہ غیر متوقع۔ ۱۲

اگاس پُتیمی پر ہوئی اُس میں انھیں کامل شکست ملی اور حقیقت میں اسی ایک معرکہ نے سلطنت ایتھنز کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ یہ مقام (اگاس پُتیمی) آبنائے دردانیال کے اندرونی دہانے کے قریب، موجودہ قصبہ گیلی پولی کے جنوب میں واقع تھا اور یہاں ایتھنزی امیر البحر لنگر ڈالے بے فکر پڑے تھے حالانکہ دشمن آبنائے کے ایشیائی ساحل پر سامنے موجود تھا اور گو لائی سنڈر نے ظاہرا لڑائی سے بچ کر لمپ سکوس کی کھاڑیوں میں پناہ لے رکھی تھی، تو بھی ایتھنز کے سرداران فوج کا اس کی طرف سے بالکل غافل و مطمئن ہو جانا انتہا درجے کی نادانی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایک دن اسپارٹی جہاز اچانک حملے کے لیے بڑھے تو تھوڑی سی کشمکش کے بعد ہی ایتھنزیوں نے جو لڑائی کے لیے تیار نہ تھے، ہمت ہار دی اور غرور و حقارت کی بجائے اُن کے دلوں میں جلد ہیبت و مایوسی چھا گئی، اور ان کے سارے جہاز اور سپاہی یا تلف ہو گئے یا نہایت انتشار و بے کسی کی حالت میں پکڑ لیے گئے۔ اور ان اسیروں کو بھی لائی سنڈر نے ان کی پچھلی زیادتیوں کے انتقام میں کمال سرد مہری سے قتل کرا دیا۔

سقوطِ ایتھنز

اس طرح ایک ذرا سی غفلت نے گویا ایتھنز کی سالہا سال کی محنت کو ایک گھنٹے میں برباد کر دیا اور اب اس ملکۂ امصار کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ اُس کے مغرور شہری اپنی لمبی فصیلوں میں قلعہ بند ہو کے بیٹھ جائیں۔ اُن کی بحری قوت ٹوٹ چکی تھی۔ اُن کے مقبوضات ایک ایک کر کے لائی سنڈر کے مطیع ہوتے جاتے تھے اور جب نومبر ۴۰۵ ق م میں اُس کے بیڑے نے ایتھنز کی بندرگاہ کا راستہ روک لیا تو محصورین کے پاس رسد رسانی کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا اور آخر مارچ ۴۰۴ ق م میں اُنھوں نے اپنی تقدیر کے آگے سر جھکا دیا۔ یعنی تمام مقبوضات سے ہاتھ اُٹھا لینے کے علاوہ فاقہ کشی کی بدولت اس قدر مجبور ہو گئے تھے کہ اپنی فصیلوں کے انہدام پر بھی رضامند ہونا پڑا جو اُنھیں نہایت محبوب تھیں۔ اسی واقعے کو جنگ پیلوپنی سس اور

سلطنت ایتھنز کا خاتمہ سمجھنا چاہیے۔

جنگ پر تبصرہ ان تیس سالہ خونریزیوں کے اسباب و حالات پر اگر ہم ایک مختصر تبصرہ کرنا چاہیں تو سب سے پہلے ہمیں سلطنت ایتھنز کے نشو و نما پر نظر ڈالنی ہوگی کہ ڈیلوس کے اتحاد کی بنیاد کیوں کر پڑی اور پھر کس طرح اس کی نوعیت بدل کر ایتھنز کی حکومت، یا سلطنت قائم ہوئی۔ اس میں کچھ شک نہیں معلوم ہوتا کہ اس اتحاد کی جب ابتدا ہوئی تو ایتھنز کو حکمرانی اور شہنشاہی کی کوئی ہوس نہ تھی اور خود اُس کے اتحادیوں کی سہل انکاری نے اُسے مقتدر بننے کا موقع دیا تھا۔ لیکن یہ امر کہ اس موقع سے اُس نے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور اپنے اتحادیوں کو بہ جبر محکوم بنایا، گروٹ کی ہزار تاویلوں کے باوجود، ایک کھلا ہوا راز ہے اور ہمارے نزدیک ایتھنز کی جاہ طلبی اور غاصبانہ حرص کا بہترین ثبوت وہ مداخلت ہے جو سنہ ۴۶۰ ق م کے قریب اس نے یونان کے برّی علاقوں میں شروع کی تھی۔ کیونکہ اگر ڈیلوس کا اتحاد قائم رکھنے کی غرض سے بحری اتحادیوں پر جبر کی ضرورت بھی تسلیم کر لی جائے تو بیوشیہ، مگارا وغیرہ علاقوں میں حاکمانہ اقتدار حاصل کرنے کی کوششیں کیونکر جائز ہو جائیں گی؟ اور اگر سنہ ۴۴۵ ق م کی صلح کے بعد اُس نے اپنے غیر بحری مقبوضات سے ہاتھ اُٹھا لیا اور آیندہ یونان خاص میں اپنا نفوذ بڑھانے سے احتراز کیا تو اس کی وجہ بھی یہ نہ تھی کہ اہل ایتھنز کو اب فتحمندی کی ہوس نہ رہی تھی۔ بلکہ یہ کہ اُس زمانے میں انھیں اپنے بحری مقبوضات (یعنی سابق اتحادیوں) کو سنبھالے رکھنا ہی دشوار ہو گیا تھا۔ اور دوسرے اُن کی عنان حکومت اُس زمانے میں ایک ایسے دور اندیش مدبر (پریکلیس) کے ہاتھ میں تھی جو اندرون یونان میں دخل دینا سلطنت کے حق میں نہایت مخدوش جانتا تھا؛ اسی لیے حکومت ایتھنز، جنگ پیلوپنی سس شروع ہونے کے وقت فارقلیس کی اس حکمت عملی پر عامل تھی کہ اپنی داخلی طاقت کو بڑھائے مگر کسی یونانی ریاست سے خود چھیڑ نہ کرے اور واقعات سے ثابت ہے کہ بے شک اس جنگ کی ابتدا ایتھنز کے

دشمنوں ہی کی طرف سے ہوئی تھی جو اس کی خوش حالی کا سخت حسد اور بزعم خود یقین رکھتے تھے کہ اُسے بہت جلد تباہ و برباد کر دیں گے۔

لیکن جب مقابلہ شروع ہوا تو ایتھنز کی بحری قوت اور فارقلیس کی تدابیر جنگ نے دشمنوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور سفاک ٹیریا کی کامل فتح نے اُلٹا اسپارٹہ کو ذلیل و سرنگوں اور مایوس و بدحواس کر دیا۔ مگر بدنصیبی سے جہاں اس فتح نے دشمن کی ہمت پست کی، وہاں اہل ایتھنز کے دلوں میں بھی وہ کبر و ہوس بھر دی جس نے آخر کار انھیں فارقلیس کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹا دیا اور کشورکشایانہ حرص و آز کو اتنا بڑھایا کہ وہ قبضۂ صقلیہ کے خواب دیکھنے لگے! اس حوصلہ مندی کا نتیجہ مہم صقلیہ کی تباہی تھا اور اسی نے ایتھنز کی طاقت کو سخت صدمہ پہنچایا جس کے بعد گو وہ اور آٹھ سال تک اپنے حریفوں سے جاں بازی کے ساتھ جد و جہد کرتا رہا لیکن حقیقت میں اس کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور ایرانی امداد نے غنیم کا پلّہ بہت بھاری کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ بدقسمتی سے خود اُس کے شہری اُس کی تخریب کے درپے تھے حتیٰ کہ اس کی آخری ہزیمت کا باعث بھی اس قدر دشمن کی قوت نہ تھی جس قدر کہ خود اس کے سپہ سالاروں کی مجرمانہ غفلت ہوئی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

باب ہشتم

نسل یونانی کا تنزّل

آگے جن واقعات کا ذکر آتا ہے وہ اس مختصر کی تفصیل ہیں کہ سلطنت ایتھنز کی تباہی کے بعد اسپارٹہ نے ان کھنڈروں پر اپنی سلطنت تعمیر کرنی چاہی مگر تھوڑے ہی عرصے میں ریاست تھیبز نے قوت حاصل کر لی اور چند شکستیں دے کر اسپارٹہ کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور جب یہ باہمی خوں ریزیاں یونان کی ہر ہونہار یا مقتدر حکومت کو مضمحل کر رہی تھیں، مقدونیہ کو عُروج ہوا اور وہاں کے بادشاہوں نے یونانیوں کو کمزور پا کر رفتہ رفتہ سب یونانی ریاستوں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ یہاں پہنچ کر درحقیقت یونان قدیم کی تاریخ ختم ہو جاتی ہے مگر چونکہ مقدونوی تسلط کے بعد بھی یونان کے بعض حصے آزاد، یا آزادی کے لیے کشمکش کرتے رہے، نیز خود مطلق العنان شاہان مقدونیہ بالکل ہی غیر یونانی یا اجنبی نہ تھے لہٰذا اُن کے عہد اقتدار کو بھی یونانی تاریخ میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ خود مقدونیہ فتحمند اہل رومہ کا لقمہ ہوئی اور وہی سیلاب یونان کی رہی سہی آزادی کو بھی بہا کر لے گیا۔

واقعات کے ان غیر مربوط سلسلوں میں طالب علم کے دیکھنے کی خاص بات یہ ہے کہ وہ کون سے گہرے اسباب اندر ہی اندر کام کر رہے تھے جنھوں نے دنیائے قدیم کی اُس نامور قوم کو پست و نگونسار کر دیا جو ایک وقت میں ایران کی عظیم قوت سے بھی مغلوب نہ ہو سکی تھی اور جس میں آخر تک صاحبان فہم و تدبیر کی بھی کچھ کمی نہ تھی؟

یہ مستقل بحث جس قدر ضروری اور سبق آموز ہے اُس سے زیادہ پیچیدہ اور طویل ہے اور اس پر علیحدہ کچھ لکھنے کی بجائے ہم اس بارے میں موقع بہ موقع صرف مجمل اشارے کر سکیں گے۔ لیکن اس تمہید سے مدعا یہ ہے کہ ناظرین محض واقعات کے علم تک تاریخی مطالعے کو محدود

نہ کریں بلکہ اس نکتے کو یاد رکھیں کہ تاریخ کا اصلی مقصود، ظاہری افعال کی تہ میں قوم کے میلان کو تاڑنا ہے اور اُن حالات پر غور کرنا جو اس کی بہبودی و ترقی یا زوال و تباہی کا سبب ہوئے۔

اسپارٹہ کا غلبہ

گزشتہ صفحات میں سلطنت ایتھنز کے عروج و انحطاط کا بیان تھا اور یہ ایک لحاظ سے نسل یونانی کے زیادہ مشہور گروہ آی اونیین کی تاریخ تھی۔ لیکن آیندہ اوراق میں زیادہ تر اسپارٹہ کا نام آئے گا اور یہ گویا ڈوریَین گروہ کے اسباب زوال کی تفسیر ہوگی؛ کیونکہ ایتھنز کے ہٹتے ہی اُس کے تمام مقبوضات اسپارٹہ نے اپنی تحویل میں لے لئے تھے اور اس بات کو بالکل بُھلا دیا تھا کہ لڑائی چھیڑتے وقت اُس نے اپنا مقصد وحید" ایتھنز کے پنجے سے مظلوموں کو چھڑانا،، قرار دیا تھا اور ببانگ دہل اعلان کیا تھا کہ اسپارٹہ نے صرف کمزور ریاستوں کی آزادی اور حقوق عدل و مساوات کے لئے تلوار اُٹھائی ہے! لیکن لڑائی میں اُس کی فتح ہوئی تو وہ خود غرضی اور استبداد میں ایتھنز سے کہیں زیادہ سخت و بے باک ثابت ہوا اور اُس کے فتحمند سپہ سالار لای سنڈر نے شہر شہر پھر کر، جمہوریت کا قلع قمع اور دس دس اشخاص کی حکومتیں قائم کیں جو اسپارٹہ کے " وفادار،، اور اُس کی رضاجوئی کے سامنے وطن کی بُرائی بھلائی سے بالکل بے پروا ہوتے اور ان کے علاوہ خود اسپارٹہ سے ایک شخص ہرموسٹس یعنی ناظم یا عامل بنا کر بھیجا جاتا تھا اور درصل تمام اختیارات اسی کے ہاتھ میں رہتے تھے۔ اسپارٹہ کے یہ عمّال اس درجے متکبّر، خودپسند ظالم اور طامع تھے کہ اُنھوں نے بہت جلد اہل ایتھنز کے مظالم کو بھُلا دیا اور اُن کی زیادتیوں کے سامنے ایتھنز کا پہلا جبر و تحکّم ہیچ ہو کے رہ گیا۔ مگر محکوم ریاستوں میں اسپارٹہ سے نفرت و عداوت کے ماسوا، اس طرز عمل نے ایک دوسرا نتیجہ یہ پیدا کیا کہ خود اسپارٹہ اور اُس کے قدیم اخلاق و تمدّن کی قلب ماہیت ہوگئی اور اب وہاں دولت کی وبا اپنی تمام متعلقہ برائیوں سمیت پھیلنے لگی، جسے قوانین لکرگس نے بڑی سختی سے روکا اور ملک بدر کر دیا تھا۔ دولت

کی یہ چاٹ بیرونی لڑائیوں کی وجہ سے پڑی تھی اور کثیر غنایم جنگ نے اسپارٹہ کے حکام کو نہایت مالدار اور اتنا عیش پسند بنا دیا تھا کہ اب وہ اپنی سادہ اور سپاہیانہ معاشرت کی کسی طرح پابندی نہ کرسکتے تھے۔ اس کے علاوہ، تمول کی بدترین آورد، یعنی عدم مساوات اُن کے قومی اخلاق کا ناس کئے ڈالتی تھی اور وہ قانون کہ ہر شہری ایک معین و مساوی قطعۂ زمین کا مالک ہو، توڑ دیا گیا تھا۔ پس دولت اور زمین روز بروز چند اشخاص کے قبضے میں کھنچی آتی تھی اور عام قاعدے کے موافق، باشندوں کی زیادہ تعداد ذلیل و مفلس ہوتی جاتی تھی جو کہ قوموں کے زوال قوت کا سب سے قوی سبب ہے۔

ان حالات کے ہوتے ساتے یہ امید کہ اسپارٹہ کے زیر اقتدار نسل یونانی کا شیرازہ بندھ جائے گا، کسی طرح پوری نہ ہوسکتی تھی۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ جنگ پیلوپنی سس کی فتح نے اسپارٹہ کو اس قومی خدمت کا بے نظیر موقع دے دیا تھا اور اگر وہ اپنے اقتدار کو ریاست ہائے یونان پر بھی اتنا ہی رہنے دیتا جتنا کہ پہلے جزیرہ نمائے پیلوپنی سس میں اُسے سالہا سال سے حاصل تھا، تو عجب نہیں کہ یونان کی بکھری ہوئی ریاستیں ایک لڑی میں منسلک ہوجاتیں اور وہ رفتہ رفتہ ایک متحد قومی سلطنت بن جاتا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے لکھا، گزشتہ جنگ اور کامیابی نے خود اہل اسپارٹہ کے اخلاق کو ایسا بگاڑ دیا تھا کہ اب اُن کی ظالمانہ حکومت سے کسی اچھے نتیجے کی امید عبث تھی۔ اس کے برعکس ہم تیس چالیس برس کے اندر ہی اندر خود اُن کی قوت کا اضمحلال اور خاتمہ ہوتے دیکھتے ہیں:۔

ایتھنز کا آزاد ہونا

اسپارٹہ کے پنجۂ ستم سے ایتھنز نے سب سے پہلے رہائی پائی۔ نکبت و ادبار کے باوجود اُس کے باشندوں میں آزادی کی روح اور جمہوریت کی دلی محبت موجود تھی اور ہر چند لائی سنڈر نے شہر پر قبضہ ہوتے ہی جمہوریت کو توڑ کر ایسے تیس اُمرا کی حکومت جبراً قائم کر دی تھی جو اسپارٹہ کے چیلے اور آزادی کے دشمن تھے، مگر حُرّیت کا قدرتی امتیاز یہ ہے کہ وہ فنا ہوجاتی ہے مغلوب نہیں ہوتی ——— ایتھنز کے یہ تیس اُمرا بھی

باآں ہمہ سقا کی کو ہیمیت اس ظالم کُش قوت کو مغلوب نہ کر سکتے تھے۔ اسپارٹی سپاہیوں کا ایک دستہ اُن کی اعانت و حمایت کے لیے ایتھنز میں متعین تھا اور اسی کے زور پر وہ جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے۔ جس قسم کا چاہتے "قانون" وضع کر لیتے اور کوئی اُس کی مخالفت یا خلاف ورزی کرتا تو اسے شہر سے نکال دیتے یا بعض اوقات ہلاک کرا دیتے تھے۔ اور ایسے ملزموں کے لیے کسی عدالتی تحقیق یا ثبوت کی بھی ضرورت نہ تھی صرف ان خود غرض ظالموں کی رائے اخراج اور سزائے موت کے واسطے کافی تھی اور اُن کے فیصلے کا کوئی مرافعہ نہ تھا۔ آزادی تقریر و رائے کو جبراً روک دینے کے علاوہ اِن تیس اُمرائے اہل شہر کو جو اذیتیں روحانی اور جسمانی پہنچائیں وہ احاطۂ بیان میں لانی دشوار ہیں۔ انہی مظالم کی بنا پر اُنھیں بعد میں ہمیشہ "تیس جابر" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور انسانی شقاوت اور بداخلاقی کا انھیں سب سے ممتاز اور قابل لعنت نمونہ سمجھا جاتا تھا۔

لیکن یہ شیاطین آٹھ مہینے سے زیادہ شہر پر مسلط نہ رہے بلکہ "مخرجین" یعنی جلاوطن شہریوں نے اُن پر فوج کشی کی اور کئی لڑائیوں میں شکستیں دے کر اُنھیں اور اُن کے حامی اہل اسپارٹہ کو شہر سے نکال دیا اور ۴۰۳ ق م کے موسم بہار میں پھر جمہوری آئین قائم کیا گیا اور اہل ایٹی کا نے دوبارہ اپنی آزادی حاصل کر لی۔

سقراط | مگر اس جنگ و جدال اور شورش و انقلاب نے اہل ایتھنز کے اخلاق پر جو اثر ڈالا تھا وہ رفع فساد اور قیام امن کے بعد بھی زایل نہ ہوا تھا۔ یعنی ایک دوسرے سے بے اعتباری اور بدگمانی، اہل دولت سے عوام کی نفرت و کینہ پروری اور عوام سے اہل دولت کو خوف و وسواس اُس عہد پر آشوب کی خصوصیت بن گئی تھی۔ آئے دن کُشت و خون اور ظلم و استبداد سے اخلاق کو ایک نقصان یہ پہنچا تھا کہ لوگوں کی نظر میں جان و مال اور قانون و رواج کی کچھ حُرمت نہ رہی۔ حق و باطل کی تمیز اُٹھ چلی اور وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ زور و جبر سے جو کچھ کر لیا جائے وہی حق ہے! اسی پر معصیت زمانے

میں ہم ایک شخص کو ایتھنز کی شاہراہوں، عام گزرگاہوں یا میلے تماشوں میں انسانی اخلاق اور حسن معاشرت کا وہ عجیب وغریب سبق دیتے دیکھتے ہیں جو آج تیئس سو برس بعد بھی دُنیا کو شاید اسی قدر عزیز ہے جس قدر کہ اس کے خاص سامعین اور شاگردوں کو ہوگا ــــــ یہ سقراط ہے جو اگرچہ خود محض ایک واعظ یا معلم تھا لیکن یونان کے تمام حکمائے مابعد کا مورث اعلیٰ مانا جاتا ہے۔ وہ ۴۶۹ یا زیادہ سے زیادہ ۴۷۱ ق م میں پیدا ہوا اور جوانی میں اپنے باپ کا پیشہ بُت تراشی کیا کرتا تھا۔ مگر کچھ عرصے بعد، مشہور ہے کہ اُسے بعض خوابوں اور اسی قسم کے اور "ربانی اشارات" سے یہ یقین ہوگیا کہ وہ بنی نوع کی تلقین وہدایت کے واسطے خلق ہوا ہے اور اس وقت سے بُت تراشی چھوڑ کر اُس نے اپنی زندگی پند ونصیحت اور تعلیم وتلقین کے لیے وقف کردی۔ اور وہ دلنشین پیرایۂ گفتگو اختیار کیا جسے اُس کے نامور شاگرد افلاطون کی تحریروں نے دنیا کا بہترین طریق استدلال وبحث بنا دیا ہے۔ اس کے ذاتی اخلاق واوصاف کے بارے میں اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ وہ نہایت راست باز، عادل، پرہیزگار، بنی انسان کا سچا ہمدرد اور اپنے وطن کا فدائی تھا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اُسے اپنے جذبات پر غیر معمولی قابو حاصل تھا اور کوئی انسانی خواہش اُسے راہ صواب سے نہ ہٹا سکتی تھی۔ اُس کی ظاہری حالت یہ تھی کہ ایک پستہ قامت، بدصورت اور بدلباس آدمی تھا جسے تنگ دستی، اچھا کھانے یا پہننے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ بایں ہمہ اُس نے کبھی اپنے دوستوں یا عقیدت مندوں سے کوئی امداد لینی پسند نہ کی اور خود اپنی ضرورتوں کو اتنا کم کردیا کہ اُس کے تنگ وسائل آمدنی سے پوری ہوجائیں۔ کیونکہ اُس کا قول تھا کہ "احتیاج سے مستغنی ہونا ربانی صفت ہے اور انسان بھی جس قدر کم احتیاج ہو اسی قدر ربانیت کے زیادہ قریب ہے!"

اُس کی تعلیم اگرچہ سقراط صحیح معنوں میں فلسفی نہیں ہے اور نہ اُس نے درخواستوں کے باوجود کسی کو باقاعدہ کوئی درس دیا پھر بھی اس کی مسلسل بحث وگفتگو کا ایک خاص مدعا ہوتا تھا

اور یہی مذہب سقراط کے نام سے موسوم ہے جسے ہم ذیل میں بہ اجمال بیان کرتے ہیں :-

سقراط کی پہلی تعلیم "علم انسانی کا محدود ہونا" ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ ہربرٹ اسپنسر سے کہیں پہلے "مافوق العلم" (ان نوایبل) کی اصطلاح اُسی نے بنائی یعنی بہت سے مسائل الٰہی کو علم انسانی کے ماوریٰ قرار دیا اور اسی ضمن میں قدیم شعرا اور اہل مذہب کی (جو اپنے دیوتاؤں کو متضاد صفات سے متصف اور عجیب و غریب افعال کا فاعل مانتے تھے) تردید و تکذیب کی۔ بایں ہمہ سقراط خود پورا موحد تھا اور حکیم انک گورس کے بعد ایک قادر مطلق خدائے واحد کا مفہوم اُسی نے لوگوں کو سمجھایا کہ وہ خالق کل، جسم اور مادے سے بری ہے۔

لیکن سقراط کا اصلی میدان حقوق عباد ہے کہ انہی کی بجا آوری کو وہ سب سے بڑی عبادت سمجھتا تھا اور انہی کو جاننا اس کے نزدیک پہلی شرط آدمیت تھا۔ اور اس کے واسطے "علم صحیح" کا حاصل کرنا ضروری تھا کہ "جہاں علم صحیح ہوگا وہاں عمل صحیح کا ہونا لابد ہے۔ کیونکہ کوئی شخص علم ہوتے ساتھ بدی کو نیکی پر ترجیح نہیں دے سکتا" اور اگر بعض حالتوں میں کوئی شخص علم رکھنے کے باوجود بدی کا مرتکب نظر آتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ درحقیقت وہ شخص علم صحیح نہیں رکھتا۔ اس واسطے کہ جس طرح یہ جاننے کے بعد کہ آگ جلاتی ہے کوئی عمداً اُس میں ہاتھ نہیں ڈالتا اسی طرح غیر ممکن ہے کہ برائی کو قرار واقعی جاننے کے بعد کوئی اُس کا ارتکاب کرے! بالفاظ دیگر، علم ہی تمام اعمال حسنہ کا مبدا اور اس لیے اصل "نیکی" ہے۔ رہا یہ کہ خود نیکی کی شناخت اور غایت کیا ہے تو اس کے جواب میں سقراط گروہِ افادیین کی طرح کہیں تو "ہر کارآمد اور فائدہ بخش" فعل کو نیکی بتاتا ہے اور کہیں خاص خاص صفات کو انسان کا مابہ الامتیاز اور انہی کے مطابق افعال کا سرزد ہونا نکوکاری قرار دیتا ہے۔

اُس کی موت سقراط کی تعلیم اس قسم کی تھی۔ اور چونکہ وہ ہر شخص کے دعاوئ علم و فضیلت کو اُس کے عمل سے جانچتا تھا اور جاہل اہل اقتدار ہوں یا ریاکار سوفسطائی، سب کی قلعی

کھولتا تھا اس لیے بہت سے لوگ دل ہی دل میں اُس سے بیزار ہو گئے تھے۔ پُرانے خیال کے مذہبی لوگ پہلے سے بدگمان تھے اور جب سیاسی یا مُلکی معاملات میں بھی اُس نے اپنی حق گوئی اور بحث و نکتہ چینی جاری رکھی تو اوّل حکومت خواص اور پھر جمہوریت کے دلدادہ، دونوں "انتہا پسند" فریق اُس سے ناراض ہو گئے اور ۳۹۹ ق م میں اُس پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ لامذہب ہے۔ یعنی مسلّمہ خداؤں کی بجائے نئے معبودوں کی پرستش کرانی چاہتا ہے اور دوسرے یہ کہ "نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے"۔ مستغیث اَلی ٹس نامی ایک شاعر تھا اور جمہوری حکومت کے دو رُکن رکیں اُس کے مددگار تھے اور ثبوت جرم پر موت کی سزا اُنھوں نے تجویز کی تھی۔ اس موقع پر مخالفین کی قوّت کا سب کو علم تھا لیکن سقراط نے عدالت میں جو تقریریں کیں اُن سے خوف و ہراس کی بجائے ایسی حقارت اور بے پروائی ٹپکتی تھی کہ خود عدالت کے جج اُس سے ناخوش ہو گئے اور وہ کثرت رائے سے سزائے موت کا مستوجب قرار دیا گیا۔ فیصلہ سُن کر سقراط نے عدالت میں پھر ایک تقریر کی۔ اپنی موت پر خوشی سے آمادگی کا اظہار کیا اور قید خانہ میں آ کر اطمینان کے ساتھ اپنے ہلاک کیے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اور ہر چند قید سے نکل جانے کا موقع تھا اور اُس کے دوستوں نے بڑی التجائیں کیں کہ ایسے ظالمانہ فیصلے سے بچ جانا کسی طرح ناجائز نہیں ہے لیکن سقراط نے کسی کی بات نہ مانی "برائی کے جواب میں بھی"، اُس نے کہا "برائی کرنا، برائی ہے! دوسرے، اگر موت ایک دائمی نیند ہو تو اور اگر محض جسم سے روح کی جدائی ہو، تو ــــــــ ہر حال میں زندگی سے بہتر ہے۔ اور جب اُس کا (یعنی موت کا) وقت آئے تو دانائی کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا جائے"۔

غرض اس وقت تک کہ حسب دستور اُس نے زہر کا پیالہ پیا اور چند لمحوں میں مرنے کے لیے، چادر اوڑھ کر لیٹ گیا، سقراط کامل اطمینان اور بشاشت کے ساتھ اپنے دوستوں سے باتیں اور حکیمانہ نصیحتیں کرتا رہا۔ اور جب اُس کے دوست ضبط نہ کر سکے اور بے اختیار

ہو کر بہ آواز روے، تو کہنے لگا "صاحبو، یہ تم کیا کرنے لگے؟ میں نے تو عورتوں کو اسی لیے بھجوا دیا تھا کہ وہ اس قسم کی کوئی نادانی نہ کریں۔ کیونکہ میں نے سنا ہے مرتے وقت یہ بدفالیاں (گریہ و ماتم) نہ ہونی چاہئیں۔ بس خاموش ہو جاؤ اور ضبط سے کام لو . . ." اسی میں تشنج ہونے لگا اور اُس نے ایک زور سے انگڑائی لے کر دم توڑ دیا۔

اُس کا اثر

سقراط نے جس طرح زندگی بسر کی اور جس بہادری سے جان دی اس کی نظیر دُنیا میں مشکل سے میسر آئے گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ گو اُس نے باقاعدہ فلسفے کی تعلیم نہ دی تھی لیکن جب یہ ثابت ہو گیا کہ جو کچھ وہ کہتا تھا اُس پر وہ زندگی اور موت، ہر حال میں قایم رہا تو دلوں میں اُس کی عظمت نقش ہو گئی۔ اور پھر جتنے حکمائے یونان ہوئے سب نے اُسی کو اپنا اُستاد اور کامل انسانیت کا نمونہ مانا۔ یہاں تک کہ اگر پیروان اپی کیورس کو سقراط کی "دنکو کاری" میں اپنے مذہب لذاتیہ یا مسرت جوئی کی تصدیق نظر آتی تھی تو مردم بیزار دیوجانس اُس کی سادگی اور کم احتیاجی میں اپنی رُہبانیت کا جلوہ دیکھتا تھا۔ مگر سقراط کا سب سے نامور جانشین حکیم افلاطون الٰہی ہے جس نے اُس کی مجموعی تعلیم کو ترقی دے کر فلسفۂ یونانی کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی اور اپنے دامن تربیت میں ارسطو جیسے قابل فخر شاگرد پرورش کیے۔ لیکن اس بیان کو طول دیئے بغیر یہاں فیض یافتگان سقراط کا ایک مختصر شجرہ لکھ دینا زیادہ مناسب ہوگا:۔

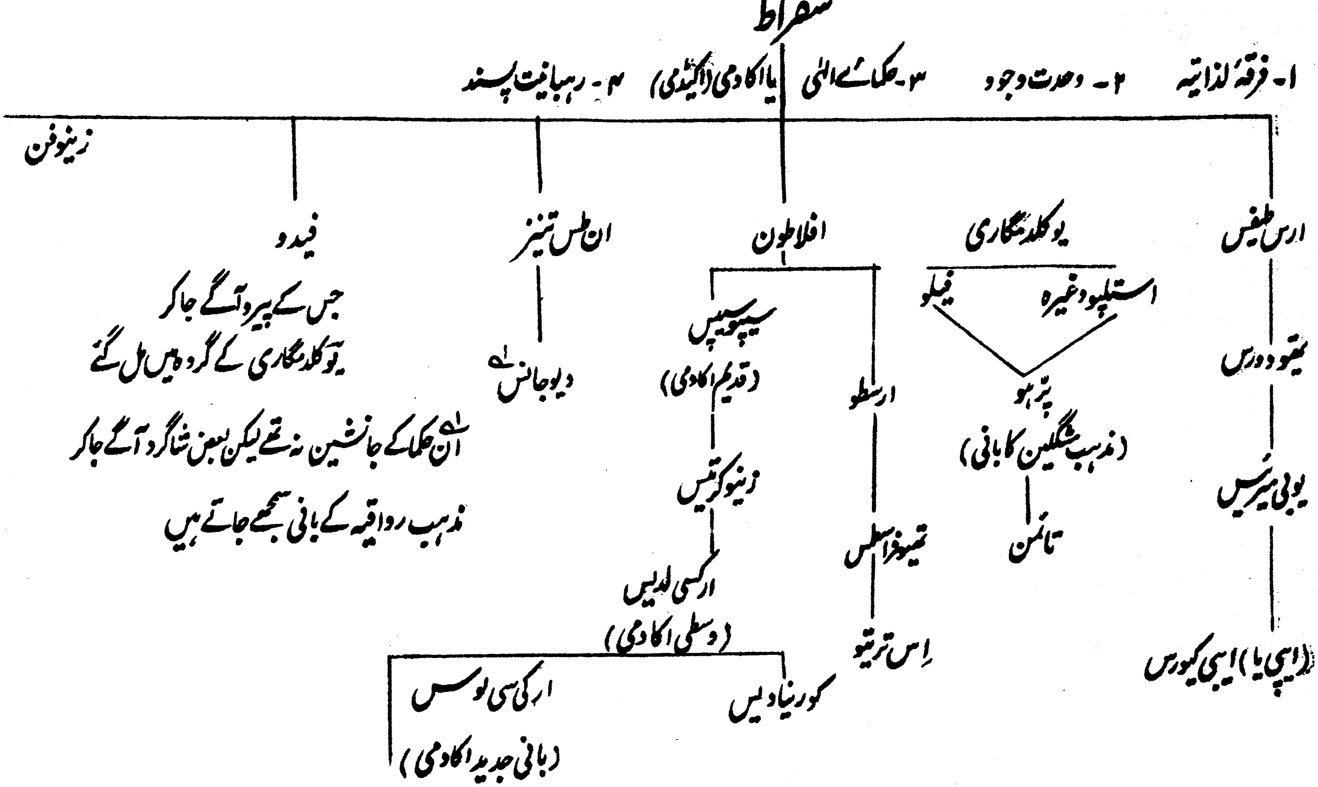
سقراط
۱- فرقۂ لذاتیہ
۲- وحدت وجود
۳- حکمائے الٰہی یا اکادمی (اکیڈمی)
۴- رہبانیت پسند
زینوفن
ارس طیفس
تیتو دورس
یوہی میرس
(ایپی یا) ایپی کیورس
یوکلد نگاری
استلپو وغیرہ
فیلو
پڑہو
(مذہب تشکیک کا بانی)
تائمن
افلاطون
ارسطو
تھیوفراسطس
اس ترتیو
سپوسپس
(قدیم اکادمی)
زینوکرتیس
ارکسی لدیس
(وسطی اکادمی)
کورنیادیس
ارکی سی لوس
(بانی جدید اکادمی)
ان طس تینز
دیو جانس[1]
فیدو
جس کے پیرو آگے جاکر
یوکلد نگاری کے گروہ میں مل گئے
[1] ان حکما کے جانشین نہ تھے لیکن بعض شاگرد آگے جاکر
مذہب رواقیہ کے بانی سمجھے جاتے ہیں

"دس ہزار کی پسپائی" لیکن اب ہم اس مشہور واقعے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اسی زمانے کے قریب کا ہے اور جسے زینوفن کی دلکش تحریر نے شہرت جاودانی کا لباس پہنایا ہے!
جنگ پیلوپنی سس کے زمانے میں سلطنت ایران کی ریشہ دوانیاں ہم دیکھ چکے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ اگر ایرانیوں کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو اہل اسپارٹہ کسی طرح لڑائی میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ اس مدد کے معاوضے میں علاقہ ای اونیہ پر انھیں دوبارہ تصرف اور ایک بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اُن کے یونانی دشمن کمزور اور ایرانیوں کے دست نگر ہو گئے تھے۔ چنانچہ ہم آیندہ دیکھیں گے کہ یونانیوں کے اندرونی معاملات میں اُن کا دخل کتنا بڑھ گیا تھا۔ مگر اس وقت اُس فوج کشی کا ذکر کرنا منظور ہے جو شہزادہ سیروس یا کورش نے اپنے بڑے بھائی اردشیر ثانی پر کی تھی۔ یہ دونوں شاہزادے باپ کے بعد تخت ایران کے دعوے دار تھے۔ کورش عمر میں چھوٹا اور اپنے باپ کے زمانے سے ایشیاے کوچک کا والی حکومت تھا۔ اور لای سنڈر کو اُسی نے ایرانی روپئے سے جنگ پیلوپنی سس میں مدد دی تھی۔
اردشیر ثانی نے اپنے بھائی کو صوبے داری پر برقرار رکھا تھا لیکن کورش نے اس پر قناعت نہ کی اور بادشاہی کی ہوس میں ایک بڑی فوج لے کر بھائی پر چڑھائی کی۔ اُس کی اسی فوج میں تقریباً تیرہ ہزار یونانی سپاہی بھی بھرتی ہو گئے تھے جن کی تعداد بعد میں دس ہزار مشہور ہو گئی اور جب کورش بابل کے قریب جنگ میں مارا گیا اور یہ فوج مجبوراً اپنے وطن یونان کو واپس ہوئی تو اس واقعے کو بھی "دس ہزار کی پسپائی" کہنے لگے۔ پسپائی اس لیے کہ انھیں جنگ میں ہزیمت ہوئی تھی اور پھر غنیم کے ملک میں سے ہزاروں میل کا پرمشقت سفر طے کر کے واپس ہونا پڑا تھا (۴۰۱ ق م)
یہی وہ واقعہ ہے جس نے بڑے بڑے یونانیوں کی نظر میں ایران کو حقیر کر دیا اور اُس سلطنت کی بد انتظامی اور اندرونی کمزوری کا راز ان پر کھل گیا جو اتنی دور بڑھ آنے کے باوجود ایک چھوٹے سے لشکر کو نکل جانے سے نہ روک سکی۔ اور مورخوں کا خیال ہے

کہ اسی واقعہ نے ساٹھ برس کے بعد شاہان مقدونیہ کو خود ایران پر فوج کشی کرنے کا حوصلہ دلایا اور آخر سکندر کے ہاتوں اس عظیم و باجبروت سلطنت کیانی کو تاراج و پامال کرا دیا۔

اسپارٹہ کی لڑائیاں ایران اور یونانیوں سے

لیکن اسکندر کی فوج کشی بہت بعد کی بات ہے۔ خود اُسی زمانے میں "دس ہزار کی پسپائی" کا ایک اثر یہ ہوا کہ اسپارٹہ جو سلطنت ایران کا ممنون منت اور اب تک ایک احسان مند حلیف تھا، اس سے منحرف ہوگیا اور ۳۹۶ ق م میں یونانیوں کا بادشاہ اجیس ایشیائے کوچک پر حملہ آور ہوا؛ ایرانی صوبے داروں کے ساتھ اگلے تین برس میں جو لڑائیاں اسپارٹہ کی ہوئیں ان کی تفصیل بیکار ہے اُن سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ واقعی اہل ایران کی عیش پرستیوں نے انھیں اب اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ میدان جنگ و قتال کی سختیاں اُٹھا سکتے۔ اور اسی لیے وہ اپنے دشمن کا جب توڑ کرنے روپے کی افراط سے کرتے تا اور نیزہ و شمشیر سے مقابلہ کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔

بایں ہمہ جب اہل اسپارٹہ کے جابرانہ تحکم نے خود یونانی ریاستوں کو ان کے خلاف متحد کر دیا تو آخر میں ایرانی روپیہ اسپارٹی شجاعت سے بازی لے گیا؛ یعنی جس وقت تھیبز، کورنتھ، آرگس اور ایتھنز نے مل کر یورش کی تو اہل اسپارٹہ کو اپنی فوجیں مجبوراً ایشیا سے واپس طلب کرنی پڑیں اور ایران کو مغلوب کرنے کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔

اسی زمانے میں جزیرہ روڈس کے قریب ایک بحری معرکہ ہوا (جنگ نیڈس ۳۹۵ء) جس میں اسپارٹہ کو شکست فاش ہوئی اور ایرانیوں کا زبردست بیڑا سمندر پر حاوی ہوگیا؛ اس بیڑے کا سردار برائے نام ایرانی صوبے دار فرنابازوس تھا ورنہ اصلی کمان کونن ایتھنزی کے ہاتوں میں تھی جسے اس کے شکر گزار ہم وطن "تمسٹاکلیس ثانی" کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے؛ کیونکہ اسپارٹہ کی بحری قوت توڑ کر اس نے ۳۹۳ ق م میں پیریوس کے استحکامات اور ایتھنز کی لمبی فصیلیں دوبارہ تعمیر کرائیں اور اس طرح ایک

مردہ قالب میں از سر نو ایسی جان ڈال دی کہ اگرچہ ایتھنز پہلی سی عظمت و سلطنت نہ حاصل کر سکا تاہم آیندہ ایک مضبوط اور مستقل ریاست ضرور بن گیا اور جب تک مقدونیہ کی فوجی طاقت نے یکے بعد دیگرے سب یونانی ریاستوں کا قلع قمع نہ کر دیا اس کی یہ حیثیت باقی رہی۔

امن بادشاہی ۳۸۶ ق م

ان قوی دشمنوں نے مل کر، اسپارٹہ کو اب ایسا تنگ کر دیا اور ایشیا، دردانیال، شمالی یونان اور جزو پیلوپنی سس میں انہیں اتنے مقابلے کرنے پڑے کہ بالآخر وہ کامیابی سے مایوس ہو گئے اور ذلیل و خاسر ہو کر پھر ایرانیوں سے صلح کی التجا لائے؛ ایرانی دربار میں بھی ایک با اثر جماعت اسپارٹہ سے کچھ پہلے تعلقات اور کچھ ایتھنز کی دشمنی کی وجہ سے، اُن کی طرفدار تھی لہذا یہ کوشش بیکار نہ گئی اور فرنابازوس کے جانشین صوبہ دار فرغیہ نے ایک بڑا جلسہ کیا جس میں فریقین کے وکلاء شریک تھے اور جس میں دارائے عجم کا یہ پیام پڑھ کر سنایا گیا:۔

"شاہ آرتازرکسیز کے نزدیک مناسب ہے کہ جزائر قبرص اور کلازومینی اور ایشیائے یونانی مابدولت کے زیر فرمان رہیں اور باقی تمام یونانی شہر چھوٹے یا بڑے بالکل آزاد چھوڑ دئے جائیں بجز لمنوس، امبروس اور سکائی روس کے جو پہلے کی طرح اہل ایتھنز کے قبضے میں رہیں گے۔ اگر کوئی ریاست ان شرائط کو تسلیم نہ کرے گی تو میں ہم خیال ریاستوں سمیت خشکی اور تری پر روپے اور جہازوں سے اُس کے ساتھ جنگ کروں گا!"

ان شرائط پر سب وکلاء نے سر تسلیم خم کر دیا اور طوعاً یا کرہاً کل ریاستوں کے صلح نامہ پر دستخط ہو گئے جس کا دوسرا نام امن نامہ انتالکی داس بھی ہے کہ اسپارٹہ کی طرف سے ایرانیوں کے پاس جو سفیر بھیجا گیا تھا اس کا نام انتالکی داس تھا، اور یہ صلح زیادہ تر اسی شخص کی کوشش سے ہوئی تھی اور اس سے بعد میں اسپارٹہ ہی نے فائدہ اٹھایا تھا۔

اس عہدنامہ کے متعلق مؤرخوں کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض نے تو اس بنا پر کہ ایرانی بہت پہلے سے یونانی معاملات میں دخیل تھے اسے ایک معمولی واقعہ سمجھا ہے لیکن اکثر مصنفین کی نظر میں مصالحت ہیلاس کے لیے باعث ننگ اور اس کی عزت و آزادی کے سراسر منافی تھی۔

لیکن اسپارٹہ کا منشا ضرور پورا ہوگیا کہ دولت عجم پھر اس کی دوستدار بن گئی مگر اسی وجہ سے مصالحت کی اصلی شرط بھی فوت ہوگئی۔ یعنی تمام یونانی ریاستوں کی آزادی کا جو اعلان کیا گیا تھا اس پر کوئی عمل نہیں ہوا اور جہاں جہاں اسپارٹہ کی زبردستی چل سکتی تھی وہاں اس کے ہرموسٹ اسی طرح ظلم و جبر کرتے رہے۔

اولن تھس اور تھبنز — اہل اسپارٹہ کی ابتدا سے یہ خصوصیت رہی تھی کہ وہ کسی دوسری ریاست کی ترقی اور طاقتوری کو دیکھنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ جنگ پیلوپنی سس کی ایک بڑی وجہ بھی یہی حسد ہوا تھا اور اب جو اسپارٹہ کے تعلقات وسیع ہوئے تو ان کا دائرہ حسد بھی اسی مناسبت سے بڑا ہوگیا تھا چنانچہ خود اپنے محسن ایرانیوں کے ساتھ انھوں نے اسی لیے لڑائی نکالی تھی کہ وہ اسپارٹہ سے زیادہ طاقتور نظر آتے تھے۔ اس لڑائی میں جیسا کہ ہم ابھی پڑھ آئے ہیں، اسپارٹہ کو کامیابی دو وجہ سے نہ ہوسکی۔ اوّل تو یہ کہ ایرانیوں کا سونا، جو پہلے اسپارٹہ کا سامان قوت تھا، اب ان کے خلاف استعمال ہوا اور ثابت ہوگیا کہ وہ اسپارٹہ کے باہر بھی سکۂ رواں کا حکم رکھتا ہے۔ دوسرے خود یونان اسپارٹہ کے خلاف ہتیار سنبھال کر اُٹھ کھڑا ہوا، اور بیوشیہ اور کورنتھ کے وہی شہری جو کل تک اسپارٹہ کے دوش بدوش ایتھنز سے لڑ رہے تھے اب ایتھنز کے ساتھ ہو کر اسپارٹہ کے مقابلے میں صف آرا ہوگئے۔

بالآخر ان حالات نے اسپارٹہ کو مجبور کیا کہ وہ دامن ہوس زیادہ نہ بڑھائے اور ایرانیوں کی مدد سے پہلے صرف یونان پر اپنا اقتدار مضبوطی سے قائم کرلے؛ چنانچہ امن نامہ پادشاہ کے بعد ہم اس کی تمام کوششیں اسی نقطے پر مرتکز دیکھتے ہیں کہ وہ یونان میں ہر طرف

اپنا تسلط جمار ہا ہے اور کسی ریاست کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتا، اور بجبر اپنے اتحاد میں شریک رکھتا ہے۔

اسپارٹہ کو اس کوشش میں بعض چھوٹی ریاستوں سے جو لڑائیاں پیش آئیں انھیں ہم قلم انداز کرتے ہیں اور شہر اولن تھس کے ساتھ اس کی رقیبانہ آویزش کا حال لکھتے ہیں کہ اسی ضمن میں تھیبز پر بھی اُس نے دھوکے سے قبضہ کر لیا تھا۔

چالسی ڈیس یا (کالکی ڈیک) کا سہ شاخہ جزیرہ نما اور علاقہ تھریس مدت سے یونانی ترک تازوں کی جولانگاہ رہا تھا اور اسپارٹی جرنیل براسی ڈاس کو ہم انھیں میدانوں میں لڑتا ہوا دیکھ چکے ہیں۔ لیکن جنگ پیلوپنی سس کے بعد اس جزیرہ نما میں ریاست اولن تھس کے ماتحت ایک مضبوط اتحاد قائم ہوا جس نے اندرونی تحفظ کے علاوہ ریاست مقدونیہ سے بھی کئی لڑائیوں میں فتح حاصل کی۔ اس پر مقدونیہ کے بادشاہ امن تاس نے اسپارٹہ سے فریاد کی اور اسپارٹہ کے حاسد اہل ہوس فوراً اس بڑھتی ہوئی طاقت کو دبانے پر آمادہ ہو گئے اور کچھ فوجیں شمال سے بھیجیں اور کچھ بیوشیہ کے راستے روانہ کیں کہ شہر اولن تھس پر فوج کشی کریں اور اسی دوسری فوج کے تھیبز سے گزرنے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بعض امرانے سازش کر کے قلعہ اہل اسپارٹہ کے حوالہ کر دیا اور اسی فوج کی مدد سے اپنی حکومت قائم کر لی، جو تین سال تک اہل تھیبز پر طرح طرح کے ظلم و تشدد کرتی رہی (۳۸۲ ق م)

اس عرصہ میں اسپارٹہ کی دوسری فوجوں نے جزیرہ نمائے چالسی ڈیس میں ہر طرف آتش و خون کا بازار گرم کر دیا تھا اور اگرچہ میدانی لڑائیوں میں انھیں کئی شکستیں ملیں تاہم کثرت تعداد، اور شجاعت و استقلال نے آخر میں اُنھیں کو فتحمند کیا اور اہل اولن تھس نے محصور و مجبور ہو کر ۳۷۹ میں ہتیار رکھ دیئے۔ ساتھ ہی ان کے اقتدار و اتحاد کا خاتمہ ہو گیا اور یہ بدنصیب بھی طاقتور اسپارٹہ کے سلک اطاعت میں منسلک ہو گئے۔

لیکن اسی زمانے میں ان کا دوسرا اشکار (تھیبز) ان کے پنجہ سے نکل گیا۔ یعنی قلعہ شہر پر اہل تھیبز دوبارہ قابض ہو گئے۔ اسپارٹہ کے متعینہ افسر دھوکے سے مار ڈالے گئے۔ اور ان کے سپاہی بمشکل جان بچا کر منتشر ہو گئے۔

ایتھنز کا نیا اتحاد

امن نامہ انتالکی داس نے اگرچہ ایتھنز کو ایرانیوں کی امداد سے محروم کر دیا تھا مگر بحر ایجین میں ان کا اثر دوبارہ بڑھتا جاتا تھا۔ اسپارٹہ کی حکومت کے تلخ تجربے نے بہت سی ریاستوں کو اسپارٹہ سے ایسا بیزار کر دیا تھا کہ وہ پھر اتحاد ڈیلوسی کو زندہ کرنا چاہتے تھے اور گو ایتھنز کی حاکمانہ صدارت کی ذلتیں انھیں یاد تھیں پھر بھی وہ اس کے ساتھ متحد ہونا اپنی آزادی کے لیے اسپارٹہ کے اتحاد سے بہتر اور زیادہ محفوظ سمجھتے تھے چنانچہ اسی ۳۷۹ق م میں ان کا ایک نیا اتحاد قائم ہوا اور اس میں جو ہتّر ریاستیں برابر کی حیثیت سے ایتھنز کی حلیف تھیں پہلے تجربے سے فائدہ اُٹھایا گیا تھا اور تمام ایسے پہلو، جو صدارت کو حکومت، بنا دیں نہایت احتیاط سے بچائے گئے تھے اسپارٹہ اُن دنوں اولن تھس کی لڑائیوں میں ایسا اُلجھا ہوا تھا کہ اسے مداخلت کی فرصت نہ مل سکی اور تھیبز بھی مذکورہ بالا انقلاب کے بعد اسپارٹہ کے شکنجے سے چھوٹ کر اسی اتحاد میں شریک ہو گیا۔

یاد رکھنا چاہیے کہ تھیبز کی یہ شرکت محض اسپارٹہ کے اندیشے اور عداوت پر مبنی تھی نہ کہ ایتھنز کی محبت پر۔ گویا ضرورت نے دو دشمنوں کو دوست بنا دیا تھا ورنہ اہل ایٹی کا اب تک تھیبز کے زرکسیز اور ایرانی حملہ آوروں کے ساتھ مل جانے کو نہ بھولے تھے اور ان کی منافرت کو بعد میں جنگ پیلوپنی سس نے اور بڑھا دیا تھا کہ اس میں بھی تھیبز نے ایتھنز کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ بایں ہمہ اس دستور کے مطابق کہ ملکی مصلحتیں ہمیشہ دھوپ چھاؤں کی طرح بدلتی رہتی ہیں، ان ریاستوں میں کچھ دن کے لئے اتفاق ہو گیا اور اُنھوں نے مل کر اہل اسپارٹہ کے پنجے سے کئی شہر بزور نکال لئے، اور

سنہ ۳۷۴ ق م تک تمام بوشیہ کا علاقہ اسپارٹہ کے تسلط سے آزاد ہو گیا؛ یہاں کی ریاستیں جس طرح امن نامہ بادشاہ سے پہلے تھیبز کے زیر اقتدار تھیں اب بھی اسی کے احاطۂ اتحاد میں آ گئیں اور چونکہ اس تمام جد و جہد میں زیادہ حصہ پرجوش جوانان تھیبز کا تھا پس ان دونوں وجہوں نے نہ صرف اس کی ملکی قوت بڑھائی بلکہ فن جنگ میں بھی اسے نامور کر دیا خصوصاً تھیبز کے سپہ سالار پیلوپی داس کی بعض فتوحات نے ثابت کر دیا کہ آخر لکرگس کی نصیحت پر عمل نہ کرنے کا اسپارٹہ کو خمیازہ بھگتنا پڑا اور اس نے خود ہی لڑائیاں لڑ لڑ کے حریفوں کو اپنے برابر جنگجو اور سپاہی پیشہ بنا دیا کہ اب وہ اس کی فوجوں کا برابری کے دعوے سے مقابلہ کرنے لگے بلکہ جیسا کہ آیندہ واقعات سے ظاہر ہو گا خود اس پر فوق لے گئے۔

مجلس مصالحت سنہ ۳۷۱ ق م

اگلے تین سال میں تھیبز کی قوت برابر بڑھتی اور مضبوط ہوتی رہی اور ایک طرف تو اسپارٹہ کو مجبوراً پھر ایرانیوں کو بیچ میں ڈالنا پڑا اور دوسری طرف اہل ایتھنز کا جوش اتحاد بھی کچھ سرد ہوتا چلا اور تھیبز کی جانب سے ان کی قدیم رقابتیں پھر نمایاں ہونے لگیں، خصوصاً جب پلاٹیہ اور تھس پیہ پر بھی تھیبز نے قبضہ حاصل کر لیا اور وہاں کے خانماں برباد اپنے دیرینہ حلیف یعنی اہل ایتھنز کے پاس فریاد لائے تو ان کی دردناک تقریروں نے اور بھی بُرا اثر ڈالا اور ایتھنز اپنے اتحادیوں سمیت اسپارٹہ سے مصالحت پر آمادہ ہو گیا، جس کے دوسرے معنی تھیبز کے ساتھ تعلق دوستانہ کا انقطاع تھا،

تاہم سنہ ۳۷۱ ق م میں جو جلسہ مصالحت اسپارٹہ میں منعقد ہوا اس میں تھیبز کو بھی دعوت دی گئی اور اس کی جانب سے سردار اپامنن داس بحیثیت وکیل شریک ہوا جس کی قسمت میں آیندہ اسپارٹہ کا سب سے قوی دشمن ہونا لکھا تھا۔

اس یادگار موقع پر ایتھنزی سفرا کی تحریک سے جو شرائط صلح طے پائیں ان میں یونانی ریاستوں کی خود مختاری کا اصول امن نامہ بادشاہ کی طرح تسلیم کیا گیا تھا لیکن اسی کے ساتھ ایک مفصل تقسیم کی تھی کہ فلاں فلاں ریاستیں اسپارٹہ کے زیر اقتدار مانی جائیں گی

اور فلاں کا صدر نشین ایتھنز ہو گا۔ اس مفاہمت میں تھیبز کے کسی خاص حق کا ذکر نہ تھا اور اسی لیے جب مذکورہ بالا شرائط پر عہد و پیماں کرنے کا وقت آیا تو اپامنن داس نے اصرار کیا کہ اسے تمام بیوشیہ کا نائب تسلیم کیا جائے کیونکہ اسپارٹہ کو اپنے اتحادیوں کی طرف سے عہد کرنے کا جو حق حاصل ہے وہی حق تھیبز کو بیوشیہ میں ہے۔ اس قول نے بڑا مباحثہ پیدا کیا اور اپنی تقریروں میں اپامنن داس نے نہایت دلیری سے اسپارٹہ کی غاصبانہ کارروائیوں پر اعتراض کئے۔ آخر اجی سی لوس شاہ اسپارٹہ غیض و غضب کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا اور اتمام حجت کے لیے اپنا غصہ دبا کر بولا "صاف صاف کہو بیوشیہ کے ہر شہر کی خود مختاری کو تم تسلیم کرتے ہو یا نہیں؟"

اپامنن داس نے جواب دیا "تم بھی لقونیہ کے ہر شہر کو خود مختار چھوڑتے ہو؟" اور انہی مختصر سوال و جواب پر بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ یعنی پھر کچھ کہے سُنے بغیر اجی سی لوس نے اشارہ کیا کہ تھیبز کا نام فہرست مصالحت سے کاٹ دیا جائے اور ساتھ ہی اعلان کر دیا گیا کہ وہ اس جدید اتحاد سے خارج ہے!

یہی وہ واقعہ ہے جس سے یونان کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اب تھیبز کا ایتھنز اور اس کے اتحادی ساتھ چھوڑ چکے ہیں، اور زبردست اسپارٹہ کے حق میں وہ تن تنہا صف آرا ہے اور ایسے طاقتور حریف سے بازی لے جانا ایک طرف بظاہر اُسے اپنی آزادی اور سلامتی کی بھی امید نہیں نظر آتی مگر اس عالم پریشانی میں ایک شخص ایسا بھی ہے جسے اسپارٹہ کی فوجی قوت کا مطلق خوف نہیں اور جو اپنی فتح پر کامل اعتماد رکھتا ہے۔ اپامنن داس!

اپامنن داس | اہل تاریخ کے نزدیک مادر یونان کے اُن نامی گرامی فرزندوں میں جو اپنی شجاعت و دانائی اور ایثار و حب وطن کے باعث ہمیشہ انسانی شرافتوں کا نمونہ سمجھے جائیں گے، تھیبز کے سپہ سالار اپامنن داس کو بھی درجہ امتیاز حاصل ہے۔ ہم اسے

اسپارٹہ کے جلسہ میں ایک وکیل کی شان سے پہلے دیکھ چکے ہیں لیکن آیندہ ہم اسے اپنے وطن کا ناخدا اور تھیبز کا اصلی حکمران پائیں گے۔

عالی خاندان پولمنس کا بیٹا، اپامنن داس جوانی میں فلسفہ فیثاغورث کا دلدادہ اور علم و حکمت کا سچا فدائی تھا۔ اس کے اخلاق میں ایسی دلاویزی کی شان تھی کہ بعض مورخوں نے اسے خود دار پیری کلیس پر ترجیح دی ہے۔ فصاحت و خطابت میں بھی وہ اس سے کم نہ تھا نہ تدبیر و دانائی میں۔ اس کے برعکس اپنی جنگی قابلیت اور سپاہیانہ جانبازی میں وہ مسلمہ طور پر پیری کلیس پر فوق رکھتا ہے اور اگر نتائج کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی معلوم ہوگا کہ وہ اسپارٹہ، جس کے مقابلے میں بڑا پیری کلیس نے ہمیشہ خطرناک سمجھا، اور جس نے ایتھنز کی پر شوکت و قوی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا، جب ضعیف تھیبز کے سامنے آیا تو محض اپامنن داس کی قابلیت کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ چلی بلکہ پے در پے شکستیں کھائیں اور آخر اپنی تمام عظمت و اقتدار کھو بیٹھا۔

اہل اسپارٹہ سے اپامنن داس کا پہلا بڑا معرکہ لیوک ترا کے میدانوں میں ہوا۔ یہ مقام بیوشیہ کے اندر شہر تھس پیہ کے قریب واقع تھا اور مذکورہ بالا مجلس مصالحت کے ختم ہوتے ہی اسپارٹی فوجیں یہاں مجتمع کر دی گئی تھیں کہ ریاست ہائے بیوشیہ کو توڑنے کے بعد خود سرکش تھیبز کو اُس کی گستاخی کا مزا چکھائیں۔ مگر اپامنن داس نے ان کے پہنچنے کا انتظار کئے بغیر بڑھ کر مقابلہ کیا اور اپنی فوجوں کو ایک نئی ترتیب دیکر پہلے ہی حملے میں غنیم کو کامل شکست دی۔ اہل اسپارٹہ کا اس لڑائی میں اتنا نقصان ہوا کہ تازہ کمک آجانے کے باوجود دوبارہ حریف کو ٹوکنے کی جرأت نہ کر سکے اور مایوس و مغموم اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

فتح لیوک ترا کے نتائج

اس ایک ہی خونریز لڑائی نے یونان کا نقشہ بدل دیا۔ اسپارٹہ اپنے تخت عظمت و جلال سے گویا یکایک نیچے گر پڑا اور اس کا جنگی رعب و وقار دیکھتے

دیکھتے ملک سے مٹ گیا؛ اس کے محکوم اتحادیوں نے اس سے بغاوت کی اور بہت سی ریاستیں اسپارٹہ کے گزشتہ مظالم کا بدلہ لینے کے لیے فتحمند تھیبز کی ساتھی ہوگئیں۔ اور وہاں اب خود پیلوپنی سس پر فوج کشی کے سامان کیے جانے لگے۔

اسپارٹہ پر حملے

جنگی فتوحات کی نسبت کہا گیا ہے کہ زمانۂ امن میں سالہا سال کی ترقیاں کسی قوم کو اتنی قوت نہیں بخشتیں جتنی کہ بعض اوقات ایک معرکہ جیتنے سے اُسے حاصل ہوجاتی ہے۔ اس ناقابل یقین قول کی ایک حیرت انگیز شہادت بھی تھیبز کی تاریخ میں ملتی ہے جس کی جنگ لیوک ترا کے ایک ہی سال بعد اس قدر قوت وہمت بڑھ گئی کہ اپامنن داس نے اسپارٹہ پر چڑھائی کی اور اُس کی فوجیں خاص شہر کے سامنے تک آپہنچیں؛ جب سے ڈوری گروہ اس علاقہ پر مسلط ہوا تھا اہل اسپارٹہ نے یہ ذلت کبھی نہ دیکھی تھی اور آج تک یہ پُرغرور بستی شہر پناہ اور مدافعانہ استحکامات کی ضرورت سے مستغنی رہی تھی کہ اس کے مقنن لکرگس کے الفاظ میں "محفوظ شہر تو وہ ہے جس کے گرد گوشت وخون کی زندہ فصیلیں کھڑی ہوں" لیکن سنہ ۳۷۰ ق م میں پہلی مرتبہ اُس کے گھروں کی آگ رات کو "دشمن" کے سپاہیوں نے دیکھی، اور اُسے خود اپنی سلامتی کے لیے لڑنا پڑا جس کا کبھی اُسے تجربہ نہ ہوا تھا۔ اپامنن داس کے اتنے قریب آجانے سے عورتوں اور بوڑھوں میں رونا پڑ گیا تھا اور اسپارٹہ کے بچنے کا کسی کو یقین نہ تھا مگر شاہ اجی سی لوس کی پامردی اور استقلال اپنے اقبال مند حریف سے کچھ گھٹا ہوا نہ تھا۔ اس نے بڑی دلاوری سے حملہ آوروں کے ہلّے روکے اور چند روز کی کشمکش کے بعد اپامنن داس کو تسخیر شہر سے ہاتھ اُٹھا لینا پڑا؛ تاہم اسپارٹہ کی سبکساری میں اب کچھ شک نہ رہا تھا۔ اس کا ورق سطوت چاک ہوچکا تھا اور اپنی مدافعت کے سوا اُسے اتنی بھی جرأت نہ تھی کہ اپامنن داس سے میدان میں نکل کر مقابلہ کرے یا علاقہ لقونیہ کو پامالی سے بچائے جسے حملہ آور شمال وجنوب، مشرق ومغرب، ہر طرف تاراج کرتے پھرتے تھے۔ مگر ان سب سے بڑھکر یہ زخم تھا کہ اپامنن داس مقدونیہ سے نکل کر مسینیہ

میں داخل ہوا اور اُس بدنصیب قوم کو آزادی دلائی جو تین سو برس سے اسپارٹہ کی محکومی میں ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ اس میں انسانی ہمدردی کے علاوہ بڑی حکمت یہ تھی کہ اہل مسینیہ کو اپنے غاصب حاکموں سے شدید نفرت تھی اور آزاد ہونے کے بعد وہی اسپارٹہ کے لیے گرگ بغل بن گئے تھے۔ کیونکہ اُنھیں اُسکی گزشتہ بدسلوکیاں ہمیشہ یاد آتی اور اشتعال دلاتی تھیں۔

تھیبز کا عارضی فروغ

اپامنن داس نے آرکیڈیا کی خانہ جنگیوں کا بھی سدباب کیا اور اس کی جنگجو ریاستوں کو باہم ملاکر ایک مضبوط اتحاد کی بنیاد ڈالی جو اسپارٹہ کو آئندہ اُبھرنے نہ دے۔ اور اس طرح سارے یونان کی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا، یعنی اسپارٹہ جس نے تین صدی تک کوس لمن الملکی بجایا تھا، اب پیلوپنی سس کی ایک معمولی ریاست رہ گیا اور اہل تھیبز جنھوں نے بیوشیہ کے باہر قدم نہ نکالا تھا بظاہر اس کے جانشین ہو گئے۔

لیکن نہ تو اپامنن داس کی یہ خواہش تھی اور نہ حالات اس کے مقتضی تھے کہ وہ اسپارٹہ یا ایتھنز کی طرح یونانی ریاستوں پر تھیبز کا حاکمانہ تسلط قائم کرتا۔ درحقیقت "شہری قومیت" اور "شہری سلطنت" نے جو ہمیشہ نسل یونانی کی حد بصر رہی ان میں یہ قابلیت نہ پیدا ہونے دی تھی کہ ایک وسیع قوم بن سکیں جو سیاسی اعتبار سے ایک ہی نظام حکومت اور یکساں آئین و قوانین کی پابند ہو۔ بے شبہ ان کے حکما اور مفکرین کی پرواز تصورات قیود و بلدی سے آزاد ہو چکی تھی لیکن عملاً تمام ہیلاس کو کبھی ایک مشترک دشمن کے مقابلے میں بھی متحد ہونا نصیب نہ ہوا۔ اور اگر ایتھنز یا پھر اس سے زیادہ اسپارٹہ کو یہ موقع بھی ملا کہ وہ متعدد ریاستوں کو ایک شیرازہ میں باندھیں، تو ان کی یہی کم نظری مانع ہو گئی اور ثابت ہو گیا کہ ایسے اتحاد میں مساوات و آزادی کا خون ہو جاتا ہے جسے شریف نسل یونانی کبھی گوارا نہ کرتی تھی۔

پس شاید اس امکان کا خیال کئے بغیر کہ اگر کسی بیرونی دشمن کا سامنا ہوا تو علیحدہ علیحدہ ہر ریاست کیونکر اپنا بچاؤ کر سکے گی، اپامنن داس کی آرزو صرف یہ تھی کہ یونانی ریاستوں کو اپنی اپنی جگہ آزاد و خود مختار کر دیا جائے اور اسپارٹہ کا جابرانہ تسلط ان پر سے اٹھ جائے! یہی یونانیوں کا نسلی رجحان تھا اور اسی نے اپامنن داس اور تھیبز کو ان کی نظر میں ایک قومی ہیرو اور ملکی محسن بنا دیا تھا! بدنصیبی سے جب ۳۶۲ ق م میں اپامنن داس اسپارٹہ کے ساتھ لڑائی لڑتا ہوا مان ٹینہ کے میدان میں مارا گیا تو اس کے منصوبۂ ذہنی کے نقص بہت جلد نمایاں ہو گئے۔ یعنی ہر شہر کی خود مختاری نے شان ملوک طوائف پیدا کر دی اور جگہ جگہ یونانی ریاستیں ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آنے لگیں۔ پھر اسی زمانے میں گویا فطرت نے ان کی بداعمالیوں کی سزا کے لئے غیر متوقع سمت سے ایک دشمن قوی کو تیار کر دیا جس کی جنگی طاقت اور عیاری نے ان کی کمزوری سے (اور سب سے بڑی کمزوری تو ان کا نفاق تھا) فائدہ اٹھایا اور آخر ان کی وہ متاع گراں مایہ، یعنی قومی آزادی، جسے وہ فروغ و وسعت نہ دے سکے تھے ان سے چھین لی گئی، اور یہ ہوا قدرت کے اس اٹل قانون کے مطابق، کہ جو شئے ترقی نہ کرے گی ضرور ہے کہ تنزل پائے!

باب نہم

یونانی آزادی کا خاتمہ

ریاست مقدونیہ

ہیلاس کے شمال میں مقدونیہ کی ریاست تھی، مغرب وجنوب میں کوہ پنڈس کی دو شاخیں، اُسے الیریہ اور تھسلی سے جدا کرتی ہیں لیکن اس کی شمالی اور مشرقی حدیں کبھی معین نہیں ہوئیں اگرچہ عام طور پر دریائے نیوس (موجودہ مستا) کو اس کی مشرقی حد مانا جاتا تھا؛ اس کی آبادی کے متعلق بھی ہمیشہ اختلاف رائے رہا اور مغرور یونانی اہل مقدونیہ کو آخر تک غیر یونانی اور وحشی قوم سمجھتے رہے اور اس میں کلام نہیں کہ زبان و معاشرت میں یہ پہاڑی جنگجو ہیلاس کے متمدن باشندوں سے نہایت مختلف تھے اور ان کے اوضاع و اطوار رسم و رواج سب میں، نمایاں فرق تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک مخلوط یا نیم یونانی نسل کے لوگ کہے جا سکتے ہیں اور تعلقات کے اعتبار سے بھی تاریخ یونان میں ان کا پانچویں صدی قبل مسیح سے پہلے کہیں نام سننے میں نہیں آتا، گو ان کے شاہی خاندان کی نسبت یہ روایت مشہور رہی کہ وہ شہر آرگس کے ایک شہزادے پردکاس کی اولاد میں تھا، اور غالباً اسی یقین کی بنا پر مقدونوی بادشاہوں کو اولمپی کھیلوں میں ایک یونانی کی حیثیت سے شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی۔

سیاسی اعتبار سے، مقدونیہ کے مطلق العنان بادشاہ دارائے اعظم کے وقت سے سلطنت ایران کے خراج گزار تھے اور جب زرکسیز نے یونان پر فوج کشی کی تو سکندر اول شاہ مقدونیہ، دوسرے حلقہ بگوش رؤسا کی مثل، اُس کے ہم رکاب تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کی واپسی کے بعد ہی یہ ریاست اُن کے اثر سے آزاد ہو گئی اور پھر الیریہ یا سیتھیہ کے قزاقوں کے سوائے اُسے کوئی بیرونی خطرہ نہ رہا۔ اسی پانچویں صدی کے آخری نصف میں، جب کہ یونانیوں کی آمد رفت بڑھی اور سیاحت و تجارت

کے ذرائع آسان ہوئے تو شاہان مقدونیہ سے بھی ان کے تعلقات وسیع ہوتے گئے اور جنگ پیلوپنی سس کے زمانہ میں کئی بار یونانی فوجیں ان کے علاقوں سے گزریں اور پردکاس ثانی کے بیٹے شاہ ارکی لوس نے بھی ان دوستانہ روابط کو اور مستحکم کیا یعنی بڑے بڑے یونانی مدبروں اور اہل کمال سے میل جول پیدا کیا اور مقدونیہ کے دربار میں رفتہ رفتہ یونانی اہل فن اور شعرا نظر آنے لگے۔

آرکی لوس نے ۳۹۹ ق م میں وفات پائی۔ وہ مقدونیہ کا سب سے پہلا مصلح اور محسن سمجھا جاتا ہے کہ اسی نے جابجا قلعے اور شہر تعمیر کیے سیدھے راستے بنائے اور اندرونی نظم و نسق کو بہت کچھ درست کیا، مقدونیہ کی نیم برہنہ رعایا تعلیم اور مدنیت سے اب تک بالکل ناآشنا تھی۔ آرکی لوس نے اس طرف بھی توجہ کی اور انھیں آدمیت کے ابتدائی سبق سکھائے اور غالباً اُسی نے سوار و پیادہ فوج کی تنظیم کی جو آگے چل کر دنیا کی بہترین سپاہ بن گئی۔

لیکن آرکی لوس کے بعد مقدونیہ کو سب سے بڑا خطرہ یونانی آبادکاروں کی جانب سے پیدا ہوا جو تھریس اور چالکی ڈیس کے ساحلوں پر بسے اور روز بروز اندرون ملک میں پھیلتے جاتے تھے خصوصاً جب شہر اولن تھس کو اقتدار حاصل ہوا تو مقدونیہ کے اکثر ساحلی علاقے ارکیلوس کے جانشین، شاہ امن تاس کے ہات سے نکل گئے۔ اسی پر امن تاس نے اسپارٹہ سے مدد کی درخواست کی تھی اور اُس نے ۳۷۹ ق م میں یہ شہر تسخیر کر لیا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مگر اُس وقت اسپارٹہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چالکی ڈیس کی یونانی ریاستوں کو ضعیف کرنا ایسا خطرناک ثابت ہوگا کہ یہی نیم وحشی اور حقیر اہل مقدونیہ قوت پاکر خود یونان کے فاتح اور مالک بن جائیں گے۔

فلپ ثانی (فیلقوس) شاہ امن تاس ثانی کے بعد اُس کے دو بیٹوں نے باری باری حکومت کی اور پھر تیسرا بیٹا فلپ ثانی بادشاہ ہوا جو ہماری مشرقی زبانوں میں فیلقوس کے

کے نام سے مشہور ہے۔ ۳۵۹ ق م میں ہیلاس کی آزادی کا وہ دشمن سخت ہے جس کی اولوالعزمی اور بلند خیالی کے لیے مقدونیہ ایک طرف سارے ملک یونان کا میدان تنگ تھا اور جو بہت دن پہلے سے دولت عجم کو تسخیر کرنے کے خواب دیکھتا تھا جس کی تعبیر اس کے زیادہ نامور اور زیادہ اقبال مند فرزند، سکندر اعظم کے عہد میں نکلی۔

فیلقوس ابھی لڑکا ہی تھا کہ تھیبز کے سپہ سالار پیلوپی داس نے اس کے بڑے بھائی شاہ سکندر ثانی سے قیام امن کی ضمانت چاہی اور فیلقوس بھی اسی یرغمال میں جو تھیبز بھیجی گئی شامل کر دیا گیا۔ اس طرح محض اتفاق سے اُسے یونانی تہذیب و تربیت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا اور اپامنن داس کی نئی فوجی ترتیب و قواعد سے واقفیت حاصل کر کے تین سال بعد اُس نے وطن کو مراجعت کی جہاں اُس کا منجھلا بھائی پرو کاس ثالث سریر آرائے حکومت ہو گیا تھا۔ فیلقوس اس زمانہ میں ایک ضلع کا حاکم بنا دیا گیا تھا اور سب سے پہلے اُس نے اسی ضلع میں ایک چھوٹی سی فوج اپامنن داس کے نئے نظام فوجی کے مطابق تیار کی تھی، ۳۵۹ ق م میں پرو کاس نے ایک شیر خوار بچہ چھوڑ کر وفات پائی تو اعیان سلطنت نے فیلقوس کو بادشاہ منتخب کیا جس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے شہر پیلا کو پایہ تخت بنایا جہاں سے حفاظت و اطمینان کے ساتھ وہ سال کی یونانی ریاستوں پر حملہ کر سکتا تھا۔

اس وقت یونان کی سیاسی حالت نہایت ابتر تھی اسپارٹہ کا طلسم اقتدار ٹوٹ چکا تھا اور سینیہ اور ارکیڈیا تک اب اس کے آزاد رقیب تھے، تھیبز کا عارضی تفوق اپامنن داس کے نام سے قائم تھا۔ اس کی وفات کے بعد ایک طرف ایتھنز اور دوسری طرف خود اُس کے بعض حلیف تھیبز سے برسر جنگ تھے۔ ادھر فوکیس اور تھسلی کے علاقہ اُس کے اثر سے آزاد ہو کر خانہ جنگیوں میں مشغول ہو گئے تھے۔ پس فیلقوس کو اپنی ابتدائی کشور کشائیوں میں کوئی بڑی مزاحمت پیش نہ آئی اور ۳۵۵ ق م تک اس نے چاکی ڈیس

(دریائے تیوس) تک مغربی تھریس پر قبضہ کرلیا۔ اسی علاقہ میں کوہ پن جیس کی طلائی معادن تھیں اور اس پر اپنا تسلط مضبوط کرنے کی غرض سے ہی فیلقوس نے یہاں اپنے نام پر شہر فلپّی آباد کیا تھا۔

دریائے اس ترے من کے دہانے کے نزدیک امفی پولس کا مضبوط اور باموقع شہر واقع تھا۔ یہ اہل ایتھنز کی قدیم نوآبادی تھی لیکن ناظرین کو یاد ہوگا کہ جنگ پیلوپنی سس کے پہلے معرکوں میں وہ ان کے قبضے سے نکل گئی تھی (دیکھو امن نامہ نکیاس ۴۲۱ ق م) اب فیلقوس نے اہل ایتھنز کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے کی غرض سے کچھ روز یہ شہر فتح نہ کیا لیکن جب ایتھنز اور اس کے اتحادیوں میں لڑائیاں شروع ہوئیں اور فیلقوس کو بھی اور مصروفیتوں سے مہلت ملی تو اُس نے امفی پولس پر قبضہ کرلیا اور کھل گیا کہ اس کے دوستانہ نامہ و پیام کی غرض محض ایتھنز کو دھوکے میں رکھنا تھا۔ اسی قسم کی عیاری فیلقوس نے اولن تھس سے کی تھی کہ چالکی ڈیس کو فتح کرتے وقت اُسے اپنا ساجھی بنالیا لیکن جیسا کہ آگے آئے گا اُس کا اصلی مدعا خود اولن تھس کی تسخیر تھی۔

یونان خاص میں مداخلت

انہی دنوں یونان میں وہ تباہ کن مذہبی جنگ چھڑی جس نے یونانی ریاستوں کی رہی سہی قوت کو مضمحل کردیا اور ساتھ ہی فیلقوس کو یونان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا موقع دیا۔ اس کو مذہبی جنگ اس لئے کہتے ہیں کہ جب تھیبز کی حاسدانہ دراندازی نے اہل فوکیس کو بہت پریشان کیا تو وہ شہر ڈیلفی پر قابض ہوگئے اور اس کے مندر میں جو کثیر زر و جواہر جمع تھا اس پر تصرف کرلیا۔ اس واقعے کو تھیبز اور لوکرس نے مذہب کی بہت بڑی توہین قرار دیکر فوکیس پر چڑھائی کی اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس میں ایتھنز اور تھسلی (بلکہ اسپارٹا بھی) فوکیس کی طرف تھے اور اسی طرح بہت سی ریاستیں تھیبز کے ساتھ تھیں۔ اس اثنا میں تھسلی کے اُمراء نے جو اپنی حکومت جابرہ کے ظلم و استبداد سے تنگ آگئے تھے۔ فیلقوس سے

امداد کی التجا کی جس نے تھسلی میں وہاں کے جابروں اور ان کے حلیفوں سے کئی لڑائیاں لڑیں اور بالآخر ۳۵۲ء ق م میں اس علاقے کو دشمن سے خالی کرا کے خود اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اسی ضمن میں وہ خود فوکیس یا کم سے کم درہ تھرموپلی پر بھی قابض ہو جانا چاہتا تھا لیکن وہاں ایتھنز کی ایک مضبوط جمعیت موجود دیکھکر اُس نے فی الوقت تھسلی پر اکتفا کی اور واپس مقدونیہ لوٹ گیا۔

ڈموس تھینز

یونانی ریاستوں میں اُس وقت ایتھنز کی حالت سب سے بہتر تھی اگرچہ پچھلی لڑائیوں میں بعض بڑی ریاستیں اس کے حلقہ اتحاد سے نکل گئی تھیں پھر بھی بہت سے شہر اس کے حلیف اور ساتھی تھے اور وہ اگر عزم و استقلال سے کوشش کرتا تو فیلقوس کی فاتحانہ دست درازیوں کو روک لینا محال نہ تھا، لیکن قوم ہو یا فرد، انسانی افعال و اعمال ہمیشہ اخلاق کے تابع ہوتے ہیں کیسا ہی جسیم شخص ہو یا بظاہر طاقتور اور صاحب ساز و سامان قوم، اگر ان میں سرفروشی اور دلیری کا مادہ نہیں ہے تو حقیر مقابل سے بھی جان چرائیں گے۔ یہی حال اہل ایتھنز کا ہو گیا تھا کہ جنگی وسائل و ذرائع میسر ہونے کے باوجود ان سے کام نہ لے سکتے تھے۔ اوگران میں بعض مدبر اور پرجوش خطیب اور بہی خواہ مصلحان ملک موجود تھے لیکن قومی ادبار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ساری قوم میں ایک شخص بھی قابل اور مخلص نہ باقی ہو۔ بلکہ یہ کہ ایسے وطن پرستوں کی صلاح پر قوم عمل نہ کرے۔

اسی قسم کے (ناکامیاب) مصلحانِ ملک میں ڈموس تھینز کا شمار ہے جو ایتھنز کے ایک دولت مند کارخانہ دار کا بیٹا تھا اور ۳۸۵ء ق م میں پیدا ہوا۔ اپنی جوانی لہو لعب میں برباد کرنے کے بعد وہ ملکی معاملات کی طرف متوجہ ہوا اور اس میدان میں اس کی فطری قابلیت اور خداداد ذہانت نے اسے بہت جلد اپنے ہمعصروں میں ممتاز کر دیا پھر جب فیلقوس نے دست ہوس یونانی شہروں پر بڑھانا شروع کیا تو اس کے

ارادوں کو سب سے پہلے تاڑنے والا اور سب سے بڑا مخالف ڈموس تھینز ہی تھا جس نے اہل ایتھنز کو اس نئے خطرے کا بروقت انسداد کرنے پر اُبھارا اور وہ معرکہ آرا تقریریں کیں جو فلپکس کے نام سے آج تک پرجوش خطابت کا نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔ ڈموس تھینز کو خطابت کی مشق و مہارت میں جو تکلیف اور محنتیں اُٹھانی پڑیں، وہ ضرب المثل ہو گئی ہیں۔ یہاں اُن کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں لیکن اس بارے میں یاد رکھنے کے لائق یہ بات ہے کہ ڈموس تھینز اپنی تقریریں ایسی احتیاط اور جگر کاوی سے تیار کرتا تھا کہ وہ مستقل تحریروں کی حیثیت رکھتی تھیں اور اب بھی عمدہ تصانیف کی طرح مطالعہ کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض تاریخی معلومات کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہیں اور زیادہ تر ان ہی سے ہمیں اہل ایتھنز کی معاشرت اور اخلاق کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں ان کی قوت عمل کیسی کمزور پڑ گئی تھی، اور وہ کس درجے آرام طلب اور عیش پسند ہو گئے تھے کہ ڈموس تھینز کی للکاریں، التجائیں، اور پند و نصیحت کسی شے کا اثر ان کے دلوں پر نہ ہوتا تھا، اور اگر اُنھوں نے دو تین مرتبہ فیلقوس کے خلاف صف آرائی کی تو یہ بھی بے دلی اور محض "آبنی" کی کوششیں تھیں اور یا ڈموس تھینز کی دیوانہ وار جد و جہد اور جادو بیانی کا ناپائیدار نتیجہ ورنہ درخت اخلاق میں جو گھن لگ گیا تھا وہ اندر ہی اندر قوم کی جڑیں کھائے جاتا تھا۔ ان کے شوق و مشاغل وہی تھے جو بگڑنے والی قوموں کے ہوا کرتے ہیں یعنی ان کے دولت مند اسی طرح میلے تماشوں اور سیر و شکار پر روپیہ صرف کر کے خوش ہوتے تھے اور جنگی ساز و سامان یا فوجی کاموں کے لیئے انھیں خرچ کرنا گراں گزرتا تھا اور ذاتی اور وقتی خوشیوں نے انھیں غافل اور مستقبل سے بے خبر کر دیا تھا۔ قوموں کا سب سے لاعلاج مرض یہ ہوتا ہے کہ اس کے افراد اپنی زندگی اور خوش حالی کے آگے قوم کی زندگی اور خوش حالی کی پروا نہیں کرتے انھیں اپنی جان ضرورت سے زیادہ عزیز ہو جاتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اب جس طرح

بنے انھیں جینا مقصود ہی خواہ اس میں کیسی ہی ذلتیں اور خرابیاں کیوں نہ پیش آئیں۔ یہ وہی درجہ ہی جہاں پہنچ کر انسان ایک با اصول زندگی سے دور جا پڑتا ہی اور انسانیت کے امتیاز کھو کر محض ایک حیوان، یا جاندار ناطق رہ جاتا ہی یعنی جانوروں کی طرح اس کا کوئی مقصد حیات نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود زندگی کی محبت اُن بکروں سے کم نہیں ہوتی جو ذبح ہوتے وقت بے تحاشا چیختے اور چلاتے ہیں۔ اس عالم میں انسان ہمیشہ نہایت ادنی لذائذ جسمانی کی تلاش کرتا ہی اور انھیں کو اپنا مشغلہ اور مطمح نظر بنا لینے کے سوا بظاہر اس کے لیے کوئی چارۂ کار بھی باقی نہیں رہتا۔

درحقیقت ایرانی حملہ کے بعد یونانی غیرت کی یہ دوسری آزمائش تھی کہ اہل ہلاس کا مقابلہ مقدونیہ سے آ کر پڑا اگرچہ ہم ان چند ہی نسلوں کے اندر اُن میں اور ان کے اجداد میں زمین و آسمان کا فرق دیکھتے ہیں۔ اور اگر یونانی آزادی کا کوئی سچا وکیل اور حامی اس وقت نظر آتا ہی تو وہ صرف ایک شخص، ڈموس تھینز ہی۔ یہ درست ہی کہ اس مرتبہ بھی مقابلہ ایک ہی مطلق العنان بادشاہ یعنی شخص واحد سے ہی۔ لیکن اس کے جنگی سامان اور وسائل کا توڑ کیا ہوگا؟ ایک حقیر پارۂ گوشت (زبان) سے تلواریں کیونکر کاٹی جائیں گی؟ اگرچہ ڈموس تھینز کا یہ فخر پھر بھی قائم رہتا ہی کہ اگر زبان و سیف کے اس عظیم معرکہ میں وہ غالب نہ آیا تو بذات خود مغلوب بھی نہ ہو سکا اور یہ واقعہ ہی کہ آخر تک اس کا حریف (فیلقوس) اس سے اندیشہ مند اور ترساں رہا۔

<u>تسخیر اولن تھس</u> لیکن ہم اپنے سلسلۂ بیان سے ہٹ گئے۔ ہمیں فیلقوس کی مکاری اور ظالمانہ ہوس کا اب ایک تازہ کرشمہ یعنی اولن تھس کی تسخیر دیکھنا ہی۔ یہ بارونق شہر اول اول فیلقوس کے دھوکے میں آ گیا اور بعض علاقے لے کر اُس کا دوست دار بن گیا تھا۔ پھر جب مقدونیہ ایک عفریت کی طرح بڑھتے بڑھتے خاص اُس کی ہمسایہ ریاستوں کو نگل گیا، تو پشیمان و مایوس ہو کر اولن تھس کو اپنی مدافعت کے لیے ہتھیار اُٹھانے

پڑے اور اُس نے ایتھنز سے بھی امداد کی درخواست کی مگر یہاں سے جو کمک بھیجی گئی اس میں زیادہ تر غلام اور غیر ملکی تنخواہ دار سپاہی تھے جن سے اطمینان کی بجائے کچھ رہا تو اندیشہ ہی رہا اور پھر اس سے قبل کہ دوسری فوج وہاں پہنچے، اولن تھس چند مہینے کی دلیرانہ جدوجہد اور محاصرے کے بعد تسخیر ہو چکا تھا۔

اس خبر نے کہ تسخیر شہر کے ساتھ ہی فیلقوس نے اولن تھس کو مسمار و تاراج کرا دیا اور اس کے باشندوں کو لونڈی غلام بنا کے بیچ ڈالا، تمام یونان میں ایک تہلکہ بپا کر دیا لیکن عالمِ انحطاط میں قوموں کا جوش بھی دیرپا نہیں ہوا کرتا۔ اور ڈموس تھنیز کے الفاظ میں " ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یونان کا ہر شہر اسی کو اپنی مہلت اور فائدہ سمجھتا ہے کہ فیلقوس اوروں کی تباہی میں مصروف رہے"، چنانچہ جب یونانی ریاستوں کو اس نے مقدونیہ کے خلاف متحد کرنے کی کوشش کی تو کوئی کامیابی نہ ہوئی اور فیلقوس کے روپئے اور تحائف نے جابجا اپنے طرف دار پیدا کر لیے۔ خود ایتھنز میں دو نامی خطیب اس کی مداحی اور وکالت میں سرگرم تھے اور فوکیون تک جو اس زمانہ کا بہترین سپہ سالار تھا مقدونیہ سے لڑنا خطرناک سمجھتا تھا۔ اس کی اپنے ہم وطنوں کو ہمیشہ یہ نصیحت ہوتی کہ "یا تو زبردستی جنگی قوت حاصل کرو اور یا جن کے پاس یہ شے ہے انھیں اپنا دوست بنائے رکھو" اس شخص کے آگے ڈموس تھینز کی بھی مشکل سے پیش جاتی تھی۔

تسخیر فوکیس اور اس کے نتائج ۳۵۵ ق م میں جو مذہبی جنگ چھڑی تھی اس کے شعلے ابھی تک یونان میں بھڑک رہے تھے۔ فیلقوس نے نہایت چالاکی سے ریاست فوکیس کے سوائے تمام لڑنے والوں کو ایک عام مصالحت پر آمادہ کر لیا اور پھر فوج لے کر فوکیس کے علاقے میں گھس گیا۔ مصالحت کے دھوکے نے اب کے ایتھنز کو بھی بے خبر کر دیا تھا اور درۂ تھرموپلی پر مزاحمت نہ ہوئی تو مقدونی فوجیں بلا دقت ساری ریاست پر پھیل گئیں۔ فیلقوس کا ڈیلفی پر قبضہ ہو گیا اور اہل تھیبز کو اپنی سقاکی میں حصہ دار بنا کر، جو

فوکیس کے جانی دشمن تھے، اُس نے یہ تمام علاقہ تاراج و پامال کرا دیا (۳۴۶ ق م) پھر اس عیار بادشاہ نے ڈیلفی کو اس کے قدیم منتظمین کے حوالے کرا دیا اور وہ مذہبی انجمن منعقد کی جو جنگ کی وجہ سے شکست و معطل ہو گئی تھی۔ اس انجمن کے جلسے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ آیندہ اہل فوکیس کو دیہات کے سوائے شہر بنا کے رہنے کی اجازت نہ دی جائے اور نیز پچھلے گناہ کی پاداش میں ڈیلفی کی مذہبی انجمن سے انھیں خارج کر دیا جائے۔ اور ان کے نائبین کو جو رائیں حاصل تھیں وہ فیلقوس کے نام منتقل کر دی جائیں۔ اس کے علاوہ "مذہبی جنگ کے خاطر خواہ ختم کرا دینے کے صلے میں" اُس کو نمایشوں کا میر مجلس مقرر کیا گیا اور اعلان ہو گیا کہ وہ اپالو دیوتا کا جاں نثار خادم اور دین کا محافظ و نگہبان ہے! (۳۴۶ ق م) فوکیس کی فتح کا یہ نتیجہ ہوا اور یونانیوں کی ذلت پسندی اس درجے کو پہنچی کہ غاصب فیلقوس کی مخالفت کرنے کے بجائے اُنھوں نے اُس کی اور ہمت افزائی کی اور گویا خود موقع دیا کہ آیندہ جب چاہے وہ اپالو دیوتا کے نام سے یونان کے معاملات میں دخل دے اور اپنی ستم گاری کا کوئی مذہبی حیلہ نکال لے۔

فیلقوس کی ریشہ دوانیاں اس یادگار حق کے حاصل کرنے اور بہ ظاہر مصالحت قائم ہونے کے بعد فیلقوس نے جزیرہ نمائے پیلوپنی سس میں اندر ہی اندر فساد کا بیج بویا اور ہوا خواہ بن کر ارکیڈیا، ارگس اور میسینیہ کو اسپارٹہ سے لڑنے پر اُبھار دیا کہ ان کی باہمی آویزشوں سے خود فائدہ اُٹھائے اور یہ کہنے کا بھی بہانہ مل جائے کہ شاہ مقدونیہ کمزوروں کا حامی ہے۔ یہ واقعہ کہ اسے ریشہ دوانیوں میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی اور عام طور پر لوگ اس سے بدظن ہو گئے ڈموس تھنیز کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ تھا جس کی دوسری اور تیسری فلپک (فیلقوسی یا فیلقوس کے خلاف) تقریریں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ بالخصوص آخر الذکر نے ایتھنز میں وہ آگ لگا دی تھی کہ انجام کار اہل ایتھنز اور اُن کے اتحادی مقدونیہ سے لڑنے پر کمربستہ ہو گئے جس کی فوجیں ان دنوں تھریس میں فتح کا پرچم اُڑاتی ہوئی بائی زنطیم کا محاصرہ کر رہی تھیں۔

اور اُس طرف جتنے قدیم ایتھنزی مقبوضات تھے ان کی سلامتی مخدوش ہوگئی تھی۔ اس حال میں جو مدد باقی زنطیم کو بھیجی گئی وہ نہایت کار آمد ثابت ہوئی۔ فیلقوس کو محاصرے سے ہاتھ اُٹھانا پڑا (۳۴۱ ق م) اور اُدھر ڈموس تھینز کا اپنے وطن میں بڑا نام ہوا کہ یہ سب کارروائی اسی کی بروقت تدبیر کا ثمرہ تھی۔ اس طرح حکومت میں اقتدار بڑھ جانے سے ڈموس تھینز کو اصلاحات کرنے کا بھی موقع مل گیا اور اسی کی تحریک سے فضول مصارف گھٹائے گئے جو تہواروں اور نمایشوں کے لیے سرکاری خزانہ سے دیئے جاتے تھے۔ مزید برآں اس نے دولت مندوں کو بھی کچھ زیادہ خرچ کرنے پر مجبور کیا اور اس تمام سرمایہ کو جنگی سازوسامان اور بحری قوت کے بڑھانے پر لگا دیا کہ اُس کے نزدیک قوم کی آزادی یعنی زندگی کا دارومدار ہی اب اُن تیاریوں پر تھا جو اُسے مقدونیہ سے قوت آزمائی کے قابل بنا دیں۔

جنگ کی تیاری اور اسباب واقعی ڈموس تھینز کی حیرت انگیز مساعی نے نہ صرف ایتھنز بلکہ یونان کی اکثر ریاستوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور ایتھنز کی صدارت میں جو اتحاد اسی زمانے میں قائم ہوا وہ یونانیوں کے قدیم جوش جنگ اور جذبہ وطنیت کو یاد دلاتا تھا، لیکن مکار فیلقوس ان سب تیاریوں سے واقف ہونے کے باوجود، لڑائی کی پہل خود کرنی نہ چاہتا تھا اور بہ احوال ظاہر ۳۴۶ ق م کے صلح نامہ کا پابند تھا۔ اُسے انہی دنوں اسیتھیہ کے علاقوں میں بھی بعض نقصان اُٹھانے پڑے تھے اور اس لیے اس کی مخفی کوششیں ابھی صرف رشوتوں کے ذریعہ دشمن میں اپنے طرف دار پیدا کرنے تک محدود تھیں مگر ۳۳۹ ق م میں ریاست امفی سا پر فوج کشی کرنے کا ایک شرعی حیلہ نکلا اور خود ڈیلفی کی انجمن مذہبی نے التجا کی کہ وہ آئے اور شریر اہل امفی سا کو جنھوں نے دیوتا کی زمینوں پر بجبر قبضہ کر لیا ہے، سزا دے، تو فیلقوس ایک زبردست لشکر لے کر بڑھا اور چند معمولی لڑائیوں کے بعد شہر مذکور پر قابض ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ظاہرا وایسی میں یکایک قصبہ الاٹیہ پر اُس نے قبضہ کر لیا اور جنگی استحکامات بنانے شروع کیے۔ یہ باموقع جگہ بیوشیہ کی

شمالی سرحد سے متصل تھی اور یہاں سے ریاست تھیبز بلکہ اٹیکا پر بھی بآسانی فوج کشی کی جا سکتی تھی۔

یہ خبر ایتھنز میں پہنچی تو وہاں کھلبلی پڑ گئی اور تھیبز سے قدیم عداوت کی بنا پر یہ خیال پھیل گیا کہ اہل تھیبز فیلقوس کے ساتھ مل گئے ہیں اور ان کا مقصود اٹیکا پر حملہ کرنا ہے۔ مگر ایسے پریشانی کے وقت میں ڈموس تھینیز نے ان کی بڑی ڈھارس بندھائی اور یقین دلایا کہ ہر چند اہل تھیبز، فوکیس کی لڑائی میں مقدونیہ کے شریک تھے لیکن اب اُنھیں خود اپنی زندگی کے لالے ہیں اور اگر وہ درحقیقت فیلقوس کے ساتھ ہو جاتے تو اُس کی فوجیں الاٹیہ کی بجائے بیوشیہ میں بلکہ خاص سرحد اٹیکا پر خیمہ زن ہوتیں۔ پھر ایک پُرجوش تقریر میں اُس نے اپنے ہم وطنوں کو اُبھارا کہ اس مشترک خطرہ کے وقت تمام اختلافات بالائے طاق رکھیں اور جہاں تک ہو تھیبز کے ساتھ مل کر اپنے قومی اور ملکی دشمن کا مقابلہ کریں۔ "اگر" اس نے کہا "اہل تھیبز ہماری دوستی کو قبول کریں اور ہماری تجاویز مدافعت میں ساتھ دیں تو اس سے بہتر کیا بات ہے کہ شان کے خلاف کوئی کام کیے بغیر ہم اپنے قدیم دشمنوں کو اپنا دوست بنا لیں گے۔ لیکن اگر اُنھوں نے ہماری تحریک مسترد کر دی تو پھر جو کچھ اُن پر مصیبت آئے اس کا الزام خود اُن پر ہوگا....."

جنگ شیرونیہ ۳۳۸ ق م

الغرض اس دانشمندانہ صلاح کے مطابق جب تھیبز سے اتحاد کی درخواست کی گئی اور وہاں کے لوگ بھی ڈموس تھینیز کی جادو بیانی سے مسخر ہو گئے تو اُن کی متحدہ فوجیں مقابلے کے لیے بیوشیہ سے نکلیں اور غالباً اُن کی تعداد بھی دشمن سے کچھ زیادہ تھی۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس فوج میں یونان کی متعدد ریاستوں کے آزاد شہری شامل تھے اور اسی لیے گو مقدونیہ کے جنگ آزمودہ سپاہیوں کے آگے (جنھیں اتحادیوں کے قواعد کے برعکس لڑائی میں بڑا فائدہ یہ تھا کہ شخص واحد کے زیر کمان لڑتے تھے) ان کی پیش نہ جا سکی، تاہم وہ کمال دلیری سے ہم نبرد ہوئے اور سوائے اس کے کیا کہا جائے،

کہ یونان کے نصیب ہی میں ذلت و محکومی لکھی تھی جو اس معرکہ میں فتح مقدونیہ کے حصے میں آئی۔

شیرونیہ جہاں یہ قیامت خیز اور فیصلہ کُن جنگ ہوئی، بیوشیہ کا سرحدی مقام تھا اور اتحادیوں کی شکست نے یقین دلا دیا تھا کہ اب تھیبز اور ایتھنز کی سلامتی محال ہے۔ مگر فیلقوس نے صرف قریی اور اوّل الذکر شہر کی تسخیر پر اکتفا کی اور بدقسمت تھیبز میں اہل اسپارٹہ کے بجائے اب پھر اہل مقدونیہ کا تسلط ہو گیا جن کی فوجیں قلعہ شہر میں متعین تھیں اور فیلقوس کے مقرّر کردہ حکام کی مدد کرتی تھیں کہ وہ اپنے ہم وطنوں پر جو چاہیں ظلم توڑیں اور جس طرح بنے اہل مقدونیہ کو خوش رکھیں۔

ایتھنز اور اسپارٹہ

شیرونیہ کی ہزیمت نے اہل ایتھنز کو نہایت شکستہ دل کر دیا تھا اور اُس غدار فریق کی بن آئی تھی جو پہلے سے لڑائی کے خلاف تھا اور مقدونیہ سے مل جانے کی صلاح دیا کرتا تھا۔ چنانچہ جب اسی فریق کی وساطت سے فیلقوس نے بظاہر نہایت معتدل شرائط صلح پیش کیں تو مجلس ملکی نے انھیں بے ردّ و قدح منظور کر لیا۔ اس جدید معاہدے کی رو سے ایتھنز کو اپنے دو ہزار اسیران جنگ بغیر فدیہ واپس مل گئے اور نیز قصبہ اوروپس پر جو سالہا سال سے تھیبز میں اور اُس میں متنازعہ فیہ تھا اُس کا قبضہ ہو گیا لیکن اس کے جواب میں انھیں جو کچھ عہد کرنا پڑا وہ درحقیقت ایک طرح فیلقوس کا طوق غلامی اپنے گلے میں ڈالنا تھا۔ کیونکہ اُس کی پہلی شرط یہ تھی کہ آیندہ وہ فیلقوس کو تمام یونان کا سردار مان لیں گے اور خود کوئی سیاسی اتحاد نہ قائم کریں گے نہ اس میں شریک ہوں گے۔ یہ گویا اُن تمام امیدوں اور منصوبوں سے دست برداری تھی جنھیں کائمن فارقلیس جیسے محبان وطن نے پرورش کیا تھا اور جو اہل ایتھنز کا قومی مایہ ناز سمجھے جاتے تھے۔ بے شبہ اس شرط سے اور فیلقوس کو یونان کا سردار مان لینے سے ان کی شہری خود مختاری میں کوئی فرق پڑتا نہ معلوم ہوتا تھا لیکن دراصل یہ ان کی اور سارے

یونان کے ذلیل و حقیر ہونے کی ابتدائی منزل تھی جس کا سنگ سرحد محکومی ہوتا ہے، کیونکہ وہ، جو شاہ شاہاں، یعنی دارائے عجم کی رسمی اطاعت پر موت کو ترجیح دیتے تھے، اب اس سے کم تر درجہ بادشاہ کے سامنے اپنا سر جھکاتے ہیں اور شخصی بادشاہوں کی خوشامد کرنی سیکھتے ہیں جو نہ صرف قومی آزادی اور خودداری کے لیے سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے بلکہ وہ خوفناک بلا ہے جس میں مبتلا ہو کر بنی انسان، اخلاق اور فضیلتوں کے تمام پاکیزہ اصول بھول جاتے ہیں اور ان کی ساری کوشش و قابلیت کا ماحصل محض ایک دوسرے انسان کی رضاجوئی رہ جاتا ہے اور اسی کی تلاش میں منہمک ہو کر وہ ظلم و انصاف، حق و باطل اور شرافت و دنائت کا امتیاز کھو بیٹھتے ہیں جو بداخلاقی کی معراج ہے۔

لیکن ایتھنز اور دیگر یونانی ریاستوں کے برعکس، اس عالم انحطاط میں ہمیں ایک قوم نظر آتی ہے کہ اپنی ضعیفی میں دلیر اور اپنی فلاکت میں بادشاہ ہے........ اسپارٹہ! کہ اپنا قدیم اقتدار اور حکومت کھو جانے کے باوجود غیر کے آگے پشت خم کرنا، اُسے گوارا نہ تھا اور جو مقدونیہ کی جنگی قوت سے مرعوب ہوا تھا نہ روپئے سے۔ اُس کی حقیر و مختصر آبادی اب بھی اسی اطمینان اور بشاشت سے ہتیار سج رہی تھی کہ اگر ضرورت ہو تو لیونی ڈس اور اس کے ہمراہیوں کی مثل ہر شہری آزادی اور قومی وقار کے لیے فنا ہو جائے مگر زندگی میں ایک "اجنبی"، کو اپنے اوپر حاکم نہ دیکھے! اور یہیں ہمیں ایتھنز اور اسپارٹہ، بلکہ ڈورین اور آئی اونین قوم کے فرق نظر آتے ہیں کہ اپنی جنگجوئی اور قدامت پرستی کے باوجود، ایثار و قربانی، حریت قومی اور خود مختاری کے جو سبق لکرگس نے انھیں پڑھائے تھے وہ بالارادہ یا بلاارادہ اہل اسپارٹہ کے رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے اور ذہنی ترقیوں میں وہ کتنے ہی پیچھے یا کیسے ہی غیر متمدن کیوں نہ ہوں اپنی آزادی پر خفیف سے خفیف بندش بھی ابھی تک ان کی فطرت کے خلاف تھی اور محکومی اور ہلاکت میں انھیں مطلق کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔

پس، جب شاہ فیلقوس نے پیلوپنی سس پر یلغار کی اور کورنتھ سے مسینہ اور ازالیس تا آرگس سارے جزیرہ نما نے اس کی سرداری تسلیم کرلی، تب بھی اسپارٹہ اس سے نہ دبا اور غالباً فیلقوس کو بھی ایسے سرفروشوں کے سامنے پڑنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے ارد گرد کا علاقہ ضرور تاراج کردیا اور لقونیہ کے دوسرے شہروں کو اپنی "حفاظت" میں لے لیا، لیکن شہر اسپارٹہ کے اندر کسی دشمن کا قدم نہ آسکا اور جب اگلے سال کورنتھ میں ایک بڑی مجلس منعقد ہوئی اور تمام یونانی ریاستوں نے اس میں بالاتفاق فیلقوس کو "یونان کا سپہ سالار" تسلیم کیا کہ وہ اب سارے ملک کی جانب سے ایران پر فوج کشی کرے تو اُس وقت بھی ایک ہی خودسر شہر تھا جو اس شرمناک اظہار اطاعت میں شریک نہ تھا — اسپارٹہ!

لیکن فیلقوس کا یہ ارمان کہ دولت ایران سے یونان اور مقدونیہ کی تسخیر کا انتقام لیا جائے، اس کی زندگی میں پورا نہ ہوسکا۔ "دس ہزار کی پسپائی" اور اجی سی لوس شاہ اسپارٹہ کے ایشیائی محاربات کے وقت سے بعض اہل یونان کو فتح عجم کے خواب نظر آنے لگے تھے اور فیلقوس کی بھی اب سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ یہ جلیل الشان کام اس کے ہاتوں انجام کو پہنچے اور اس کے لیے بڑے عظیم پیمانے پر اُس نے فوجی تیاریاں بھی شروع کردی تھیں کہ عین اپنے عروج کے زمانے میں وہ ایک مقدونی امیر کے ہاتوں مارا گیا اور سلطنت اس کے بیٹے سکندر کے ورثے میں آئی۔ (۳۳۶ قم)

"دنیائے یونان کی آزادی و خودمختاری مٹانے والا بھی" (گروٹ کے الفاظ میں) "چھیالیس سال کی عمر میں ہلاک ہوگیا"۔ اس کی نسبت ہماری معلومات بہت کچھ غیر مستند ہیں × × بایں ہمہ اس کی حکومت کے نتائج اور اس کے ذاتی اوصاف کے نمایاں خدوخال بلا کم وکاست ہمارے سامنے ہیں کہ اس کی تخت نشینی کے وقت سلطنت مقدونیہ پیلا کے ارد گرد ایک حقیر علاقے کا نام تھا اور سمندری ساحل سے بھی طاقتور یونانی

ریاستوں نے ایک حد تک اُسے بے دخل کر رکھا تھا، مگر فیلقوس کی وفات کے وقت ہم بحیرہ مارمورہ سے جنوبی یونان تک سارا ملک مقدونیہ کے زیر اثر دیکھتے ہیں × × × اس میں شک نہیں کہ تقدیر نے فیلقوس کی ترقیوں کا ساتھ دیا لیکن یہ ایک صاحب تدبیر کے لیے گویا سونے پر سہاگا تھا ورنہ درحقیقت فیلقوس جیسی بے چین اور جاہ طلب طبیعت، اتھک مستعدی اور جفا کشی اور پر حوصلہ دلیری کسی بادشاہ کو بھی کامیاب و بامراد بنا سکتی تھیں خواہ ذاتی اوصاف میں وہ فیلقوس سے کہیں کمتر ہوتا۔ یہ امر کہ فیلقوس کے اسباب فتوحات میں سے ایک سبب اس کا رشوتیں دے دے کر دشمنوں میں فساد اور ہمسایوں میں اپنے طرفدار پیدا کر لینا تھا اور نیز یہ کہ پسندیدہ اور دلاویز اخلاق رسمی کے ساتھ ہی اسے جھوٹے وعدے کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا تھا یا فائدے کی خاطر اور مطلب کے وقت اپنے حلیفوں کو بھی دھوکا دینے اور نہایت شرمناک دغابازی یا تعدی کرنے سے بھی وہ نہ چوکتا تھا —— یہ سب متحقق باتیں ہیں اور ان کا یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ یہ تحلیل کُن قوتیں اس کی کشور ستانیوں کی موید تھیں اور اس کی قابل تعریف فوج کا (جسے خود اس نے بنایا اور بالعموم خود ہی لڑاتا تھا) راستہ صاف کرتی چلتی تھیں۔ فوج کی ترتیب میں اس نے اپامنن داس کے طریقوں کی تقلید و توسیع کی تھی جو فن حرب کا بہترین نمونہ تھا۔ اور ملک گیری کا یہی وہ بنا بنایا انجن تھا جسے شروع اور مکمل کر کے وہ اپنے بیٹے کے نام ترکہ میں چھوڑ گیا تھا اور جو تاریخ حرب میں ایک یادگار چیز ہے۔ لیکن فیلقوس کی بہ حیثیت فاتح، غیر معمولی فراست و لیاقت جس قدر زیادہ سراہی جائے —— کہ اس کی بدولت اپنے پڑوسیوں سے چھین کر اتنا بڑا علاقہ اس نے دبا لیا —— اسی قدر یہ گنجائش کم رہ جاتی ہے کہ ہم اُسے نرمی اور اعتدال پسندی کی صفات سے متصف بتائیں جو بعض مصنفوں نے اس سے منسوب کر دی ہیں۔ اگر اُس کی زندگی کے بعض واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ فیلقوس میں یہ اوصاف تھے تو اس کے مقابلے میں ہمیں چالکی ڈیس کے بتیس یونانی شہروں کی تباہی اور صدہا بدبخت خاندانوں کو زبردستی ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھوا دینا۔

پیش کرنا پڑے گا۔

مگر فیلقوس محض ایک سیاسی شاطر اور فوجی سپہ سالار ہی نہ تھا۔ اُس نے یونانی علم و فن خطابت و انشا پردازی کی بھی عمدہ مہارت بہم پہنچائی تھی۔ ایسوکریتیس نے اُسے علم ادب اور فلسفے کا دوست' خطاب دیا ہے اور بیشک فیلقوس کا اپنے بیٹے سکندر کی تعلیم کے واسطے حکیم ارسطو کو منتخب کرنا ہی اس کی تائیدی شہادت ہے۔ بایں ہمہ سیراکیوز کے دیونی سیئس نامی دونوں جابروں کی یا دیگر مطلق العنان حاکموں کی مثل فیلقوس میں اس علمی ذوق کے ہم پہلو ہوسناکی اور بہیمیت کے مجرمانہ جذبات بھی موجود تھے۔ چنانچہ مورخ تھیوپمپس تک، جو فیلقوس کی حیرت انگیز قابلیتوں کا بڑا مداح ہے، اُس پر نہ صرف بدعہدی اور دغابازی کا الزام تسلیم کرتا ہے، بلکہ شراب خواری، قماربازی اور ہر قسم کی بے روک سیہ کاریوں کا بھی اُسے مجرم بتاتا ہے جس کی فیلقوس اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو بھی ترغیب دیتا رہتا تھا۔ اُس کی فوج خاصہ (باڈی گارڈ) کے آٹھ سو یونانی اور مقدونوی سپاہی، ایک ایسی جماعت تھی جس میں کسی شریف آدمی کا گزر نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اگر جنگی استعداد اور دلیری اُن کا مایۂ امتیاز تھے تو دوسری طرف غارت گری اور قزاقانہ مکر و فریب ان کی خصوصیت تھی۔ اور شہوت پرستی اور نہایت شرمناک حیوانی افعال ان میں ایسے ایسے تھے جو شیاطین اور ناپاک عفریتوں کے ہی لیے زیادہ موزوں ہو سکتے ہیں۔

فیلقوس کی بیویوں اور حرموں کا شمار قریب قریب ایشیائی بادشاہوں کے پیمانے پر تھا اور اسی کے باعث مقدونوی دربار میں اس کی مختلف بیویوں سے اولاد اور پھر اُن کے اعزا و رفقا میں جو معاندانہ ریشہ دوانیاں اور فساد ہوتے تھے وہ کچھ کم مخدوش اور کم شرمناک نہ تھے۔

لیکن فیلقوس کی قابلیتوں کا اعتراف کرتے وقت ہمیں ان کی قابلیت کا اندازہ لگانا بھی ضرور ہے جو اس کے مدمقابل تھے۔ اس کی خوش قسمتی اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی تھی کہ

اس کا خروج یونانیوں کی خانہ جنگی اور پستی کے زمانے میں ہوا جب کہ نہ تو کوئی سربرآوردہ ریاست ملکی استحکام پر مستعد تھی نہ کوئی ممتاز سپہ سالار تھا کہ فوجوں کو عمدہ طریقے سے لڑاتا اور نہ ایسے محب وطن سپاہی باقی رہے تھے جو استقلال کے ساتھ جنگ کی مشقتیں اٹھاتے اور جان دینے پر خوشی سے آمادہ ہو جاتے۔ فیلقوس کا کوئی حریف اپامنن داس یا اجی سی لوس جیسا نہ تھا × × × اور گو ڈیموس تھنیز نے جہاں تک لوگوں کو ابھارنے اور مشورہ دینے کا تعلق ہی، مقابلے کا حق ادا کر دیا مگر میدان جنگ میں اُسے کوئی امتیاز حاصل نہ تھا اور اور نہ کسی دوسرے کی مدد سے وہ یہ نقص دور کر سکتا تھا۔ پس لڑائیوں میں فیلقوس کا مقابلہ ہر جگہ ایسی "ناقابلیت" سے ہوا جس کی اسکائی نیس نے بھی شکایت کی ہے۔ اور اس طرح اس کی بے نظیر کامیابیوں کے اسباب میں جہاں خود اس کے ممتاز اوصاف شامل ہیں وہیں یونانیوں کا یہ زوال قوت بھی شمار کر لینا چاہیے۔ ان ہی اوصاف اور قابلیتوں کے کرشمے ہم اس کے فرزند سکندر کے عہد حکومت میں زیادہ وسیع پیمانے پر مشاہدہ کریں گے بحالیکہ یونان کی "سیاسیات"، جو کسی زمانے میں ایسی ولولہ انگیز شئی تھی (ایک ضعیف تلاطم کے بجز) رفتہ رفتہ پست اور پھر آخر کار صفر رہ جائیں گی کہ خود یونان اب محض ایک محکوم صوبہ بن گیا تھا"۔

(۲)

سکندر اعظم دنیا کے بڑے بڑے فاتح بادشاہوں اور نامی سپہ سالاروں میں جو عزت اور امتیاز فیلقوس کے جانشین سکندر اعظم کو حاصل ہے وہ اور کسی کو نصیب نہیں، اور اس کی یہ خصوصیت کچھ بلا وجہ نہیں ہے بلکہ اس غیر معمولی ناموری کے بعض قوی اسباب ہیں جن میں پہلا سبب فاتح کی کم سنی سمجھنا چاہیے کہ تخت نشینی (۳۳۶ ق م) کے وقت اس کی عمر پورے بیس سال کی بھی نہ تھی۔ اور جب سلطنت ایران کو اس نے فتح کیا تو وہ صرف ۲۶ سال کا ایک نوجوان بادشاہ تھا۔ ۳۰ برس کی عمر میں یونان و مقدونیہ کے علاوہ، مصر، شام، اور ایشیای کوچک سے سندھ و باختر تک قدیم دنیا کا سب سے

معروف و آباد حصہ اعظم اس کے زیرنگیں آچکا تھا۔ یہ عام خیال کہ اُسے تمام دنیا کو فتح کرنے کی آرزو تھی، کسی معتبر تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا لیکن سکندر کی عظمت اور بلند ہمتی کو ایسے مبالغوں کی ضرورت نہیں اور درحقیقت اس لاکھوں مربع میل کے رقبے کو ایک متحد اور منتظم واحد سلطنت بنانے کے جو منصوبے اس نے باندھے تھے وہی اس کی غیر معمولی وسعت نگاہ اور عالی حوصلگی کے بہترین گواہ ہیں۔

بہرحال سکندر کی شہرت کی عام وجہ، محض اس کی جنگی فتوحات ہیں۔ انہی مسلسل اور حیرت انگیز کامیابیوں نے اُسے اپنے اکثر اوہام پرست معاصرین کی نظر میں فوق الانسان قوتوں سے متصف ٹھہرا دیا تھا اور اسی بنا پر اُس کی خرق عادت پیدائش اور کارناموں کی نسبت طرح طرح کے افسانے گھڑ لیے گئے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ نوجوان سکندر کا مقابلہ جن ممالک سے ہوا وہ تنزل اور کمزوریوں کے باوجود دنیائے قدیم کی سب سے ممتاز سلطنتیں تھیں۔ یعنی اگر ایک طرف یونانی قوم اپنے تمدن اور عقلی و ذہنی ترقیوں کے اعتبار سے "معلم الاقوام" کے موزوں لقب سے ملقب کی جا سکتی تھی تو دوسری جانب علاقے کی وسعت، دولت کی فراوانی اور شوکت و دبدبہ کے لحاظ سے دارائے ایران بھی اپنا مثیل نہ رکھتا تھا۔ ان کے علاوہ اگر ملک کہستان و زابل اور سمرقند و بخارا کے بدوی قبائل کو ہم وحشیانہ جنگجوئی کا سب سے عیب نمونہ قرار دیں، تو گویا تہذیب کا ہر درجہ اور قدیم فن حرب کی ہر قسم ہمارے سامنے آجاتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ ایک فتح مند سپہ سالار کے سامنے جو جو مختلف دقتیں پیش آسکتی ہیں وہ سب باری باری سکندر کو پیش آئیں اور اس نوجوان فاتح نے ان سب کو مغلوب کیا۔

لیکن سب سے اہم اور یاد رکھنے کے قابل سبب ناموری یہ معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کے پاس ان فاتحانہ کشورکشائیوں میں جو فوج تھی اس کی تعداد (ایران کی فتح تک) ۳۰ ہزار پیادہ اور سات ہزار سوار سے زیادہ نہ تھی۔ اور بے شبہ یہی وہ عظیم فرق ہے

جو اُسے دنیا کے اور فاتحین پر فوقیت دلاتا ہے اور فن حرب و رسپہ سالاری میں اُسے پنولین کے سوا سب سے ممتاز ثابت کرتا ہے کیونکہ یورپ ایشیائے جتنے نامی فاتح گزرے ہیں، چنگیز ہو یا اٹی لا سب کی یلغاریں اور ملک گیریاں ٹڈی دل لشکروں کے ساتھ ہوتی تھیں اور وہ محض کثرت فوج سے حریف کو مغلوب و پامال کر دیتے تھے؛ حالانکہ سکندر نے جتنی بڑی لڑائیاں لڑیں اُن سب میں فریق مقابل کی سپاہ اس کی فوج سے دو چند و سہ چند بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔

عہد حکومت کا آغاز | لیکن اب ہمیں اپنی تاریخ کے سلسلۂ واقعات کی طرف لوٹنا چاہیے کہ فیلقوس کے مرتے ہی مقدونیہ کے شمال و جنوب میں تازہ شورش کی ہوا چلنے لگی تھی اور سکندر کو اگر ایک طرف تھریس و الیریہ کے وحشی ترکتازوں کا سدباب کرنا تھا تو دوسری طرف وہ اقتدار بھی معرض خطر میں نظر آتا تھا جو اُس کے باپ نے ایسی محنت اور جدجہد سے یونانی ریاستوں پر حاصل کیا تھا؛ حریت کی چنگاریاں یونانی قوم میں ابھی تک باقی تھیں اور فیلقوس کے مرتے ہی بعض شہروں میں متعدد وطن پرست اُٹھ کھڑے ہوئے تھے جو لوگوں کو مقدونیہ کے مظالم اور وحشیانہ پن کی یاد دلا دلا کر شرما رہے تھے کہ وہ اس موقع پر اپنی آزادی کو بزور حاصل کر لیں خاص کر ایتھنز میں فیلقوس کے مرنے کی بڑی خوشیاں منائی گئیں تھیں اور ڈموس تھینز مقدونیہ کے "شیر خوار"، بادشاہ کی طرح طرح سے تحقیر و تضحیک کر رہا تھا اور اندر ہی اندر ایرانی عُمّال کی مدد سے مختلف ریاستوں میں روپیہ تقسیم کرا رہا تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر مقدونیہ کی نیم وحشی سلطنت سے مقابلے پر کمربستہ ہو جائیں؛

ان ریشہ دوانیوں کی خبریں جب مقدونیہ کے پایہ تخت پیلا میں پہنچیں تو دربار کے اکثر سن رسیدہ عمائد نے، جو فیلقوس کی داؤں گھات اور عیارانہ احتیاط دیکھے ہوئے تھے، سکندر کو صلاح دی کہ وہ پہلے شمال کے بدوی ہمسایوں کی خبر لے اور یونان کو ابھی اس کے حال پر چھوڑ دے۔ لیکن یہ نوجوان شہزادہ، جسے حکیم ارسطو سے حکمت و دانائی

اور اپنے باپ سے جنگجوئی اور ملک گیری کی تربیت ورثہ میں ملی تھی کسی خوف و اندیشہ کو خاطر میں نہ لایا اور نہایت سرعت سے اوّل یونان میں داخل ہو کر اُس نے اُس عہدنامہ کی ڈیلفی کی انجمن سے تجدید کرائی جس کی رو سے (۳۴۶ء میں) فیلقوس کو دین کا محافظ اور یونان کا سپہ سالار تسلیم کیا گیا تھا۔ پھر کورنتھ میں ایک اور بڑی مجلس منعقد کی جس میں اسپارٹہ کے بجز تمام یونانی ریاستوں کے وکلا جمع ہوئے اور اُس میں بالاتفاق سکندر کو فیلقوس کی مثل، یونان کا سپہ سالار قرار دے کر ایران سے جنگ کرنے کا (رسماً) اختیار دیا گیا۔ اس طرح قبل اس کے کہ اہل شورش کی تیاریاں مکمل ہوں سکندر کی آمد نے سب یونانیوں کو خوفزدہ کر دیا اور تخت نشینی کے پہلے ہی سال میں اس کا تمام یونان پر بے لڑے بھڑے وہی اقتدار جم گیا جو اس کے باپ نے اتنی خوں ریزیوں کے بعد پایا تھا۔

شمال میں لڑائیاں اور تھیبز کی بغاوت

اب سکندر نے اگلے موسم بہار میں ایشیا پر فوج کشی کے ارادے سے جنگی تیاریاں شروع کیں لیکن انہی دنوں تھریس کی بعض وحشی اقوام دریائے ڈینیوب اُتر کر جنوب کی طرف بڑھ رہی تھیں اور یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ مقدونوی افواج کے ایشیا میں چلے جانے کے بعد ممکن ہے کہ یہ شمالی ہمسائے خود مقدونیہ میں گھس آئیں۔ نظر برایں سکندر نے پہلے تھریس پر حملہ کیا اور خوں ریز لڑائیوں کے بعد دریا کا سارا جنوبی کنارہ (بحیرہ اسود) تک دشمن سے پاک کر دیا۔ پھر اسی سلسلے میں دریا دریا بڑھ کر اس نے مغرب میں اہل الیریہ پر چڑھائی کی اور نہایت سخت و صعب پہاڑی علاقوں میں اپنی سپہ سالاری کے جوہر دکھائے۔ کئی مرتبہ دشمنوں میں گھرا گھر کر نکلا اور لڑ کر فتحیاب ہوا۔ لیکن وہ ابھی تک پورا تسلط ان علاقوں پر جمانے نہ پایا تھا کہ شہر تھیبز میں بغاوت ہو جانے کی اطلاع پہنچی اور معلوم ہوا کہ بدخواہوں نے اُس کا مارا جانا مشہور کر دیا ہے۔ شہر سرکشوں کے قبضے میں ہے اور مقدونوی دستہ قلعے میں محصور ہے۔

یہ خبر سُن کر سکندر نے الیریا کی مہم سے ہات اُٹھایا اور طوفانی ہواؤں کی طرح دشوار گذار

سنگستانی راستے قطع کرتا ہوا تھسلی اور پھر کل تیرہ دن میں بیوشیہ آپہنچا اور اس امید میں آہستہ آہستہ تھیبز کی جانب بڑھا کہ شاید یہ طغیان و سرکشی اس کے زندہ و سلامت آنے کی خبر سُن کر فرو ہو جائے۔ اسمیں شک نہیں کہ شہر میں اس کے بعض طرف دار موجود تھے لیکن اُن کے (شعلہ خو) سرگروہ جانتے تھے کہ صلح کی صورت میں بھی سکندر کا سارا غضب اُن کی جانوں پر ہوگا اور خود وہ کسی طرح نہ بچ سکیں گے۔ لہذا ایسی تمام کوششوں کی اُنھوں نے مخالفت کی اور جب سکندر نے بطریق آشتی اعلان کیا کہ جو شخص ہتیار رکھ دے گا اُسے بادشاہ مقدونیہ پوری معافی دے دے گا تو جواب میں اُنھوں نے حکم دیا کہ بُرجوں کی چھت پر سے کھڑے ہو کر پکار دیا جائے کہ جو فرزند یونان چاہے استحصال آزادی کی جنگ میں ان کا شریک اور مقدونیہ کے نیم وحشی جابر سے نبرد آزما ہونے تھیبز چلا آئے!

لیکن مقدونیہ کی جفاکش اور باقاعدہ فوجوں سے ان شہری احرار کی جنگ، ایک مایوسانہ جدوجہد تھی جس کا خاتمہ اُن کی کامل ہزیمت پر ہوا اور چند ہی روز میں تھیبز، قلعے کے مقدونوی محصورین اور شہر کے محاصرین کے زبردست حملوں کی تاب نہ لا کر مسخر ہو گیا۔ پھر فتحمند سپاہ لڑائی کے جوش میں، جس بہیمیت اور وحشیانہ سفاکی سے بدنصیب مفتوحوں کے ساتھ پیش آئی وہ اُس ظالمانہ سزا کے مقابلے میں غالباً بے حقیقت ہی جو فتح کے بعد سکندر اور اُس کے یونانی خوشامدیوں نے تجویز کی تھی. یعنی فیصلہ کیا گیا کہ قلعے کے سوائے جہاں مقدونوی فوج متعین رہے گی، شہر تھیبز کو بالکل تاراج و منہدم کر دیا جائے اس کی آبادی لونڈی غلام بنا کے بیچ دی جائے اور آیندہ کسی کو یہاں بسنے اور مکان بنانے کی اجازت نہ ہو! اس بے دردانہ فیصلے سے مندر اور بعض خانقاہیں اور غالباً قدیم شاعر پنڈار کا گھر مستثنیٰ کر دیا گیا تھا اور چند وہ شہری بھی محفوظ تھے جنھیں سکندر اپنا طرف دار سمجھتا تھا، ورنہ باقی ساری آبادی پامال اور فنا کر دی گئی تھی اور بعد کی کوششوں کے باوجود بھی شہر تھیبز کو کبھی رونق اور سرسبزی حاصل نہ ہو سکی اور اب بھی سوائے قلعے کے جو سکندری انتقام اور مقدونوی بہیمیت سے مصلحتاً بچا لیا

گیا تھا، قدیم شہر کی کوئی یادگار باقی نہیں ہے۔

سکندر کی ایشیائی فتوحات | اس واقعے کے بعد زندگی بھر سکندر کو بذات خود یونان سے کوئی لڑائی نہ لڑنی پڑی۔ اور تھیبز پر اس کی تعدیاں خواہ کتنی ہی قابل نفریں کیوں نہ ہوں، ان کا خوف تمام یونان پر اس درجہ ضرور چھا گیا کہ پھر کسی کو عرصہ دراز تک مقدونیہ کا مقابلہ کرنے کی جرائت نہ ہوئی۔

بہر حال اب ہمیں سکندر کی ایشیای فتوحات پر توجہ کرنی چاہیے۔ اس کے یہ کارنامے درحقیقت سلطنت مقدونیہ کی تاریخ یا خود اُس کی سوانح عمری میں مفصل بیان کرنے کے لائق ہیں اور ان کا یونانی تاریخ سے براہ راست کچھ تعلق نہیں ہے۔ پھر بھی ایک عام دستور جو پڑ گیا ہے اُس کی پابندی اور تسلسل واقعات کے لحاظ سے مناسب ہے کہ ہم مختصر طور پر چند صفحوں میں اس نامور فاتح کے بڑے بڑے کارنامے، نتایج فتوحات اور خصایص وعادات کا حال تحریر کریں:۔

۳۳۴ ق م میں جب سکندر نے آبنائے درد انیال کو عبور کیا، سلطنت ایران کا دارائے ثالث بادشاہ تھا۔ یونانی روایت کے بموجب یہ شخص وراثتاً تخت کا حقدار نہ تھا بلکہ دربار کی سازشوں نے اصلی وارثوں کو ہٹا کر اُسے دیہیم خسروی پر متمکن کرادیا تھا تاریخ عالم کے اتنے بڑے انقلاب کا مغلوب ہیرو ہونے کے اعتبار سے اس کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں اُن میں تاسف وہمدردی کی وجہ سے مورخوں نے غالباً بہت کچھ مبالغہ کیا ہے اور شاید سکندر نامے کے سوائے جتنی کہانیوں اور افسانوں میں قدیم کیانی سلطنت کے حیرت ناک خاتمے کا بیان ہے سب میں اُس کے مظلوم اور آخری تاج دار کا خیر کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے؛ لیکن تاریخ واقعات کے بے کم وکاست کہہ دینے میں جلاد کے تیغ سے زیادہ بے مہر ہے کہ جسے ظالم ومظلوم کسی کا سر کاٹنے میں تامل نہیں ہوتا۔ اور اس کی شہادت یہ ہے کہ دارائے ثالث ایک بگڑی ہوئی قوم کا بگڑا ہوا بادشاہ تھا! بُزدل،

خود غرض، تن پرور، جابر، نالائق، کم عقل! اور تقدیر نے اس کو مقابل ایسے شخص کا بنایا جو سپہ گری کی قابلیت میں دنیا کا عدیم النظیر بادشاہ گزرا ہے۔ ایسے مقابلے کا نتیجہ ظاہر ہے۔

گرانی کس سکندر کی پہلی لڑائی ایرانی صوبے داروں سے گرانی کس ندی کے کنارے ہوئی۔ یہ چھوٹی سی ندی دردانیال کے ایشیائی ساحل سے تیس۳۰ چالیس۴۰ میل مشرق میں بہتی اور بحر مارمورا میں آ گرتی ہے آج کل اسے ترکی قصبے بیغا کے نام پر بیغا چای یعنی بیغا ندی کہتے ہیں۔ سکندر نے اپنی پہلی ایشیائی فتح اسی حوالی میں حاصل کی اور ہر چند ایرانیوں کے تنخواہ دار غیر ملکی سپاہی بڑی جانبازی سے لڑے اور مقدونوی فوج کو سخت دقتیں پیش آئیں، تاہم نتائج کے اعتبار سے یہ فتح ایسی زبردست تھی کہ پھر ایشیائے کوچک میں سکندر کا سامنا کرنے والا کوئی نہ رہا اور سارڈس پر قبضہ کرتے ہی وہ ساری لڈیہ اور فرغیہ کا مالک ہو گیا۔

ایسوس سکندر کی دوسری جنگ عظیم ایک سال بعد ۳۳۳ ق م میں ایسوس کے مقام پر ہوئی جہاں دارا بہ نفس نفیس ایرانیوں کے لشکر کثیر کو لڑانے لایا تھا۔ یہ جگہ ایشیائے کوچک اور شام کی فاصل حدوں کے قریب ٹھیک اس موڑ پر واقع ہے جہاں ایشیائی ساحل (خلیج سکندروں کی) قوس بنا کر جنوب کو مڑ جاتا ہے۔ یہیں دارا کو مقدونوی فوج کے آنے کی اطلاع ملی اور ہر چند ایرانیوں کے کثیر لشکر کے لیے یہ پہاڑی اونچا نیچا میدان بہت تنگ اور نامناسب تھا، پھر بھی دارا نے یہیں صف جنگ آراستہ کی اور وہ مشہور جنگ ایسوس واقع ہوئی جو ایک مورخ کے لفظوں میں "ضرور قیامت خیز ہوتی" لیکن جس کا دارا کی بزدلی نے تھوڑی ہی دیر میں فیصلہ کر دیا یعنی مقابلہ شروع ہوتے ہی اپنا میسرہ دبتے دیکھ کر اس ایرانی شہنشاہ کو جان بچا کر بھاگنے کی پڑ گئی۔ حالانکہ اس کی فوج کا بڑا حصہ دلیری سے قدم جمائے لڑ رہا تھا۔ لیکن جونہی بادشاہ کے غائب ہونے کی خبر پھیلی سب کے دل چھوٹ گئے اور پیٹھ دکھا کے بھاگے اور اہل مقدونیہ کو بھاگتوں کا پیچھا کرنے اور مارنے کے سوا کوئی کام باقی نہ رہا

شام ومصر کی فتح اس لڑائی کے بعد جس میں دارا کی بیوی بچے اور کثیر مال غنیمت اہل مقدونیہ کے ہاتھ لگا، سکندر نے شام اور خصوصاً فنیقیہ (کنعان) کی طرف توجہ کی کہ ان کا زبردست بیڑا

اس کے مغربی مقبوضات کو خطرے میں ڈال رہا تھا اور یوں بھی یہ دونوں، ایران کے نہایت طاقتور اور زرخیز صوبے تھے جن کو تسخیر کیے بغیر سکندر کا آگے بڑھنا احتیاط کے خلاف تھا۔ ان علاقوں کی فتح میں زیادہ دقت پیش نہ آئی لیکن شہر صور (ٹائر) نے، جس کی عظمت و قدامت پر صحائف آسمانی تک گواہ ہیں، اہل مقدونیہ کا بڑی شجاعت سے مقابلہ کیا اور سات مہینے کے محاصرے بعد جس سے سکندری فوجیں گھبرا اُٹھی تھیں، اطاعت قبول کی (۳۳۲ ق م)

اسی طرح شہر گازا (غزہ) کے حاکم باتیس نے جس کی نسبت مشہور ہے کہ خواجہ سرا تھا قلعہ بند ہو کر کمال جانبازی سے مقابلہ کیا اور جب حملہ آور شہر میں گھس آئے تب بھی اس کے عرب سپاہیوں اور اہل شہر نے اطاعت قبول نہ کی بلکہ سب کے سب لڑ کے مارے گئے یا زخمی ہوئے یا بحالت مجبوری میں گرفتار ہو گئے۔ باتیس بھی انہی چند اسیران جنگ میں تھا اور جب اس دلاور سپہ سالار نے سکندر کے آگے اب بھی سر خم نہ کیا تو مقدونوی بادشاہ نے، جس کی عادتوں کو کرٹئس کے بقول "خوش قسمتی نے ابھی سے بگاڑ دیا تھا"، اُسے بڑی عقوبتوں سے مروا دیا اور شہر کی عورتیں اور بچے لونڈی غلام بنا لیے گئے۔

یہ آخری مزاحمت تھی جس کے بعد مصر کا راستہ صاف ہو گیا اور اہل مصر کو جو شدید نفرت ایرانی حکومت سے ان کے مذہبی تشدد کی بنا پر تھی، اُس نے تہذیب قدیم کے اس گہوارے کو بلا دقت سکندر کی ملک بنا دیا۔ یہاں اُس نے ساحلی شہر اسکندریہ کی بنیاد ڈالی اور پھر شوکت نمائی یا اظہار عقیدت کے لیے امن دیوتا کے اُس مندر تک گیا جو صحرائے لیبیا کی ریگستانی حدود میں واقع تھا اور جہاں تک سفر کرنا نہایت دشوار اور خطرناک سمجھا جاتا تھا۔

جنگ اربیلا اور فتح ایران اس کام سے فارغ ہو کر سکندر نے پھر ایران کا رُخ کیا۔ دارا پہلی لڑائیوں سے کافی مرعوب ہو چکا تھا اور کہا جاتا ہے کہ دریائے فرات کے مغربی کنارے تک سارا علاقہ اور اپنی بیٹی زوجیت میں سکندر کو دیکر وہ صلح پر آمادہ تھا، لیکن جب سکندر نے یہ شرط لگائی کہ دارا خود اس کے دربار میں آئے تو ایرانی شہنشاہ کو یہ گوارا نہ ہوا اور ایک بار پھر قسمت آزمائی کے لیے

اس نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ آخری لڑائی جس نے دولت کیانی کا فیصلہ کر دیا ۳۳۱ سنہ ق م میں مقام اربیلا (اربیل) پر لڑی گئی جو موجودہ شہر موصل سے پچاس میل ٹھیک مشرق میں واقع تھا۔ دارا اس مرتبہ بھی نہایت بزدلی سے لڑائی شروع ہوتے ہی بھاگ گیا۔ سکندر نے کامل فتح پائی اور بڑھ کر ایرانی پایۂ تخت سوسا (سوس)، پھر قدیم دارالسلطنت پرس پولس (شہر اصطخر) پر قابض ہوگیا اور بے حساب زر و جواہر اور ساز و سامان بلکہ کہنا چاہیے کہ پوری سلطنت ایران اس کے تصرف میں آگئی۔ اور اس موقع پر شاید فتحمندی کی خوشی سے بے قابو ہو کر اُس نے ایتھنز کے ڈیڑھ سو برس پہلے جلائے جانے کا بدلہ اصطخر کو آگ لگا کر لیا۔ ۳۳۰ سنہ ق م

دارا کا انجام فتحمندوں کے ایران میں گھستے ہی دارا، اک ٹبانا (موجودہ ہمدان) میں بھاگ آیا تھا اور انتظار میں تھا کہ جب مقدونوی ترکتازوں کی ہوس غارت گری و کشورکشائی سیر ہو جائے اور وہ واپس لوٹ جائیں تو پھر اپنے مامن سے نکلے یا کم سے کم اپنی سلطنت کے مشرقی علاقوں پر ہی بہ اطمینان حکومت کیے جائے؛ لیکن سکندر نے یہاں بھی اسے چین لینے نہ دیا اور سواروں کی ایک مختصر جمعیت لے کر اُسے اسیر کرنے کی غرض سے ہمدان چلا۔ دارا نے پھر مشرق کی جانب راہ فرار اختیار کی مگر معلوم ہوتا ہے اُس پر عقوبت سفر اور مصیبتوں سے گھبرا کر اب وہ اس فکر میں تھا کہ اپنی بیٹی سکندر کے حوالے کر دے کہ اسی زمانے میں خود اس کے بعض سرداروں نے اُسے گرفتار کر لیا اور اسی قید کی حالت میں باختر کی طرف لے چلے کہ اس دور دست علاقے میں پہنچ کر از سر نو سکندر سے مقابلہ کا سامان کریں۔ دارا کی نالائقی اور بزدلی نے انھیں ایسا بیزار کر دیا تھا کہ وہ اپنے نزدیک اُسے معزول کر چکے تھے اور ایک ایرانی امیر جس کا نام یونانیوں نے بے سوس بتایا ہے کچھ چھپا کچھ ظاہر بادشاہ ایران بنا لیا گیا تھا۔ تاہم یہ لوگ دارا کو سکندر کے ہات میں چھوڑ دینا نہ چاہتے تھے کہ اگر وہ حملہ آوروں کے قبضے میں آگیا اور اطاعت قبول کر لی تو پھر سکندر سے آیندہ مقابلہ کرنا اور بھی دشوار ہو جائیگا۔ چنانچہ ہرکاینہ تک (جسے ایرانی مازندران اور عرب طبرستان کہتے تھے) دارا ایک رتھ

میں دست و بابستہ ان کے ساتھ تھا۔ انہی علاقوں میں یکایک سکندر دو اسپہ سہ اسپہ کرتا ہوا دوسرے راستے سے اُن کے سر پر آ پہنچا اور انھیں خیمہ و خرگاہ چھوڑنے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر فوراً بھاگنے کے سوائے کوئی تدبیر سلامتی کی نظر نہ آئی۔ اس وقت اُنھوں نے بدنصیب دارا کو بھی اپنے ہمراہ گھوڑے پر لے چلنا چاہا۔ اُس نے انکار کیا تب بیسوس اور اس کے ساتھی نے جو دارا کو پہلے سے ایک ذلیل قیدی سمجھتے تھے اس کے بدن میں برچھیاں بھونک دیں اور گھوڑے بھگا کر خود خطرے سے نکل گئے۔

نظامی نے اس موقع کی بڑی عبرت انگیز تصویر اُتاری ہے کہ جب سکندر دم توڑتے دارا کے قریب پہنچا تو :-

تن مرزبان دید در خاک و خون کلاہ کیانی شدہ سرنگوں
بیازوے بہمن برآسودہ مار زروئیں دژ افتادہ اسفندیار
بہار فریدوں وگلزار جم بباد خزاں گشتہ تاراج غم
نسب نامۂ دولت کیقباد ورق بر ورق ہر سوے بردہ باد

لیکن سکندر جب دارا کی رتھ کے پاس پہنچا تو وہ مر چکا تھا خود اُس سے دارا کا باتیں اور وصیتیں کرنا محض افسانہ ہے۔

سکندر کی باقی فتوحات اسی موسم بہار میں سکندر نے درنگیانا اور گدروسیہ وغیرہ وہ علاقے فتح کیے جو آج کل سیستان و کابل کے نام سے موسوم ہیں۔ یہیں اُس نے سکندریہ ایریوں (موجودہ ہرات) کی نوآبادی بسائی اور پھر باختر کی سمت مڑ گیا۔ اُس کے اگلے چار پانچ سال کی فتوحات کو بہ وضاحت بیان کرنا ہماری کتاب کے احاطے سے خارج ہے اور یہاں صرف یہ لکھنا کافی ہوگا کہ بیسوس کو شکستیں دے کر گرفتار کرنے اور پھر سخت عقوبتوں سے مروا ڈالنے کے بعد سکندر نے اپنے مقبوضات کی شمالی حد دریائے جیحوں کو قرار دیا تھا، اور پھر سمرقند کے علاقے میں نوآبادیاں قائم کر کے ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا

(۳۲۶ سنہ ق م) اس مہم میں اس کی فوج ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی لیکن جب متعدد لڑائیاں لڑکے اور راجہ پورس کو شکست دے کے وہ ستلج کے کنارے پر پہنچا تو اس کے سپاہیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور مجبوراً وہ یہاں سے دریا دریائے اٹک کے دہانے تک آیا اور پھر اپنے سردار نیارکس کو سمندر کے راستے بیڑا لانے کی ہدایت کر کے خود بلوچستان ہوتا ہوا ایران لوٹ گیا (۳۲۴ سنہ ق م)۔ شہر سوسا میں سکندر کا کئی مہینے قیام رہا۔ صوبوں کے انتظامات کی دیکھ بھال کی اور دل کھول کر اپنی مہم کے مصائب سفر کا بدلہ عیش و نشاط سے اتارا اور فتوحات کی خوشی میں بڑے جشن منائے۔ غالباً ۳۲۳ سنہ ق م کے شروع میں وہ بابل آیا اور ملک عرب پر حملے کی تیاریاں کیں جسے وہ دنیا کی جنوبی حد سمجھتا تھا لیکن ٹھیک اُس وقت کہ اس مہم کا سارا سامان تیار ہو چکا تھا اس کا پیام اجل بخار کی صورت میں آ پہنچا اور تینتیس برس چھ ماہ کی عمر میں یہ نامور فاتح دنیا سے اُٹھا لیا گیا۔ (جون ۳۲۳ سنہ ق م)

ارادے، عادات اور اوصاف

سکندر کے آیندہ ارادوں اور ہوس کشورکشائی کی نسبت عام طور پر مورخوں کی یہی رائے ہے کہ اگر وہ اور جیتا تو ضرور دنیا کے باقی ماندہ ممالک بھی اس کی فاتحانہ یورش کی جولانگاہ بنتے۔ اور اس کی سپہ سالاری اور فن حرب میں غیر معمولی قابلیت یقیناً اس بات کی ضمانت تھی کہ آیندہ بھی اس کو ایسی ہی کامیابیاں ہوتیں جیسی کہ اب تک ہوئیں، لیکن یہ امر کہ اتنی عظیم الشان عالمگیر سلطنت کو وہ کس طرح چلانا چاہتا تھا، مختلف فیہ ہے۔ سکندر کے بعض مدّاح ملک رانی کے بہتر سے بہتر منصوبے اُس سے منسوب کرتے ہیں اور بار بار یاد دلاتے ہیں کہ "ایک مقدونوی مطلق العنان ہونے کے باوجود سکندر خیالات و محسوسات کے اعتبار سے سچا 'یونانی' تھا۔ ارسطو جیسے عدیم المثال حکیم نے اُسے عدل و دانائی، قانون و حق پسندی، اور انسانی مساوات کی تعلیم دی تھی اور بنی نوع انسان سے خالص محبت و ہمدردی کا سبق سکھایا تھا۔ پس اس میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اگر وہ زندہ رہتا تو اس کی حکومت دنیا میں اتحاد اور بین الاقوام روابط و یک جہتی کا سرچشمہ اور مشرق و مغرب

کے لیے آیہ رحمت ہوتی''۔

لیکن ایسا حسن ظن قایم کرنے سے پہلے تاریخ پڑھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اُن نمایاں تبدیلیوں کو پیش نظر رکھے جو سکندر کی عادتوں میں جنگ اربیلا کے بعد پیدا ہو گئی تھیں۔ ارسطو کی تعلیم کا اثر تو شاید گرانی کس ندی کے عبور کرتے وقت ہی دُھل گیا تھا اور اگر رہا بھی ہو تو خود فلسفۂ ارسطو کے بعض پہلو ایسے تھے جو سکندر کی سی بے چین طبیعت کو قابو میں رکھنے کے بجائے طلب جاہ و نمود کا اور شوق دلاتے تھے۔ مگر ان خارجی اثرات سے قطع نظر کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کا فطری میلان اس وقت اچھی طرح کھُلا جبکہ اس نے ایشیائی بادشاہی اور دارائی عیش کے مزے دیکھے۔ تقریباً ایک ہزار برس کے بعد، عرب کے فتحمند بدوؤں پر بآن ہمہ تدین وسادہ مزاجی دولت ایران کے جن عشرت کدوں کا جادو چلے بغیر نہ رہا، اُسی طلسمی جال میں سکندر کا پھنسنا مقدر تھا۔ ایسوس کی فتح کے بعد پہلی مرتبہ جب اُسے دارائی خیام و بارگاہ برتنے کا موقع ملا تو وہاں کے بیش بہا ساز و سامان اسباب عیش و تکلفات دیکھکر حیرت زدہ سکندر کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے ''آج معلوم ہوا کہ اس شے کا نام بادشاہی ہے''، پھر قسمت نے چند ہی سال میں اُسے خاص دارا کے تخت پر لا بٹھایا، تو اُس وقت، سوس کے محلوں میں، تاجدار ایران بن کر رہنا اور وہاں کی ظاہری دلفریبیوں سے مسحور نہ ہونا، معمولی آدمی کے قابو کی بات نہ تھی۔ اور واقعات بہت پہلے پکار چلے تھے کہ اخلاقی اعتبار سے دنیا کا یہ نامور مقدونوی فاتح محض ایک معمولی آدمی ہے۔ سپاہیانہ قابلیت، عزم و دلیری، استقلال و جفاکشی، غرض بڑے سے بڑے سپہ سالار میں جو اوصاف ہونے چاہئیں، سب بدرجہ کمال اس کی ذات میں مجتمع سہی، اس کا کیا جواب ہے کہ آدمی فقط سپہ سالاری کے لیے خلق نہیں ہوا ہے، انسانیت کی شرائط اور ہیں۔ انسان کی برگزیدگی بہت سی قومیں اور ملک فتح کرنے میں اور ہزاروں مربع میل رقبے جیت لینے میں، اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ خود اپنے پر قابو پانے میں اور جذبات کی اُن طوفانی ہواؤں کے دبا لینے میں ہے جو اس حقیر تصیر جسم عنصری کے اندر رواں ہیں۔

سکندر نے اگر تھیبز کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو کہا جا سکتا ہے کہ انسانی بہیمیت کی یہ ایک معمولی مثال تھی اور اُس زمانے میں مفتوحین اور اسیران جنگ کے ساتھ جو وحشیانہ بے رحمی کی جاتی تھی اس کی نظیر آپ ڈھونڈیں گے تو خود اس بیسویں صدی عیسوی کی لڑائیوں میں شاید بآسانی مل جائے گی۔ لیکن ایران پہنچ کر سکندر کا ایرانی بادشاہوں کی مثل، اپنی پرستش کرانا یا مافوق الانسان صفات سے متصف ہونے کا دعویٰ ایسے افعال ہیں جو ہر صاحب عقل کی نظر میں نفس انسانی کے بدترین جذبات کا مظاہر سمجھے جائیں گے۔ اور اسی خود پرستی کے ساتھ سکندر نے جو ظالمانہ طرز عمل اختیار کیا، وہ کچھ بھی لائق حیرت نہیں ہے۔ اپنے سب سے نامور جرنیل پارمینیو اور اس کے بیٹے فلوتاس کو معمولی شبہ پر اس کا قتل کرا دینا یا سب سے جانباز سردار اور وفا کیش دوست کلیتس کو باتوں باتوں میں مشتعل ہو کر مروا ڈالنا، یا کالس تھینیز (جسے عربی تلفظ نے قالش تانس بنا دیا ہے) فلسفی کو قید میں سڑا سڑا کر مارنا ایسی شرمناک زیادتیاں ہیں جنھیں مطلق العنان کا سنگار نہیں، لازمہ سمجھنا چاہیے؛ کیونکہ اب سکندر حکیم ارسطو کا یونانی شاگرد نہ تھا بلکہ ایران کے شاہان جابر کا نو دولت وارث بن گیا تھا!

گروٹ کا یہ قول کہ سکندر ایشیا کو یونان کے رنگ میں رنگنا نہ چاہتا تھا بلکہ خود مغرب کو مشرقیت میں ڈبونے پر مائل تھا، اور بھی کئی باتوں سے ثابت ہے۔ مثلاً لباس و معاشرت میں ایرانی وضع کا اختیار کرنا یا اپنے مقدونوی سرداروں اور سپاہیوں کو ایرانی بیویوں سے شادی کرنے کی تحریص۔ چنانچہ جب خود سکندر نے دارا کی بڑی بیٹی استاترہ سے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ۳۲۴ھ ق م میں شادی کی تو لکھا ہے کہ تقریباً دس ہزار سپاہیوں اور اسی نوے بڑے بڑے افسروں نے اپنے بادشاہ کا اتباع کیا اور ضروری مصارف کے لیے انھیں سرکاری خزانے سے رقمیں عطا کی گئیں؛ اس موقع پر یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سکندر کی یہ دوسری شادی تھی اور اس سے پہلے وہ باختر کی رئیس زادی سے بھی عقد کر چکا تھا جس کا نام یونانیوں نے رُکسانا لکھا ہے اور یقیناً یہی وہ خاتون ہے جسے ہمارے

فارسی قصہ نویس روشنک کے نام سے دارا کی بیٹی اور سکندر کی ملکہ بتاتے ہیں۔ مگر رکسانا یا روشنک دارا کی بیٹی نہیں تھی۔ ہاں نظامی کا یہ کہنا درست ہے کہ اسی بیوی سے (سکندر کی وفات کے چند ہفتے بعد) اس کا اکلوتا بچہ پیدا ہوا تھا۔

سکندر کے بعد ایشیا

سکندر کے مرتے ہی اس کی عظیم الشان سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے بڑے بڑے سپہ سالاروں نے سلطنت کو آپس میں بانٹ لیا اور پھر آپس میں مصروف جنگ و جدال ہو گئے۔ ان ملوک طوائف اور ان کی لڑائیوں کے حالات اس کتاب کی حدود سے باہر ہیں مختصر طور پر صرف یہ لکھا جا سکتا ہے کہ شام و مصر کے سوائے سکندر کے مشرقی مقبوضات سال کی چند دہائیوں میں اس کے جانشینوں کے قبضے سے نکل گئے اور ایک صدی کے بعد، فرات کے پار بلکہ ایشیائے کوچک میں مقدونوی یونانیوں کا تسلط باقی نہ رہا۔ البتہ شام میں خاندان سلوکس کی ڈیڑھ صدی سے کچھ زیادہ عرصے تک حکومت رہی یہ سلوکس سکندر کا وہ سپہ سالار ہے جو اُس کے بعد تمام مشرقی مقبوضات کا وارث ہو گیا تھا اور جس نے ہندوستان پر بھی دوبارہ چڑھائی کی تھی۔ لیکن اس کے جانشین اتنے اقبال مند نہ تھے۔ اور ایران کے آزاد ہونے کے بعد رفتہ رفتہ ان کی سلطنت کمزور ہو کر آخر میں جمہوریہ رومہ کا ماتحت صوبہ بن گئی (۶۵؁ ق م)

مصر

سکندر کے ایک دوسرے سپہ سالار ٹالمی (بطلیموس) کے حصے میں مصر کی حکومت آئی تھی اور چونکہ اس ملک میں نسبتاً زیادہ امن رہا اس لیے وہاں علم و صناعت، تجارت و فلاحت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اور ہر چند خود وہاں کے باشندوں میں ایسے نامی گرامی شعرا یا فلسفی یا علامہ نہیں ہوئے تاہم علم و فضل کا جس تپاک سے خیر مقدم ان کے شہر اسکندریہ میں کیا گیا کہیں نہ ہوا تھا۔ زمانۂ قدیم کا وہ عظیم الشان کتب خانہ جس کے جلانے کا مسلمانوں پر الزام لگایا گیا تھا، اسی شہر میں تھا۔ حکیم اقلیدس نے اپنی زندہ جاوید کتاب اسی کے دارالعلوم میں بیٹھ کر تحریر فرمائی تھی اور یہیں بطلیموس نے ہیئت اور نظام شمسی پر وہ تصانیف کی تھیں

جن کی صدیوں تک عقائد عالم پر حکومت رہی۔ مگر سکندریہ کی علمی مرکز نے بہت بڑا کام یہ کیا کہ یونانی فلسفہ اور اسرائیلی الٰہیات کو اول مرتبہ ایک دوسرے سے روشناس کیا اور فریقین کے عقائد وافکار میں وہ تلاطم ڈالا جس کے آغاز، مدوجزر اور عواقب ونتائج کے حالات لکھے جائیں تو کئی ضخیم جلدیں بھی اکتفا نہ کر سکیں۔

لیکن علم و فلسفہ کی یہ ترقیاں حکومت کے انحطاط کو نہ روک سکتی تھیں اور وہ سیلاب جو روما سے اُٹھا تھا بالآخر آزادی مصر کو بھی بہالے گیا اور اگرچہ باجگزاری کے آخری ایام میں مشہور حسینہ کلیوپترا یہاں کی ملکہ ہوئی تو روما کے وہ سپہ سالار جو حکومت کرنے آئے تھے، اُس کی دلربائیوں کے محکوم و مسخر ہو گئے تھے۔ لیکن جب اس کے عاشق جانباز، انٹونی کو بھی اپنے حریف سلطنت آگسٹس سیزر کے ہاتوں شکست ملی اور وہ خودکشی کر کے مرگیا اور کلیوپترا کو بھی کوئی امید اپنا جادو چلنے کی نہ رہی تو اپنے تئیں سانپ سے ڈسوالیا اور مصر کی آزاد حکومت کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئی (۳۱ ق م)۔

(۳)

یونان | سکندری فتوحات کی رو ہمیں یہ مہلت نہیں دیتی کہ اُس کی زندگی میں وقتاً فوقتاً یونان پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ لیکن اب کہ وہ اپنے ارادوں اور حوصلہ مندیوں سمیت شہر سکندریہ لایا جا کر شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ سپرد خاک کیا جا چکا ہے، وقت ہے کہ ہم اپنی اصلی تاریخ کی طرف متوجہ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ یونانی ریاستیں فیلقوس اور سکندر کے زبردست ہاتوں سے یکے بعد دیگرے کمزور و مغلوب ہو چکی تھیں اور صحیح معنوں میں اس کی تاریخ کا جنگ شیرونیہ (۳۳۷ ق م) یا زیادہ سے زیادہ فتح تھیبز کے بعد (۳۳۵ ق م) خاتمہ ہے۔ بایں ہمہ زوال کے بعد بھی قومیں کچھ عرصے تک ہات پاؤں مارتی رہتی ہیں اور یونانیوں کی بے چین طبیعتوں سے بھی نچلی بیٹھنے کی امید نہیں ہو سکتی تھی؛ چنانچہ سکندر کے ایشیا میں اُترتے ہی جا بجا ہم مقدونیہ کے خلاف ساز باز ہوتے دیکھتے ہیں اور گو ان کوششوں میں کامیابی سراسر موہوم ہے کہ اہل یونان کی اصلی قوت اور قومیت میں اب سکت باقی نہیں اور خود غرضی کے مہلک مرض نے ان کے

افراد کو اس لایق نہیں چھوڑا ہی کہ مل کر آزادیٔ وطن کے لیے کوئی بڑا کام کر سکیں، پھر بھی ڈموس تھینز اور اُس کے ہمخیال محبان وطن کی شہ اور ایران کی اشرفیوں میں کچھ اثر باقی ہی کہ اسپارٹہ میں ہمیں مقدونیہ سے زور آزمائی کی تیاریاں ہوتی نظر آتی ہیں۔ اور آخر عین اُس زمانے میں جبکہ سکندر اربیلا کے تاریخی میدان کی طرف بڑھ رہا ہی، اس کا مقدونوی نائب السلطنت یعنی سپہ سالار انٹی پاٹر پیلوپنی سس کی نئی شورش کو بزور رفع کرنے پر مجبور ہوتا ہی (جنگ مگالو پولس ۳۳۱ ق م)

اس مقابلے میں علاقہ اکائیہ اور ایلس کی اکثر ریاستیں اسپارٹہ کے بلند ہمت پادشاہ ایجس کے ساتھ ہو گئی تھیں لیکن لڑائی میں مقدونیہ کے قواعد داں سپاہیوں کے سامنے محض بیجا شجاعت کی پیش نہ گئی۔ ایجس زخم کھا کے مارا گیا انٹی پاٹر کو کامل فتح حاصل ہوئی اور دیگر اہل شورش کے علاوہ خود اسپارٹہ کو اول مرتبہ مقدونیہ کے آگے جھکنا پڑا اور صلح کی التجا کرنی پڑی۔

اس فتح کا اثر

سکندر کو جب ان واقعات کی خبر پہنچی تو وہ ہنسنے لگا کہ "انٹی پاٹر کن چوہوں سے لڑائیاں لڑ رہا ہی"، مگر سچ یہ ہی کہ گو ایران کے نوجوان فاتح کی نظر میں یونانی ریاستیں بالکل حقیر ہوں، ان سے انٹی پاٹر کا جیتنا کچھ کم اہم نہ تھا کیونکہ ایک طرف تو اُس نے اسپارٹہ کی رہی سہی قوت ایسی توڑ دی کہ سکندر کے بعد جو لڑائیاں پیش آئیں اُن میں اسپارٹہ اور اس کے ساتھیوں کو جو مذکورہ بالا جنگ مگالو پولس میں زخم کھا چکے تھے، مقدونیہ کے خلاف کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ دوسرے وہ سب ریاستیں کہ شورش پر آمادہ مگر ابھی تک مذبذب تھیں اس فتح سے مرعوب ہو گئیں اور حکومت مقدونیہ کی اطاعت گزاری میں پہلے سے زیادہ سرگرمی دکھانے لگیں۔ حتیٰ کہ ہندوستان سے (سوس) لوٹنے کے بعد سکندر نے اہل یونان سے دیوتاؤں کی مثل اپنا احترام کرانا چاہا تو شہر ایتھنز تک اس شرمناک ذلت کو قبول کرنے پر تیار ہو گیا۔ بلکہ منقول ہی کہ خود ڈموس تھینز نے یہ کہہ کر اس تجویز کو جواز کا فتویٰ دیا تھا کہ "عالم بالا میں سکندر کے اعزاز و اکرام کی ہمیں مخالفت نہیں کرنی چاہیے!" اور اس کے سیاسی حریف ڈماڈیز نے بھی اسی قسم کے پیرایے میں لوگوں کو تنبیہ کی تھی کہ آسمانی

باتوں کے پیچھے کہیں زمین کی چیزوں کو نہ کھو بیٹھنا۔

اس موقع پر بعض مخالف صدائیں بھی بلند ہوئی تھیں خاص کر ایک نوجوان خطیب تھیاس نے انھیں بڑی شرم وغیرت دلائی تھی اور جب سن رسیدہ "مدبروں نے" اُسے روکا کہ تمھاری عمر ابھی ایسے اہم معاملات میں رائے دینے کی نہیں ہے تو تھیاس کہنے لگا "جسے تم دیوتا بنانے کی تجویز کر رہے ہو میں اس سے تو عمر میں بڑا ہوں!"

لیکن سب سے اچھا جواب سکندر کے سفیروں کو اسپارٹہ میں ملا کہ جب اُنھوں نے یہی مطالبہ پیش کیا تو اہل اسپارٹہ نے محض یہ جواب دے دیا کہ "خیر اگر سکندر دیوتا ہونا چاہتا ہے تو ہو جائے"

سکندر کی وفات اور جنگ لیمیہ

بہرحال جب تک سکندر جیا تمام یونانی ریاستیں طوعاً یا کرہاً اس کی اطاعت کرتی رہیں۔ اور دلوں پر اس کی جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اس کا کسی قدر اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ سکندر کے مرنے کی اطلاع ایتھنز پہنچی تو خوف کے سبب اول اول کسی کو یقین کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ڈموس تھنیز ان دنوں ایک رشوت خواری کے مقدمے میں سزایاب ہونے کی وجہ سے جان بچا کر شہر سے نکل گیا تھا۔ اور ایتھنز میں بظاہر مقدونیہ کے طرف داروں کی حکومت تھی۔ اُن میں سے ایک نے تو سکندر کا مرنا سُن کر یہ ہدایت کی کہ اس افواہ پر کوئی کان نہ دھرے کیونکہ ایسی نعش کی باس ہی سارے عالم کی ناک میں اب تک پہنچ جاتی! اور سپہ سالار فوکیوں کی صلاح یہ تھی کہ اگر سکندر آج مرا ہوا ہے تو کل بھی مرا ہوا رہے گا، پس اس کی موت پر جلدی سے یقین لے آنے میں کوئی فائدہ نہیں!

مگر جب اس خبر کے سچ ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تو دفعتہً اہل ایتھنز کو یہ معلوم ہوا کہ گویا ان کے وزنی طوق وسلاسل خود بخود کٹ کے گر پڑے، اور یہی نہیں کہ خود انھیں ایک ایسے ظالم کے پنجے سے جس پر کوئی زور نہ چلتا تھا، منجانب اللہ مخلصی مل گئی، بلکہ درحقیقت اب ان کے دل میں ازسرنو اپنی قدیم سلطنت قائم کرنے کا جوش پیدا ہو گیا اور یکایک ان میں

ایسی گرمی آگئی کہ تھوڑے ہی دن میں معقول بری اور بحری ساز و سامان جنگ اُنھوں نے مہیا کر لیا اور اسی کے ساتھ ہر طرف سفیر بھیج کر متعدد یونانی ریاستوں کو اشتعال دلایا کہ یونانی آزادی کے استحصال کا یہ خداداد موقع ہات سے نہ دیں اور ایتھنز کے ساتھ مل کر مقدونیہ کا جوا اُتار پھینکنے کی ایک آخری کوشش کریں۔

جوش ایک متعدی جذبہ ہی اور احقاق حق کے لیے دلایا جائے تو اس کی قوت اور سرعتِ اثر بڑھ جاتی ہی۔ پس ایتھنز کی یہ مستعدی دیکھی تو اکثر شہروں نے جو خود مقدونیہ کی غیر حکومت سے قدرتاً نفور تھے، اس کی صدائے دعوت پر لبیک کہا اور ایک مرتبہ پھر یونان میں انٹی پاٹر سے زور آزمائی کی تیاریاں ہو گئیں۔

سکندر کی خبر وفات کے ساتھ ہی انٹی پاٹر کو اس نئی شورش کی اطلاعیں مل گئی تھیں وہ اس بات کو خوب جانتا تھا کہ سکندر کے ساتھ ہی اس کے بادشاہی خاندان کا بھی خاتمہ ہو چکا ہی اور اگر سپہ سالار پیرڈکاس نے سکندر کے ضعیف القویٰ بھائی اری ڈیوس اور شیرخوار بچے سکندر کی مشترکہ بادشاہت کا اعلان کر دیا ہی تو یہ اس کا محض ایک حیلہ ہی اور جلد یا کچھ دیر بعد ضرور پیرڈکاس خود بادشاہ بن بیٹھے گا۔ پس سکندر کے یورپی حصے کا انٹی پاٹر وارث بننا چاہتا تھا اور خاندان شاہی کے واسطے نہیں بلکہ خود اپنی قوت مضبوط کرنے کے لیے یونان کو قابو میں رکھنا پہلے سے بھی زیادہ ضروری سمجھتا تھا۔ ایتھنز کی جنگی تیاریاں سنتے ہی جتنی فوج ملی اسے سمیٹ کر نہایت تیزی سے وہ یونان پر چلا۔ مرعوب ہونے کی بجائے ایتھنزی سپہ سالار لیوس تھینز نے بہت آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور تھسلی کے انتہائے جنوب میں ایک تیز و تند جنگ واقع ہوئی جس میں انٹی پاٹر نے شکست کھائی اور لامیہ میں پناہ لینے پر مجبور رہوا جو ساحل سمندر کے قریب ایک مضبوط پہاڑی جگہ تھی اور جہاں یونانیوں کے حملے کارگر نہ ہو سکے تو اُنھوں نے اس کو ہر طرف سے محاصرہ کر لیا (۳۲۳ ق م)

اس فتح نے یونانیوں کے حوصلے بہت بڑھا دیے اور اہل مقدونیہ کا جو رعب ان کے دلوں پر چھایا ہوا تھا کہ ان پر غلبہ پانا محال ہے، باقی نہ رہا۔ اِدھر ایتھنز میں مقدونیہ کے طرفداروں کی بڑی ذلت و خواری ہوئی اور ڈموس تھینز کو نہ صرف واپس آنے کی اجازت مل گئی بلکہ پھر وہی فروغ اور اقتدار حاصل ہوگیا جو شیرونیہ کی لڑائی سے پہلے حاصل تھا۔ لیکن یہ تمام باتیں عارضی تھیں۔ ایک ہی سال میں قسمت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور کراتی روس ایک زبردست جنگ آزمودہ فوج لے کر انٹی پاٹر کی مدد کو آپہنچا۔ لیوس تھینز پہلے ہی ایک مقابلے میں مارا جاچکا تھا۔ ان کی فوجی تعداد اب دشمن کی نسبت آدھی رہ گئی اور جنگ کرونن (وسط تھسلی) میں اُن کی ساری نئی امیدوں کا خاتمہ ہوگیا (۳۲۲ ق م) یعنی شکست کھاکر وہ صلح کرنے پر مجبور ہوئے۔ معقول تاوان جنگ اور اپنے قدیمی مقبوضات جزائر لمنوس امبروس اور اسکائی روس سے دست بردار ہونا پڑا اور سب سے بدتر یہ دو شرطیں ماننی پڑیں کہ اول تو ایتھنز کے قریب مقدونیہ کا ایک فوجی دستہ مقیم رہے گا اور دوسرے وہ ڈموس تھینز اور ہیپے رڈیز کو جو مقدونوی حکومت کے سب سے بڑے مخالف تھے انٹی پاٹر کے حوالے کردینگے یونانی ریاستوں سے اہل ایتھنز کا جدید اتحاد کرونن کے میدان ہی میں برباد ہوچکا تھا ان شرائط نے ان کی شہری آزادی بھی باقی نہ رکھی اور انٹی پاٹر نے فوکیوں کو مسلط کرنے سے ان کے جمہوری نظام حکومت کو بھی ایک حد تک درہم برہم کر ڈالا۔

ڈموس تھینز کا خاتمہ انٹی پاٹر کے ایتھنز پہنچنے سے پہلے ڈموس تھینز اور اس کے ہمخیال جزیرہ اجی نا بھاگ آئے تھے اور جب یہاں بھی اطمینان نہ ملا تو ہر ایک نے الگ الگ دوسری جائے پناہ ڈھونڈی۔ ہیپیرے ڈیز جزیرہ نمائے پیلوپنی سس میں نکل گیا اور ڈموس تھینز نے کلوریہ کے ایک مندر میں پناہ لی۔ کلوریہ اجی نا کے جنوب میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے اور یہیں یونان کے اس بدقسمت محب وطن نے اپنی زندگی کے چند آخری دن پورے کیے۔ ڈموس تھینز پر اس کے دشمنوں نے اکثر بزدلی کا الزام لگایا ہے لیکن اُس کی دلیرانہ خودکشی ان تمام الزامات

کی قطعی تردید ہے اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب ارکیاس اپنے خونی کتوں سمیت پتہ لگاتا لگاتا
اسے گرفتار کرنے مندر تک آپہنچا تو ڈموس تھینز کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ کسی طرح زندہ
نہ بچے گا۔ تاہم اُس پر مطلق خوف وہراس طاری نہ ہوا۔ ارکیاس کی نسبت یہاں یہ بتانا
ضروری ہے کہ یہ شخص طالیہ کا باشندہ اور پیشے کا نقال (یعنی ایکٹر) تھا اور انہی دنوں جب
انٹی پاٹر نے حامیانِ آزادی کے استیصال کی غرض سے ایک گروہ ایسے اشخاص کا نوکر
رکھا جنھیں لوگ ان کے کام کی مناسبت سے شکاری کہتے تھے تو اس خونی گروہ کی سرداری
پر ارکیاس مامور ہوا اور ڈموس تھینز کے واقعے کی بدولت آج تک تاریخ میں ملعون ہے۔ غرض
جب ارکیاس نے اپنے شکار کو مندر میں بیٹھے دیکھا تو اول چرب زبانی سے فریب کا جال پھیلایا
اور اگر وہ خود اپنے تئیں حوالے کردے تو اس کی جان بخشی کرا دینے کا وعدہ کیا؛ مگر ڈموس تھینز
پر یہ جادو کارگر نہ ہوا۔ وہ کہنے لگا "ارکیاس تمہاری نقالی کا تماشے میں بھی مجھ پر اثر نہیں
ہوا تو اب ان وعدوں کا کیا ہوگا؟" تب ارکیاس نے صاف اپنے ارادے کا اظہار کردیا
کہ مندر کا احترام کیے بغیر ڈموس تھینز کو گرفتار کرلیا جائے گا! ڈموس تھینز نے کہا "وہاں
اب تم مقدونوی عرشے پر سے بولے ورنہ پہلے محض نقالی کر رہے تھے! ذرا ٹھہر جاؤ کہ میں اپنے
گھر والوں کو ایک خط لکھ دوں"۔ یہ کہہ کے اُس نے کاغذ قلم اُٹھایا اور مشہور ہے کہ زہر جو اسی
غرض سے قلم کے نیزے میں چھپا رکھا تھا نیزہ پہ چبا کر کھا لیا اور تھوڑی دیر میں گر کے جان دیدی۔
ایتھنز کے اس نامور خطیب کا افسوس ناک انجام یہ تھا۔ بے شک اس وقت دشمنانِ آزادی
کے خوف سے حریت کے اس شیدائی کی تجہیز و تکفین بھی خاطر خواہ عزت و آبرو سے نہ ہوئی
لیکن چند سال بعد اس کی تلافی کردی گئی ڈموس تھینز کا برنجی مجسمہ خاص ایوان مجلس میں نصب
ہوا اور اُس پر وہ کتبہ کندہ کرایا گیا جو مرنے والے کی نہایت موزوں قدرشناسی پر مبنی تھا:

"ڈموس تھینز! تیرے بازو کی قوت اگر تیری روح کے ہم سنگ ہوتی تو یونان
کی گردن میں کبھی اغیار کا طوق نہ ہوتا"!

ملوک طوائف اور ڈمٹ ریس

ان واقعات کے بعد یونان میں مقابلے کی عرصہ دراز تک سکت نہیں پیدا ہوئی اور دس پندرہ برس تک اُس کی یہ حالت رہی کہ سکندر کے جانشین سپہ سالاروں میں جو زبردست ہوتا وہ اُس پر قابض ہو جاتا اور ایک بے جان قیمتی دھات کی طرح وہ کبھی ایک کی ملکیت میں آ جاتا کبھی دوسرے کی تاآں کہ ۳۰۷ء ق م میں انٹی گونس کے بیٹے ڈمٹ ریس نے اس کو اپنا مستقر بنایا۔ انٹی پاٹر اس وقت مر چکا تھا اور اس کے بیٹے کیسنڈر نے سکندر کی ماں، بیوی اور بیٹے کو مروا دیا تھا۔ لیکن اس پر بھی وہ چین سے مقدونیہ میں نہ رہ سکا اور ڈمٹ ریس کی مسلسل فتوحات نے اُسے یونان سے بے دخل کر دیا۔ پھر انٹی گونس اور ڈمٹ ریس نے ایشیائے کوچک ور یونان میں اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور آخر الذکر نے شاہ ایپرس، پیروس نامی کی بہن سے شادی کرنے کے بعد شہنشاہی یونان کا دعویٰ کیا اور یونان کی تقریباً تمام ریاستوں نے اس کی تصدیق کی (۳۰۲ء ق م) اسی زمانے میں سلوکس، بطلی موس اور لقوماجس نے مل کر ان باپ بیٹوں پر یورش کی اور اپ سوس (علاقہ فرغیہ) کی فیصلہ کن جنگ میں انٹی گونس مارا گیا، ڈمٹ ریس کا ستارہ گردش میں آ گیا اور وہی اہل ایتھنز جو چند روز پیشتر اس کی خوشامد میں شرمناک سے شرمناک کام کرنا گوارا کرتے تھے اُس سے بالکل منحرف ہو گئے اور اُس کے بال بچوں کو ایتھنز سے چلے جانے کا توہین آمیز حکم دے کر درحقیقت اُنھوں نے اُس رزالت کا ثبوت دیا جو اب اخلاق یونانی کی خصوصیت ہو گئی تھی اور جس کی پر درد نوحہ خوانی پر گروٹ نے اپنی زندہ جاوید کتاب کو ختم کر دیا ہے۔ بیشک وہ شخص جو عالم یونانی کی تصویر زینوفن، طوسی دیدیس یا ہیروڈوٹس کی لطیف و پرمعنی کتابوں میں دیکھنے کا عادی ہے کچھ عجب نہیں کہ یونان کی موجودہ حالت کو دیکھ کر یہ محسوس کرے کہ اس کے مضمون کی روح پرواز کر گئی، اور اب اس کے لیے "افسوس و ندامت کے ساتھ، یہ دفتر تہ کر دینا ہی مناسب ہے۔

مگر ہمیں عام دستور کے مطابق اپنی تاریخ کو رومی فتح تک لانا ہے اور دوسرے

نصف صدی کے بعد یونانیوں کی ایک اور سیاسی جدوجہد کا ذکر آتا ہے جس تک سلسلے سلسلے پہنچنا ضروری ہوگا۔

پیروس اور انٹی گونس

ڈمٹ ریس کے متعلق اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اپ سوس کی شکست سے جس میں اس کا باپ مارا گیا اس کی حالت بہت زبون و خوار ہو گئی تھی۔ تاہم یونان کے چند جنوبی شہروں پر اس کا بیٹا انٹی گونس گناٹاس کہ اپنے دادا کے نام میں آدھے کا شریک ہے اب بھی مسلط رہا اور جب ڈمٹ ریس اپنے حریف قوی سلوکس کے ہاتوں میں گرفتار ہو کر حالت نظر بندی میں فوت ہو گیا (۲۸۳ سنہ ق م) تو گناٹاس کی قوت اور کمزور ہو گئی، خاص کر پیروس کے فروغ نے بظاہر اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

یہ پیروس علاقہ اپیرس کا شہزادہ اور گناٹاس کا رشتے میں ماموں ہوتا تھا اور ملک گیری کے بڑے بڑے منصوبوں اور بلند ارادوں نے تاریخ میں اسے خاص شہرت دے دی ہے۔ اول اول اس کی نسبت خیال تھا کہ وہ تخت مقدونیہ کے لیے اُس عام ہنگامہ میں در آئے گا جو سکندر کے جانشینوں میں اب تک برپا تھا، لیکن جب یونانی آباد کاروں نے اُسے اطالیہ میں بلایا کہ نوخیز رومیوں کی دست درازی سے بچائے تو پیروس مغربی فتوحات کے خیالی پلاؤ پکاتا ہوا بحر اڈریاٹک سے پار اتر گیا اور رومیوں سے اس کے کئی معرکے ہوئے اہل رومہ اور یونانی فوجوں کی یہ پہلی مڈبھیڑ تھی اور ہر چند پیروس نے ہاتھیوں کی مدد سے جنھیں اہل اطالیہ نے کبھی نہ دیکھا تھا، ابتدا میں کئی لڑائیاں جیتیں، لیکن بالآخر رومہ کی جمہوری قوت اور استقلال کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ جا سکی اور بینی ونٹم کے قریب ایک ہی زبردست شکست نے اس کے حوصلے پست کر دئے (۲۷۵ سنہ ق م) جس طرح بنا اُس نے اطالیہ سے پیچھا چھڑایا اور اپنے یونانی دوستوں کو خدا کے حوالے کر کے خود واپس اپیرس کو لوٹ گیا۔ انھی واقعات کے کچھ عرصے بعد جب اطالیہ کی یونانی نوآبادیاں فتحمند رومیوں کو کسی طرح نہ روک سکیں تو رفتہ رفتہ ان کا تمام وہ علاقہ جو "مہا یونان" کے نام سے موسوم

تھا روم کے زیرِ علم آگیا (۲۷۵ قم)۔

پیروس کی یونانی لڑائیاں

مغرب میں ایک عظیم الشان سلطنت بنانے کی امیدیں تو خاک میں مل چکی تھیں مگر مقدونیہ کا میدان اب خالی اور گن ٹاس اس کے تخت کا مدعی تھا۔ سو اس کمزور حریف کو بہت جلد پیروس کے سامنے سے جنوب میں بھاگنا پڑا اور سکندر وفیلقوس کا خاندانی ترکہ پیروس کے قبضے میں آگیا (۲۷۳ قم) لیکن یہ ویران پہاڑی علاقہ کہ پچھلی لڑائیوں کی بدولت ویران تر ہو گیا تھا۔ ایسے بے چین اور فتوحات کے تشنہ لب سپہ سالار کے لیے کافی نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا جب اسی زمانے میں اسپارٹہ کے شاہی خاندان میں جھگڑا پیدا ہوا اور بادشاہت کے ایک ناکام مدعی نے پیروس کو دستگیری کے لیے بلایا تو کچھ مدد دینے اور کچھ اس بہانے کہ گن ٹاس کے اثر سے جنوبی یونان کو آزاد کرا دیا جائے، اُس نے پیلوپنی سس پر فوج کشی کی اور خاص اسپارٹہ کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ عظمت یونانی کی یہ قدیم یادگار اب بہت کچھ متغیر ہو چکا تھا، اس کے سیاسی اقتدار کے ہم قدم اس کی آبادی گھٹتی گئی تھی اور اس کے اکثر آئین و قوانین بھی بدل گئے تھے۔ چنانچہ لکرگس کی وصیت کے خلاف تھوڑے ہی دن پہلے اسپارٹہ کے لوگ اپنے شہر کے گرد حصار بنانے پر بھی مجبور ہوئے تھے اور شجاعت و سرفروشی کی قدیم خصوصیات بھی اب ان کا مابہ الامتیاز نہ رہی تھیں۔ بہرحال پیروس کے مقابلہ میں اپنی عورتوں کے جوش دلانے سے وہ کئی روز تک دلیرانہ جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ جزیرہ کریٹ اور گناٹاس سے انھیں کمک مل گئی اور پیروس خود ہی تسخیرِ شہر سے دست بردار ہو کر آرگس کی سمت مڑ گیا جہاں اسے گناٹاس اور اس کے طرفداروں کی سرکوبی کرنی منظور تھی اُس نے لڑائی کا فیصلہ جلد کر دینے کی غرض سے اکیلے گناٹاس کو اپنے ساتھ لڑنے کا پیغام دیا تھا کہ ہم دونوں میں سے جو غالب آئے وہی حکومت کا مالک ہو جائے۔ لیکن گن ٹاس نے جواب میں مامون کو کہلا بھیجا کہ اگر زندگی سے بیزار ہو تو خودکشی کی اور بہت سی صورتیں نکل سکتی ہیں!

الغرض پہلے فریقین میں مصالحت اور پھر کشت و خون کی نوبت آئی اور شہر آرگس کی گلیوں میں پیروس ایک عورت کے ہات سے (جس نے اپنے بیٹے کو خطرے میں دیکھ کر چھت پر سے ایک کھپرا کھینچ مارا تھا) زخمی ہو کر مر گیا (۲۷۲ء ق م) اور یونان کے بڑے حصّے کے علاوہ مقدونیہ کی حکومت بھی گناٹاس کے قبضے میں آگئی جس کا خاندان رومیوں کی فتح تک وہاں حکمراں اور یونان کی آزادی طلب ریاستوں سے مصروف جنگ رہا۔

(۴)

تاریخ یونان کے دلچسپ تماشے میں اب آخری پردے ہمارے سامنے ہیں۔ مغربی یونان کا دور فروغ گزر چکا ہے اور اب اُن گمنام علاقوں کی باری ہے جو اپنی دماغی ترقی یا تہذیب شایستگی کے اعتبار سے کیسے ہی حقیر ہوں تقریباً ایک صدی تک یونان کے بیرونی دشمنوں سے جدوجہد کرتے رہے اور جن کے مغلوب ہوتے ہی قدیم یونان کی حکومت و قومیت بھی صفحہ روزگار سے محو ہو گئی

ہیئت اطولیہ

نئے آنے والوں میں پہلے اہل اطولیہ کا نام آتا ہے جو خلیج کورنتھ کے شمال میں فوکیس تھسلی اپیرس اور اکرنانیہ سے گھرا ہوا علاقہ تھا۔ وہاں کے باشندے نیم متمدن زراعت پیشہ کسان تھے جن کے بدوی اخلاق نے چوتھی صدی قبل مسیح تک انھیں یونانی معاملات میں کسی اہم حصے لینے کے قابل نہ ہونے دیا تھا۔ لیکن مقدونیہ کے زمانہ اقتدار میں جب کہ اور یونانی ریاستیں آئے دن کی لڑائیوں سے کمزور و مضمحل ہوتی جاتی تھیں، یہاں کے مختلف قصبات و قبائل نے مل کر اُس ملکی اتحاد کی بنیاد ڈالی جو (انجمن یا ہیئت اطولیہ) کے نام سے مشہور ہے۔ جنوب مغرب میں قصبہ اناڈیہ اور مشرق میں نوپاکٹس، کے شریک ہونے سے اس انجمن کو اور قوت پہنچی اور جب ۲۷۹ء ق م میں اُنھوں نے غالوں کی زبردست یورش کا ڈیلفی پر مقابلہ کیا اور انھیں دفع کرنے میں کامیاب ہوئے تو ان کا اکرام و احترام یونان میں بہت بڑھ گیا اور سکندر کے جانشین یا مقدونیہ کے مدعیان بادشاہی کے مقابلہ میں کم سے کم غربی یونان کا اُنھیں محافظ و نگہبان تصور کیا جانے لگا۔

اتحاد کا نظام سیاسی سیدھا سادھا اور اطولیہ کی زراعت پیشہ آبادی کے لیے بدرجۂ اولیٰ مناسب تھا۔ ہر موسم بہار میں ان کی مجلس عام کا شہر تھرموس میں انعقاد ہوتا اور اس میں تمام آزاد اہل اطولیہ شریک ہو سکتے تھے ملک کی طرف سے جنگ یا صلح کے فیصلے اسی مجلس میں ہوتے اور وہی عہد و پیمان یا دیگر سیاسی قرار دادوں کا اختیار رکھتی تھی۔ لیکن عدالتی اور انتظامی اختیارات ایک اور جماعت کے سپرد تھے جسے مجلس منتخب کرتی اور جس کا صدر نشین سب سے بڑا عہدے دار سمجھا جاتا تھا۔

انفرادی طور پر ہر شخص کو کامل آزادی اور مساوات حاصل تھی اور ان حقوق شہریت میں اطولیہ کے سوا دوسرے علاقوں کے لوگ بھی، جو اتحاد کے شریک ہو جائیں، برابر کے حصے دار ہوتے جاتے تھے۔

ہیئت اکائیہ

لیکن وقعت و منزلت میں اتحاد اطولیہ پر بھی ایک دوسری انجمن کو فوقیت ہے جو پیلوپنی سس کے شمال وسطی علاقے (اکائیہ) میں قائم ہوئی اور بہت دفعہ گرنے اور گر کر سنبھلنے کے بعد بالآخر گناٹاس کے عہد حکومت میں اُسے نمایاں فروغ حاصل ہوا۔ خاص کر جب سکیان کے ایک جلاوطن امیرزادے، اراتوس نامی نے، اچانک شہر مذکور پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے ظالم حاکم جابر کو نکال کر انجمن اکائیہ سے اس کا الحاق کرا دیا تو اس اتحاد کی قوت اور بڑھ گئی اور پیلوپنی سس میں اُسے قریب قریب وہی مرتبہ مل گیا جو کبھی پہلے اسپارٹہ کو حاصل تھا۔

نظام حکومت اور کامیابیاں

اب آراتوس کے مشورے سے اکائیہ کے نظام حکومت میں بعض مفید اصلاحیں کی گئیں اور قرار پایا کہ مجلس عام کے سال میں دو بار اجلاس ہوں جن میں ہر سی سالہ آزاد شہری شرکت اور رائے دینے کا حق رکھتا تھا۔ اسی جلسے میں مجلس انتظامی کے ارکان، ایک صدر نشین اور ایک دیوان (چانسلر) سال بھر کے واسطے منتخب کیے جاتے تھے۔ اور یہی صدر نشین بوقت جنگ اکائی فوجوں کا سپہ سالار ہوتا تھا۔

ریاستوں کے اندرونی تنازعات کا فیصلہ ایک خاص عدالت کے سپرد تھا مگر انتظامی حیثیت سے صدر نشین کو بڑے اختیارات دیئے گئے تھے۔ اسی طرح روپیہ کی تحصیل اور مصارف سب اُسی کے حکم سے عمل میں آتے۔ اگرچہ سالانہ جلسہ عام میں ان کا حساب دینا اس کا فرض ہوتا تھا۔

اس نظام حکومت کو مضبوط کرنے کے بعد اراتوس نے اکائیہ کا نفوذ ملکی بڑھانے کی کوشش کی اور انٹی گونس گناٹاس کے بیٹے ڈمٹ رئیس ثانی کے وقت میں مقدونیہ کی کمزوری اور دوسری طرف مصروفیت سے پورا فائدہ اُٹھایا حتیٰ کہ ایتھنز، آرگس اور جزیرہ اجی ناتاک اکائیہ کے احاطۂ اتحاد میں آ گئے اور جب ڈمٹ رئیس مرا تو اسپارٹہ یا ایلس کی بعض ریاستوں کے سوا جو اتحاد اطولیہ کے شریک تھے کل جزیرہ نما پیلوپنی سس اکائیہ کا حلیف تھا اور حکومت مقدونیہ کا اثر ان جنوبی علاقوں میں بالکل باقی نہ رہا تھا (۲۳۲ قم)۔

اسپارٹہ کی رقابت اہل اکائیہ کے اس فروغ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اسپارٹہ کو بھی اپنی عظمت گزشتہ یاد آئی اور اُن کے بعض اہل حکومت، وطن کی اصلاح اور قدیم قوانین کے احیا میں سعی کرنے لگے۔ کیونکہ اب یہ شہر" لکرگس کا شہر" نہیں رہا تھا بلکہ خودغرضی اور زرپرستی کا گھر بن گیا تھا۔

قومیت اور مساوات کے جو سبق لکرگس نے دیئے تھے وہ رفتہ رفتہ دلوں سے محو ہو گئے تھے اور جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں دولت اور زمین چند امیروں کی ملک بن گئی تھی اور آبادی کا بڑا حصہ مفلوک طامع اور بداخلاق تھا۔ لیکن کلیومینز کے اسپارٹہ میں تخت نشین ہونے سے بڑا تغیر پیدا ہوا اور آرکیڈیہ کے بعض شہروں کی تسخیر سے اس حوصلہ پسند بادشاہ کے بہت جلد اپنے ہموطنوں میں نئی تازہ روح پھونک دی اور جب اراتوس کو کئی معرکوں میں کلیومینز کے ہاتوں شکست و ذلت نصیب ہوئی تو اہل

اسپارٹہ کے دل میں پھر پیلوپنی سس پر اقتدار حاصل کر لینے کا ولولہ جوش زن ہو گیا اور اہلِ اکائیہ بھی اُن سے دَب کر صلح پر آمادہ نظر آنے لگے۔ مگر اراتوس نے اس موقع پر بڑی بے حمیتی دکھائی اور مقدونیہ کے اتالیق سلطنت انٹی گونس ڈوسن سے مدد مانگ کر وطن کی دشمنی میں وہی قابل عار کام کیا جو بار بار یونان کی تباہی کا سبب ثابت ہوا تھا۔ یعنی باہمی نزاع میں ایک غیر سلطنت اور دشمن وطن کی دستگیری ڈھونڈی جس نے سلاسیہ کی جنگ میں نہ صرف اسپارٹہ کی قوت توڑی بلکہ خود اکائیہ کی آزادی اور خود داری کا بھی ایک حد تک خاتمہ کر دیا (۲۲۲ء ق م) اسی بنا پر ایک مورخ نے یہ مشہور فقرہ لکھا ہے کہ اراتوس ہی اتحاد اکائیہ کا بانی تھا، نگہبان تھا اور قاتل تھا!

کلیومینز کا انجام سلاسیہ کے میدان میں غنیم کی کثرت تعداد سے مغلوب ہونے کے بعد کلیومینز اسپارٹہ چلا آیا تھا لیکن وہاں بھی مخالفت پائی تو مصر چلا گیا اور کچھ روز تک شاہ مصر کے وزرا کی بدسلوکیاں دیکھ کر اُس نے سکندریہ میں لوگوں کو اشتعال دلایا کہ وہ اپنے مطلق العنان بادشاہ کی شرمناک غلامی سے نکلیں اور مساوات وجمہوریت کے روح پرور میدان میں آئیں۔ لیکن اس کی یہ دیوانہ وار کوششیں ایک ذلت پسند قوم پر کوئی اثر نہ ڈال سکتی تھیں اور لکھا ہے کہ جب کلیومینز اور اس کے تیرہ ساتھی ننگی تلواریں لئے اسکندریہ کے بازاروں میں آزادی آزادی پکارتے نکلے تو شہر والے بے تعلق تماشائیوں کی طرح کھڑے تالیاں بجاتے اور خوش ہوتے تھے مگر ان کے شریک ہونے کا کسی کو شاید خیال بھی نہ آتا تھا! یونان کی حالت بگڑنے پر بھی اُس میں اور اہل مشرق میں اتنا فرق تھا! کلیومینز کو کسی امداد کی اُمید نہ رہی۔ اور وہ اور اس کے دلیر ساتھی تلواریں سینے میں بھونک کر قید حیات اور آیندہ اسیری کی عقوبت دونوں سے چھوٹ گئے (۲۲۰ء ق م)

اطولیہ اور اکائیہ کی خانہ جنگیاں اسی زمانہ میں انٹی گونس ڈوسن نے وفات پائی اور

(فیلقوس) یا فلپ ثالث مقدونیہ کا بادشاہ ہوا (۲۲۱ سنہ ق م) اور اہل اطولیہ نے جو اکائیہ اور مقدونیہ کی باہم دوستی کا سخت حسد رکھتے تھے خانہ جنگی کا تازہ طوفان بپا کر دیا۔ ڈوسن کا اُن پر بہت رُعب تھا اور فلپ کی عمر تخت نشینی کے وقت صرف سترہ سال کی تھی پس شورش کے لئے یہ موقع بظاہر بہت اچھا تھا، لیکن تین چار سال کی مسلسل خونریزیوں نے ثابت کر دیا کہ اہل اطولیہ کیسے ہی جفاکش، جنگجو اور سخت مزاج ہوں فلپ کی مستعدی اور باقاعدہ فوج کے سامنے بے حقیقت ہیں خاص کر جبکہ حکومت مقدونیہ اکائی ریاستوں کی طرفدار بن کر آمادۂ جنگ ہو۔ بایں ہمہ ابھی تک ان لڑائیوں کا کشت و خون اور تاراجی کے سوائے کوئی فیصلہ کن نتیجہ ظاہر نہ ہوا تھا کہ فلپ کی ہوس جاہ نے اپنا ایک اور دشمن قوی پیدا کر لیا۔

رومیوں سے دشمنی | شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جب (۲۱۸ سنہ ق م) میں قرطاجنہ کے نامی جرنیل ہنی بال نے اطالیہ پر حملہ کیا تو اور تدبیروں کے علاوہ فلپ شاہ مقدونیہ کو بھی اُس نے رومہ کی دشمنی میں اپنے ساتھ متحد کرنا چاہا اور بے شبہ ان عظیم الشان فتوحات کے بعد جو اُس نے اطالیہ میں حاصل کی تھیں، فلپ کا اس کے شریک ہو جانا رومیوں کے حق میں نہایت مہلک ہوتا، مگر اہل رومہ نے بڑی چالاکی سے اطولیہ کے ساتھ معاہدۂ اتحاد کر لیا اور انھی کی مدد سے فلپ کو سالہا سال یونانی لڑائیوں میں اُلجھائے رکھا یہاں تک کہ ہنی بال سے انھیں چھٹکارا مل گیا اور قرطاجنہ کی قوت توڑنے کے بعد وہ بہ اطمینان مقدونیہ کی طرف متوجہ ہوئے (۱۹۹ سنہ ق م) حالانکہ فلپ ابھی تک نہ صرف جنوبی یونان سے مصروف جنگ تھا بلکہ مشرقی اور شمالی سرحدوں پر بھی اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔

آزادی یونان کا اعلان | پس تین سال تک ظاہری مصالحت رکھنے کے بعد رومیوں نے مقدونیہ سے پھر چھیڑ نکالی اور طرح طرح کی عیاریوں سے تقریباً تمام ریاستوں کو فلپ سے توڑ لیا۔

انجمن اطولیہ پہلے سے اس کے خلاف تھی۔ اب اہل اکائیہ بھی مقدونیہ سے منحرف ہوگئے اور کئی سال کی کشمکش کے بعد فلپ کو مجبوراً ایک بھاری تاوان جنگ دے کر اس شرط پر صلح کرنی پڑی کہ آیندہ وہ یورپ و ایشیا کے کسی یونانی شہر سے واسطہ نہ رکھے گا۔ ساتھ ہی رومیوں نے ایک اعلان بڑے پُرشکوہ الفاظ میں شائع کیا کہ جمہوریہ رومہ کی مدد سے ہیلاس کو کامل آزادی مل گئی اور اب اُس کے باشندوں کو اختیار ہے کہ اپنی حکومت کو جن اصولوں پر چاہیں چلائیں (سنہ ۱۹۳ ق ۔م)

رومیوں کا "دوستانہ" نفوذ لیکن درحقیقت اس اعلان کا مدعا صرف مقدونیہ سے یونان کا تعلق منقطع کرنا تھا کہ وہ بعد میں بلا دقّت رومہ کا لقمہ بن جائے۔ چنانچہ چند ہی سال میں اطولیہ پر قبضہ کرنے کا ایک خداداد موقع یہ نکل آیا کہ شام کے بادشاہ انتیاکس نے اہل اطولیہ کے ایماء سے یونان پر چڑھائی کی اور اُسے رومیوں کے جال سے نکالنا چاہا۔ پر یونانیوں سے جس مدد کی توقع تھی وہ نہ ملی اور انتیاکس شکست کھا کر واپس جانے پر مجبور ہوا تو فتحمند رومیوں نے اطولیہ پر فوج کشی کی، اسے جمہوریہ رومہ کی اطاعت پر مجبور کیا اور تمام شمالی حصہ یونان پر قابض ہوگئے (سنہ ۱۸۲ ق ۔م)

اکائیہ اور جزیرہ نمائے پیلوپی نس ابھی تک بظاہر آزاد تھے لیکن رومیوں کا "دوستانہ نفوذ" اُن کی جڑیں کمزور کئے دیتا تھا اور وہاں کے سب سے نامور جرنیل فیلوپمن کو بھی اپنی بڑی کامیابی یہی نظر آتی تھی کہ اُس بُرے وقت کو (یعنی رومیوں کے علانیہ تسلط کو) جب تک ہو سکے ٹالا جائے۔ کیونکہ فیلوپمن اگرچہ اراتوس کا، جسے فلپ نے زہر دے کر مروا ڈالا تھا (سنہ ۲۰۸ ق ۔م) ایک نامور جانشین اور پلوٹارک کے نزدیک "آخری یونانی" کے لقب کا مستحق ہو، محکومی کی ناگزیر مصیبت کو آنے سے نہ روک سکتا تھا دوسرے خود فیلوپمن (سنہ ۱۸۳ ق ۔م) میں میناوالوں کے ہاتھوں میں پڑ کر غالباً رومیوں کے اشارے سے قتل کر دیا گیا اور اب یونان کی حالت اُس خشکی سے مشابہ نظر آنے لگی تھی جو کسی سیلاب میں

رفتہ رفتہ تہ آب ہو کر غائب ہوئی جاتی ہو!

مقدونیہ کا خاتمہ | مگر واقعات کے سلسلے میں پہلے سلطنت مقدونیہ کا خاتمہ تحریر تھا۔ یہی وہ سلطنت ہے جس نے سب سے اول یونان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالا اور اُسے منہدم کرکے اپنے قصر بادشاہی کی تعمیر کی تھی ان تمام گناہوں کے باوجود مقدونیہ ایک نیم یونانی حکومت ضرور تھی اور یونانی شہروں کی ذلت وخرابی کو شاید اُس نے کبھی اپنی وجہ مسرت نہ سمجھا تھا۔ کم سے کم پچھلے پچاس سال سے تو اس کا وجود یونانی آزادی کے لئے نہایت مفید اور رومیوں کی ہوس میں بڑی رُکاوٹ تھا۔

پس یہ درست نہ ہوگا کہ اس کے عبرتناک خاتمے کو بغیر ذکر کئے چھوڑ دیا جائے۔ یہ بادشاہت فلپ ثالث کے وقت تک اتنی منتظم حالت میں رہی کہ رومیوں کو اُس پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ لیکن جب (۱۷۹ ق م) میں فلپ نے وفات پائی اور اس کا نالایق بیٹا پرسیس تخت نشین ہوا تو جمہوریہ رومہ نے چند ہی سال میں اُس سے لڑنے کا بہانہ نکال لیا اور دو تین شکستیں دے کر سارے علاقے پر قابض ہو گئے۔ پرسیس گرفتار ہو کر رومہ لایا گیا اور قید ہی میں فاقے کرکے مر گیا (۱۶۶ ق م) اس کی اولاد میں بیان کیا جاتا ہے کہ صرف ایک بیٹا الگزنڈر بچا تھا جسے رومی حاکموں کے دفتر میں محرری کی جگہ دی گئی تھی!

فاعتبروا یا اولی الابصار

فتح مقدونیہ کے نتائج | پرسیس کی شکست اور مقدونیہ پر قبضے کے بعد، رومیوں نے جو طرز حکومت یہاں جاری کیا وہ ظالمانہ اصول ملک داری کی ایک نمایاں مثال ہے۔ کیونکہ رومیوں نے مقدونیہ کو چار ضلعوں میں تقسیم کر دیا تھا جن کے باشندے ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ رکھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ منجملہ اور قوانین کے جن میں اپنے بنی نوع کی دائمی غلامی اور تذلیل کا منصوبہ باندھا گیا تھا، ایک قانون، یہ تھا کہ "اہل مقدونیہ اسلحہ استعمال نہ کر سکیں"! اس امن افزا قانون سے وہ سرحدی علاقے البتہ مستثنیٰ تھے

جہاں وحشی ہمسایوں کی یورشس کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔[1]

ادھر مقدونیہ کی بادشاہت کا تختہ اُلٹتے ہی جنوبی یونان کی آزادی بھی چند روز کی مہمان نظر آنے لگی تھی اور اب رومیوں کے راستے میں کوئی شے مانع نہ رہی تھی کہ جب موقع دیکھیں اس باقی ماندہ علاقے پر متصرف ہوجائیں۔ کیونکہ نہ صرف مادی اعتبار سے بلکہ اخلاقاً فتح مقدونیہ کا بڑا اثر یہ پڑا تھا کہ ایک طرف تو اہل یونان مرعوب اور اپنی سلامتی سے مایوس ہوگئے تھے اور دوسرے فتحمند اہل رومہ کی بھوک کھل گئی تھی اور وہ سکندر کی وراثت حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔

خاتمہ | آخر اس نیم جاں مریض کی ہلاکت کا وقت آپہنچا ۱۵۰ء ق م میں رومیوں کی بے رحمی اور زیادتیوں نے ہر طرف رومہ کے دشمن پیدا کردیئے تھے۔ اسپین اور الّیریا میں یورشس تھی۔ قرطاجنہ کو خود ان کی سفّاکی نے لڑنے پر مجبور کیا تھا اور سب سے بڑھکر یہ کہ مقدونیہ میں ایک شخص نے پرسیس کا بیٹا (فلپ) ہونے کا دعویٰ کیا اور بدبخت اہل مقدونیہ کو اپنے دشمنان عزّت و حرّیت سے لڑنے پر آمادہ کرلیا تھا۔ اکثر یونانی ریاستیں اس ہل چل میں فلپ کے ساتھ ہوگئی تھیں لیکن اہل اکائیہ نے کمال بے حمیتی سے رومیوں کو مدد دی اور اُس کا خمیازہ یہ دیکھا کہ جب مقدونیہ کی شورشس کو رومی فوجوں نے دبالیا اور ازسرِ نو یہ ملک براہ راست رومی حکومت کے ماتحت آگیا، تو رومہ کی مجلس نے بڑی بے حیائی سے اپنے مددگار اہل اکائیہ کو حکم دیا کہ وہ اپنا موجودہ ملکی اتحاد قایم نہ رکھیں! (۱۴۷ء ق م) اس مطالبہ پر اہل اکائیہ ششدر رہ گئے اور ہر چند انھیں معلوم تھا کہ رومی قوت سے ان کا مقابلہ کرنا، ایک شیر سے بکری کا لڑائی لڑنا ہے۔ بریں ہمہ ان کا جوش غضب، دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا تھا اور وہ احسان فراموش

---

[1] تاریخ المورخین ۱۲

رومیوں سے دست وگریباں ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ غرض ہیلاس کی آخری کشمکش کا آغاز ہوا اور پہلے تھرموپلی کے متصل اور پھر شیرونیہ میں ہزیمت اُٹھانے کے بعد شہر کورنتھ میں ان کی فوجیں جمع ہوئیں اور یہیں رومی قنصل ممیّس نے وہ مہلک ضرب اُن کے سر پر لگائی جس کے بعد وہ تقریباً دو ہزار برس تک پنپ نہ سکے۔ خوبصورت کورنتھ کو آگ لگا دی گئی اس کی قیمتی یادگاریں لوٹ لی گئیں اور اس کی صاحب جمال عورتیں لونڈیاں بنالی گئیں۔ اور پھر چند ہی روز میں تمام ہیلاس (تھسلی اور ایپرس تک) اکائیہ کے نام سے جمہوریہ رومہ کا ایک محکوم صوبہ بنالیا گیا۔ فتعز من تشاء وتذل من تشاء!

یہ بعثتِ مسیح علیہ السلام سے ۱۴۶ سال قبل کا واقعہ ہے۔

بالخـــــــــيـــــــر

*

ضمیمہ

ہمارے ناظرین کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یونانیوں کا قدیم دولتِ ایران سے کسقدر قریبی تعلق تھا۔ انفرادی اور قدیم تر مثالوں کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو بھی چھٹی صدی قبل مسیح کے آخری نصف میں یونانیوں کی ایشیائی نوآبادیاں براہِ راست خسروانِ عجم کے ماتحت آچکی تھیں اور پانچویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے دارائے اعظم کی فوجیں تھریس و تھسالیہ کے علاقوں سے "آب و گل" کا خراج وصول کر رہی تھیں۔ مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کے یہ حریفانہ تعلقات صدیوں تک قایم رہے چنانچہ فتوحاتِ اسلامی کے زمانہ تک رومی قیاصرہ اور ساسانی بادشاہوں میں جو خونریزیاں ہوتی رہیں اُن کے حالات سے تاریخ کے صفحات رنگین ہیں۔ لیکن تیسری صدی قبل مسیح یا سکندر اعظم کے وقت تک جو زمانہ ہماری قدیم تاریخ یونان کی حدود میں داخل ہے اُس کے تمام حالات صرف یونانی مصنفین کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں اور اس یک طرفہ شہادت کو چار و ناچار قبول کرنا پڑتا ہے کیونکہ خود ایرانیوں کے پاس اپنے قدیم بادشاہوں کی کوئی معتبر تاریخ موجود نہیں ہے۔

اور گو ایران کے واقعاتِ تاریخی کی تلاش وجستجو ہماری کتاب کا موضوع نہیں تاہم قدرتی طور پر دل چاہتا ہے کہ اُن ایرانی بادشاہوں کے کم از کم اصلی ناموں کا سُراغ چلایا جائے جنھیں یونانی تلفظ نے بگاڑ کر کچھ کا کچھ بنا دیا ہے؛ اِس غیر تلفظ کو یورپ کے جدید ارباب تحقیق نے بجنسہ اختیار کر لیا ہے اور اگرچہ قدیم یونانیوں کے بیانات کی، کچھ درایت اور کچھ جدید تحقیقات کی بنا پر، جابجا اُنھوں نے تنقیص وتنسیخ کی ہے تاہم ایرانی نام اور ایران کی قدیم تاریخ کو مجموعی طور پر مغربی مدارس میں اسی طرح پڑھا اور سمجھا جاتا ہے جس طرح کہ ہیرودوتس یا زینوفن یا بعد میں برُوسس کلدانی بیان کر گئے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ اس بارے میں اہلِ یورپ نے مشرقی مصنفین کی تحریروں سے کوئی سروکار نہیں رکھا اور شاید کوئی باقاعدہ کوشش آج تک نہیں کی گئی کہ جس حد تک ممکن ہو، یونانی بیانات اور بعد کے مشرقی اقوال میں توازن وتطبیق کی جائے۔

اِس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ مشرقی تصانیف صحیح معنی میں قدیم ایران کی معتبر تاریخ نہیں ہیں اور اُن میں بہت سے بیہودہ افسانے اور خرافات بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن اوّل تو جدید تحقیقات اور درایت کا یہ کام ہے کہ وہ اسی ریتی میں سے زرِ خالص چھان کر نکالے اور دوسرے اگر وہ قصے کہانیاں بالکل چھوڑ دی جائیں تو بھی قدیم خسروانِ عجم کی جو طویل فہرست مشرقی مُصنفین نے ہمیں دی ہے اس سے کسی طرح قطع نظر نہیں کی جاسکتی۔ کم سے کم اہلِ مشرق یا فارسی خوان اشخاص تو اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ کاؤس و قباد، ہوشنگ و افراسیاب یا دارا و اسفندیار کے ناموں کو بالکل بھول جائیں اور ان کی بجائے کمبائی سیز و زرکسیز

جیسے مشکل و غیر مانوس ناموں پر قناعت کرلیں۔ مستند تاریخ کی نامیسری کے باوجود ہمارے پاس اتنا مصالحہ ضرور موجود ہے کہ یونانی ناموں کو پڑھتے وقت اپنے متداول ناموں پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

راقم الحروف کو یونانی تاریخ پڑھنے کے وقت سے یہ تلاش تھی کہ شاہانِ ایران کے وہ نام، جنھیں یونانی تلفظ نے ایک نئی چیز بنا دیا ہے، اپنے فارسی ناموں سے مطابق کیے جائیں۔ اِس غرض سے پہلے انگریزی کی مستند اور جامع کتب حوالہ (انسائی کلوپیڈیا وغیرہ) سے مدد لی اور عام انگریزی تواریخ ایران کو دیکھا۔ لیکن وہ عقدہ حل نہوا بلکہ اور اُلجھنیں پیدا ہوگئیں اور معلوم ہوا کہ راولنسن جیسا نامور محقق ہے جس نے کتباتِ بیستون کو پڑھا اور قدیم میخی تحریر کو پانی کردیا، اس موضوع پر کچھ نہیں لکھتا اور شاید اسے قابلِ التفات ہی نہیں سمجھتا۔ کسی اور انگریز مؤلف نے اس بارے میں کچھ لکھا بھی ہے تو وہ بہت ناکافی اور بالکل سرسری بلکہ غیر محققانہ ہے۔

اس دشواری میں بدرجۂ مجبوری میں نے ارادہ کیا کہ مشرقی تصانیف کا خود جدید تحقیقات اور یونانی بیانات سے مقابلہ اور تطابق کیا جائے۔ چنانچہ فارسی عربی کی مشہور

---

[1] "Five Great Monarchies"
"Persian Cuneiform Inscriptions"
"Persia"
"Persia & Persians."
"Persia Past and Present"
"Syke's Persia"
"Life of Nadir Shah"

تاریخوں کے علاوہ اور بھی جس جگہ کسی کام کی بات کا پتہ چلا، اُس کی جستجو کی اور بہت دن کی محنت کے بعد اس بارے میں ایک حد تک کامیابی ہوئی اور اسقدر کافی مواد جمع ہوگیا کہ تھوڑی سی محنت اور فرصت اور صرف کیجائے تو اس موضوع پر ایک مستقل مضمون لکھا جاسکتا ہی لیکن ابھی تک مجھے ان نتایجِ تلاش کو پیش کرنے میں کسیقدر تامل تھا اور اسی واسطے جب جناب آغا محمد تقی صاحب ایرانی معلّم مدرسہ فوقانیہ مشرقیہ اورنگ آباد (دکن) کی عنایت سے کتاب آئینہ سکندری میری ہاتھ آئی تو مجھے یہ دیکھکر نہایت خوشی ہوئی کہ جو میں چاہتا تھا اسی خیال کو پیشِ نظر رکھکر یہ کتاب حال میں تالیف کی گئی ہی (یعنی ۱۳۲۴ھ میں) اور گو فاضل مؤلف، آقا میرزا جہانگیر خاں شیرازی اپنے بیان کا بہت کم حوالہ یا سند دیتے ہیں لیکن جو کچھ انھوں نے لکھا ہی خود وہ اُن کے تبحّرِ علمی پر گواہ ہی اور جدید تحقیقات اور مغربی تصانیف سے واقفیت رکھنے کی علاوہ، اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنی قدیم تاریخ اور زبان پر عبور کامل رکھتے ہیں۔ ایران کی تاریخ انھوں نے دو جلدوں میں لکھی ہی جس میں سے پہلی جلد کا نام آئینہ سکندری ہی اور اس میں ابتدا سے لیکر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک ایران کے حالات لکھے ہیں۔ اور فاضل مؤلف نے ہر جگہ اپنی تاریخ کو جدید مغربی تصانیف و تحقیقات سی مطابق رکھنے کی کوشش کی ہی۔ فاضل ممدوح کی تحقیقات سی مجھے کہیں کہیں

ﻪ فارسی میں شاہنامہ، روضۃ الصفا اور ناسخ التواریخ مشہور کتابیں ہیں جن میں قدیم واقعات کو بھی جمع کیا گیا ہی۔ ثعلبی کی کتاب "غرر اخبار ملوک الفرس" گویا شاہنامہ فارسی کی عربی نثر ہی اور اسی زمانہ میں اور اسی مصالح کو لیکر لکھی گئی ہی جس سے فردوسی نے شاہنامہ لکھا ہی۔ ابو الفدا، مسعودی اور حمزہ اصفہانی نے بھی قدیم تاریخ ایران پر کچھ کچھ لکھا ہی۔ خاص کر مسعودی کی ایک کتاب "التنبیہ والاشراف" سے جو حال میں جرمنوں نے چھاپی ہی مجھے نہایت کارآمد معلومات حاصل ہوئی۔ الف دین صاحب وکیل کیمبل پور پنجاب نے مہربانی سے اپنا ایک مطبوعہ لکچر بھی مجھے عنایت فرمایا جس میں قدیم تاریخ ایران اور بادشاہوں کے ناموں سے ایک مجمل بحث کی گئی ہی ۱۲

خفیف اختلاف ہے لیکن یہاں میں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا اور اپنے اور اپنے ناظرین کے لیے آسانی اس میں دیکھتا ہوں کہ شاہانِ ایران کے ناموں کی جو تطبیق آئینۂ سکندری میں کی گئی ہے اُسے نقل کر دیا جائے۔ خود ایران کی مفصل تاریخ قدیم پڑھنے کا جن صاحبوں کو شوق ہے اُن کے واسطے میرے نزدیک آئینۂ سکندری سے بہتر کوئی کتاب انگریزی اور عربی فارسی میں موجود نہیں ہے اور وہ اُسے ضرور مطالعہ فرمائیں۔

قدیم شاہانِ ایران

(انگریزی اور قدیم تلفظ کا رالنسن کی تحریروں سے مقابلہ کر لیا گیا ہے (ملاحظہ ہو جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی جلد دہم بابت ۱۸۴۶ء) اور فارسی کا قدیم اور جدید تلفظ آئینۂ سکندری سے ماخوذ ہے)

موجودہ فارسی تلفظ	قدیم فارسی	یونانی اور انگریزی
(۱) کے قباد	آرباس	Arbaces
(۲) توس	دڑزس	Deioces
(۳) فریبرز	فرااُرت	Pharortes
(۴) سیاوش (یا کے آرش)	سیاکزار	Cyaxares
(۵) افراسیاب ؟ ازی ہاک	آستیاژ	Astyages
	خاندان دوم۔ ہخامنشی	II. Achœmenians
(۶) × × ×	کورش یا سیروس	Cyrus
(۷) کیکاؤس۔ کامبیز	کمبوجیا	Cambyses
(۸) کیخسرو	سیروس کبیر	Cyrus (the Great)

	موجودہ فارسی	قدیم فارسی	یونانی اور انگریزی
(۹)	جاماسپ	گوماتیز	Cambyses (II)
(۱۰)	اسپندیار	داریوش اعظم	Darius (the Great)
(۱۱)	زریر	خشیارشا۔یاگزرکسیز	Xerxes
(۱۲)	اردشیر بہمن	ارتخشترا	Artaxerxes
(۱۳)	زریر ثانی	خشیارشا	Xerxes II
(۱۴)	داراب	داریوش سغدین	Darius II (Sogdin)
(۱۵)	اردشیر ثانی	. . .	Artaxerxes II
(۱۶)	اخوست	اکوس	Artaxerxes III (Ochus)
(۱۷)	آرشش	. . .	Arses
(۱۸)	خودمنش یا دارائے ثالث	داریوش کدمان	Darius III (Codomanus)
	سکندر یونانی	. . . .	Alexander

واضح رہے کہ جدید فارسی ناموں کی جو ترتیب اوپر نقل ہوئی اُس میں اور شاہنامۂ فارسی یا دوسری فارسی تواریخ کی ترتیب سلاطین میں اختلاف ہے لیکن اس اختلاف کا سبب اچھی طرح سمجھنے کے لیے ایک پیچیدہ بحث کرنی پڑیگی اس لیے ہم اسے قلم انداز کرتے ہیں اور بجائے خود پورا یقین رکھتے ہیں کہ صاحب آئینۂ سکندری کی منقولۂ بالا ترتیب شاہنامے یا اور قدیم فارسی کتابوں کی فہرست کی نسبت زیادہ صحیح اور کہیں زیادہ مستند ہے۔ فقط

سید ہاشمی فریدآبادی

بفضلِ خدا

انسٹی ٹیوٹ پریس (جو سر سید علیہ الرحمۃ کا قایم کیا ہوا اور محمدن کالج کی ملک ہونے کی وجہ سے حقیقی معنوں میں ایک قومی پریس ہی) لوہے اور پتھر دونوں قسم کے چھاپوں میں عربی و فارسی اُردو و انگریزی ہر قسم کا کام بہت صحت و کفایت سے ہوتا ہی اور وقت پر دیا جاتا ہی۔ جناب مولنا عبدالحق صاحب بی اے آنریری سکرٹری انجمنِ ترقی اُردو تحریر فرماتے ہیں:-

"میں جب کبھی کسی مطبع کی تعریف لکھی دیکھتا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا، اس لیے کہ مجھے جن جن مطبعوں سے سابقہ پڑا اُنھوں نے میری بدگمانی اور بڑھا دی۔ البتہ آپ کا ایک مطبع مجھے مستثنیٰ نظر آتا ہی۔ آپ کے مطبع نے انجمن کی کتاب وعدہ کے مطابق جلد چھاپی، اچھی چھاپی اور صحیح چھاپی۔ یہ تین باتیں ایسی ہیں جو عموماً ہمارے اُردو مطابع میں (جہاں تک میرا تجربہ ہی) کم پائی جاتی ہیں۔"

ہر قسم کی خط و کتابت کے لیے پتہ:-

مینیجر انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ